ثبات

اُردو کے تخلیقی ادب کا ترجمان

جلد اوّل، شمارہ: دوم

جنوری تا جون ۲۰۱۸ء

مدیر

ارشد محمود ناشاد

شعبۂ اُردو

علّامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

مجلسِ ادارت

سرپرست : ڈاکٹر شاہد صدیقی

نگران : ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

مدیر : ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

مجلسِ مشاورت

(الف بائی ترتیب سے)

(قومی)

☆ **افتخار عارف**.....(اسلام آباد)

☆ **تحسین فراقی**.....(لاہور)

☆ **خورشید رضوی**.....(لاہور)

☆ **زاہدہ حنا**.....(کراچی)

☆ **محمد حمید شاہد**.....(اسلام آباد)

☆ **مرزا حامد بیگ**.....(لاہور)

☆ **ناصر عباس نیّر**.....(لاہور)

☆ **یاسمین حمید**.....(لاہور)

(بین الاقوامی)

☆ **خلیل طوق آر**.....(تُرکی)

☆ **ستیہ پال آنند**.....(امریکا)

☆ **سویامانے یاسر**.....(جاپان)

☆ **سہیل عباس بلوچ**.....(جاپان)

☆ **شمس الرحمٰن فاروقی**.....(انڈیا)

☆ **محمد عمر میمن**.....(امریکا)

☆ **محمد کیومرثی**.....(ایران)

☆ مندرجاتِ متن کی ذمہ داری کلیتاً تخلیق کاروں پر عائد ہوتی ہے۔ **ثبات** کا اس سے اتفاق ضروری نہیں۔

☆ **ثبات** میں شامل تمام تخلیقاتِ نظم ونثر غیر مطبوعہ اور Peer Reviewed ہیں۔

نگرانِ طباعت: ناظم پی پی یو، علاّمہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

برائے رابطہ: Sabaat@aiou.edu.pk

حسنِ ترتیب

☆ مطلع ارشد محمود ناشاد ۷

عقیدتیں: **حیرت سرا میں سارا اُجالا یقیں کا**

☆ حمد احسان اکبر ۹

☆ نعت توصیف تبسّم ۱۰

☆ نعت سیّد شاکر القادری ۱۱

☆ نعت سعود عثمانی ۱۲

افسانے: **کُچھ خواب ہے کُچھ اصل ہے، کُچھ طرزِ ادا ہے**

☆ کہانی کا اختتام رشید امجد ۱۳

☆ ایک مسلسل زرگزشت محمد حمید شاہد ۱۶

☆ مالٹے کا، رس محمد حامد سراج ۲۸

☆ متن سے باہر کہانی شفیق انجم ۳۴

☆ خوف سیّد نصرت بخاری ۴۰

☆ شام سے بھیجی گئی ایک ای میل کا جواب اسد محمود خان ۴۳

غزلیں: **جمال کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا**

☆ بچپن اور لڑکپن گزرا، گزرا دور جوانی کا توصیف تبسّم ۵۳

☆ میں کہ ہم سر نہ تھا مہر و مہتاب کا امین راحت چغتائی ۵۴

☆ چادرِ ابر میں سورج کو چھپانے کے لیے خورشید رضوی ۵۵

☆ ہر پل کسی امتحاں سے گزرا صابر ظفر ۵۶

☆ نظارگی بھی نینوں کے زینوں کو منع ہے صابر ظفر ۵۶

☆ ایسا نہیں کہ موت کا میلہ نہیں لگا صابر ظفر ۵۷

☆ کوئی نماز نہ تھی جب وضو کیا نہ گیا صابر ظفر ۵۸

☆ صاحبِ عالمِ ایجاد کہاں رہ گئے ہیں غلام حسین ساجد ۵۹

☆ خواب اچھے ہیں نہ خوابوں کا بیاں اچھا ہے غلام حسین ساجد ۵۹

☆	یہ وہم وہ ہے جو ہر آدمی کا ہوتا ہے	سعود عثمانی	۶۱
☆	مانندِ حبسِ کوچہ و بازار میں ہی تھا	نسیم عباسی	۶۲
☆	اس کی پہچان کا ضامن ہے جدھر جاتا ہے	نسیم عباسی	۶۲
☆	بُجھا ہوا ہے کسی ہوا سے چراغ میرا	ضیاالحسن	۶۴
☆	کہیں کہیں سے ادھورا، کہیں کہیں پورا	ضیاالحسن	۶۴
☆	کہیں کہیں سے تو لگتا رہا کہیں ہوں میں	ضیاالحسن	۶۵
☆	بہت پسند تھا اِک باغِ داستاں مجھ کو	ضیاالحسن	۶۶
☆	کام کرنا ہے کوئی کام نہ کرنے جیسا	ضیاالحسن	۶۶
☆	دائروں جیسا کوئی اور داستاں ایسا کوئی	شاہین عباس	۶۸
☆	ہماری آنکھ میں اِک تل پُرانا رہ گیا ہے	شاہین عباس	۶۸
☆	ہمہ رفتار ہو گیا تو کیا	شاہین عباس	۶۹
☆	یہ خرابا خبر کا لگتا ہے	شاہین عباس	۷۰
☆	بیچ میں دیوار ہے اور زندگی دونوں طرف	ظہور چوہان	۷۱
☆	ترے ہونے کا یقیں ہے کہ گماں ہے کیا ہے	ظہور چوہان	۷۱
☆	صلیبیں نصب ہو چکیں۔۔۔۔	علی اکبر ناطق	۷۳
☆	روز سپارے پڑھ پڑھ پھونکے۔۔۔۔	علی اکبر ناطق	۷۳
☆	زمین و آسماں ہونے سے پہلے	منیر فیاض	۷۴
☆	جو آتے جاتے رہے راز دان بنتے گئے	عمران عامی	۷۵
☆	خدا کو لوگوں کے نزدیک لانا چاہتا تھا	عمران عامی	۷۵
☆	کسی بھی دورِ مکافات سے نہیں چلتا	عقیل ملک	۷۷
☆	عقل سے کارِ معانی پہ اثر پڑتا ہے	عقیل ملک	۷۷
☆	اِک ستارہ نکل آیا ہے سحر سے پہلے	عقیل ملک	۷۸
☆	گزر رہی ہے خسارے شمار کرتے ہوئے	عقیل ملک	۷۹
☆	کھجور کا تھا مدینے میں اِک عجیب درخت	فیصل ریحان	۸۰
☆	حادثہ وقت کے گرداب میں رکھا کس نے	فیصل ریحان	۸۰
☆	اِک غم سے بچ رہیں تو نیا ڈر ہے سامنے	فیصل ریحان	۸۱
☆	خوشی ملتی نہیں ارمان میں کٹ جاتی ہے	فیصل ریحان	۸۲

ناول: کوزے میں جتنے رنگ ہیں دریا کے دم سے ہیں

☆ ڈارک روم میں لیکچر — شاہین عباس — ۸۳
☆ دردمندوں کا دیس — زاہد حسن — ۹۶
☆ ساسا — محمد شیراز دستی — ۱۰۶

ہائیکو: رہی جہاں بھی رہی اضطراب میں، خوشبو

☆ ہائیکو — علی اکبر عباس — ۱۱۵

مضامین: معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

☆ کہ مستعار ستارے مری قبا پہ نہیں — محمد اظہار الحق — ۱۱۷
☆ آزادی کے بعد اُردو فکشن اور ہمارا معاشرہ — محمد حمید شاہد — ۱۲۴
☆ استعارے کی موت — صابر — ۱۳۲
☆ برصغیر میں عوامی موسیقی کا چلن — یاسر اقبال — ۱۵۱

نظمیں: کہ میرے ساتھ زمانہ بھی اضطراب میں ہے

☆ روایات — امین راحت چغتائی — ۱۵۷
☆ دھند میں — معین نظامی — ۱۵۹
☆ رنگوں بھری ہوا — یٰسین آفاقی — ۱۶۰
☆ میں خزانے لُٹا دوں گا — یٰسین آفاقی — ۱۶۰
☆ میں شعلہ بن کر زندہ رہوں گا — یٰسین آفاقی — ۱۶۱
☆ میں نظم بننا چاہتا ہوں — یٰسین آفاقی — ۱۶۱
☆ کشادگی کا خوف — یٰسین آفاقی — ۱۶۲
☆ کیا مجھے زندگی سے محبت نہیں ہے؟ — ارشد معراج — ۱۶۳
☆ گردش کی اسیری — شہزاد نیّر — ۱۶۴
☆ زمیں کو از سرِ نو خلق۔۔۔۔(۳حصّے) — کاشف نعمانی — ۱۶۵

سفرنامے: ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

☆ افسانوی باغوں سے ربودہ خوشبو والا درۂ یوش — عارف نوشاہی — ۱۷۱
☆ کیمبرج، کیمبرج اور لندن — امجد علی شاکر — ۱۷۸

خاکے: ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

☆ مخبورالحواس — اشفاق احمد ورک — ۱۹۱

☆ ابراہیم قلی — عصمت درانی — ۱۹۶

ڈراما: عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

☆ دلِ بینا — عامر رضا — ۲۰۵

خودنوشت: ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

☆ سیرِ گریباں — امین راحت چغتائی — ۲۲۹

تراجم: پانی کے ساتھ ساتھ سفر میں ہے عکسِ ماہ

☆ انجام بخیر — مارگریٹ/ارشد محمود — ۲۴۳

☆ میں نے انھیں کیوں مارا؟ — پروین ملک/زاہد حسن — ۲۴۸

☆ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے! — ولیم شیکسپیئر/سعید اکرم — ۲۵۱

☆ میر داماد — نیما یوشیج/عارف نوشاہی — ۳۵۳

☆ دیہاتن — نیما یوشیج/عارف نوشاہی — ۲۵۳

☆ کافی — خرم بہاول پوری/ضیاالدین نعیم — ۲۵۵

نقد و نظر: ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

☆ حرفِ شوق — ظفر حسین ظفر — ۲۵۷

☆ انارکلی — بی بی امینہ — ۲۶۲

☆ سُرسنسار — یاسر اقبال — ۲۶۸

☆ جندر — فریدہ حفیظ — ۲۷۳

وفیات: جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

☆ بُجھتے چلے جاتے ہیں چراغ [جنوری تا اپریل ۲۰۱۸ء] — محمد منیر احمد سلیچ — ۲۷۷

☆☆☆

مطلع

[۱]

حسن، ادب کی بنیادی قدر ہے۔ فکر وخیال کی تعمیر وتشکیل سے اُس کی ترسیل تک کے سارے مراحل حُسن کی نگرانی میں طے ہوتے ہیں۔ گویا اعلا ادب پارہ حسن کا شاہ کار ہوتا ہے اور اس کے داخلی اور خارجی زاویے اسی روشنی سے ضیا بار ہوتے ہیں۔ یہی حسن ادب کی تاثیر کو دوچند کرتا اور اس کے مقام ومرتبے کی تعیین میں اپنا حصّہ ڈالتا ہے۔ اس بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ کوئی بھی ادب پارہ حسن سے عاری نہیں ہوسکتا، یہ جاننا لازم ہے کہ حُسن کیا ہے؟ کسی ادب پارے کی تعمیر وتشکیل میں وہ کیسے حصّہ دار بنتا ہے اور ادب پارے کی تحسین وتعبیر میں اس کے وجود کو کیسے شناخت کیا جاتا ہے؟ یہ سوال اگرچہ عمومی انداز کے ہیں مگر ان کے جواب آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔ حُسن کسی مرئی شے کا نام نہیں کہ جس کو دیکھ کر اس کے خال وخط کی وضاحت کر دی جائے یا اُس کی شکل وصورت کے اوصاف بیان کر دیے جائیں۔ حُسن کے بارے میں انسان ہمیشہ سوچتا رہا ہے مگر اس کے بارے میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ پایا، اس سے حُسن کی پیچیدگی اور اس کے وجود کی ہمہ رنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مفکرین نے حسن کو حقیقت کا ہم درجہ خیال کیا ہے کہ دونوں کا وظیفہ کسی شے کا کامل وقوف یا انکشاف ہے۔ ان کے بہ قول تعقل کے ذریعے کسی شے کا علم حقیقت اور احساس کے ذریعے کسی شے کا مکاشفہ حُسن ہے۔ ادب میں فلسفۂ جمال کے بنیاد گزار بام گارٹن بھی حقیقت اور حُسن کو ایک ہی شے کے دو روپ قرار دیتے ہیں۔ بعض اصحابِ فکر نے حسن کو تناسب، ترتیب وتہذیب اور نظم کہا ہے بعض کے نزدیک بے ترتیبی اور بکھراؤ بھی حُسن کے مظاہر ہیں۔ جس طرح باغ میں سرو کی قطار اپنی ترتیب وتہذیب کے باعث حسین نظر آتی ہے بالکل اسی طرح آسمان پر بے ترتیب ستاروں کا جہان اپنی دل پذیری اور رعنائی کے باعث دامن کشِ دل ونگاہ ہوتا ہے۔ کہیں سادگی مظہرِ حسن وجمال ہے تو کہیں صنّاعی۔ افلاطون کے نزدیک حُسن ایسا نور ہے جو توازن، ہم آہنگی، ترتیب اور تناسب سے بالاتر ہے۔ اگرچہ یہ حسن کی یہ تعریف زیادہ ہمہ رنگ ہے مگر اس کے باوجود حُسن کی تفہیم وتعبیر ممکن نہیں۔ حُسن کا مفہوم کثرتِ تعبیر کے باعث گرفت میں نہیں آتا۔ اس صورتِ حال میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان کا تصورِ حسن دوسرے انسان سے مختلف ہے تاہم سب مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ حُسن: جملہ فنونِ لطیفہ کی بالعموم اور شعر وادب کی بالخصوص بنیادی اور اساسی قدر ہے۔ ہر تخلیق کار اپنے تخلیقی سفر میں خیال کی ترتیب وتہذیب سے لے کر اس کی پیش کش تک کے سب مراحل میں حُسن سے رہنمائی لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام آدمی جب کوئی گانا سُنتا ہے یا کوئی تصویر یا کوئی مجسمہ دیکھتا ہے یا کوئی شعر پڑھتا ہے تو اس کے اندر سرشاری اور سرخوشی کا احساس جاگ اُٹھتا ہے اور وہ اس سے لذت کشید کرنے لگتا ہے۔ ادب پارے میں حُسن کی جلوہ

آرائی کا مشاہدہ کرنا اوراس کے عناصر کا سراغ لگانا تعینِ قدر کے لیے ضروری ہے۔ادب پاروں کا اس زاویۂ نگاہ سے مشاہدہ کر کے نتائج مرتب کرنے کی ذمہ داری ''جمالیاتی تنقید'' اپنے ذمہ لیتی ہے۔تاہم دیکھا یہ گیا ہے کہ حُسن کے عناصر کی تلاش اورادب پارے کے درجے کے تعین میں ''جمالیاتی تنقید'' بھی اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برانہیں ہوسکتی ہے اوراس کا بڑا سبب وہی ہے جس کا ذکر سطورِ بالا میں کیا گیا ہے کہ ہر تخلیق کار کا تصورِ حُسن اس کے اپنے انفرادی رنگوں سے متشکل ہوتا ہے۔کیا ادب پارے میں حُسن کی جلوہ آرائی سے تنقید کے دوسرے اسالیب وانداز صرفِ نظر کرتے ہیں؟ اگر جواب نہیں میں ہے تو پھر ہمیں اس پر سوچنا ہوگا کہ ان کے پیمانے جمالیاتی اندازِ نقد سے کس طور مختلف اور الگ ہیں؟

[۴]

شش ماہی تخلیقی مجلّہ ثبات کا شمارہ دوم حاضر ہے۔شمارۂ اوّل کو ملک بھر میں اور ملک سے باہر بھی بے حد پذیرائی ملی اوراس کے مندرجات کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا،اس پر کئی کالم لکھے گئے اور تبصرے بھی۔دوسرے شمارے میں کُچھ نئے عنوان قائم کیے گئے ہیں۔جیسے:''ڈراما'' اور''نقد ونظر''۔پہلے عنوان کے تحت ایک ریڈیائی ڈراما اور دوسرے عنوان کے تحت چار تازہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ان شاءاللہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور ایسے عنوان اس میں اضافہ ہوتے رہیں گے جن کا تعلق تخلیق کی دُنیا سے ہے۔دوسرے پرچے کے لیے جن اصحابِ قلم نے نگارشاتِ نظم ونثر سے نوازا، ہم اُن کے احسان مند ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی خیر کے اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔معاصر جائزہ نگاروں کا شکریہ بھی واجب ہے جنھوں نے ثبـــــات میں شامل نگارشات کے انتخاب میں ہماری رہنمائی کی۔ڈاکٹر شاہد صدیقی کی سرپرستی اور ڈاکٹر عبدالعزیز ساحؔر کی نگرانی کے بغیر ثبات کیسے لباسِ شہود میں جلوہ گر ہوسکتا ہے؟

ارشد محمود ناشاؔد

(مدیر)

☆

احسان اکبر

حمد

عبث تلاش ہے اُس کی مثال وقال کے ساتھ
خیال جس کا نہ آئے ، کسی خیال کے ساتھ

وہ لاشریک ، کوئی حصّہ دار رکھتا نہیں
جمال گرچہ دکھاتا ہے ، ہر جمال کے ساتھ

وجود کوئی نہیں ، صرف ہے وجود اس کا
وجود گرچہ نہیں ، جسم و خدوخال کے ساتھ

دُعا نہ مانگی کہ پہلے سے تُجھ کو ہے معلوم
تُو پہلے دن سے جو محرم ہے میرے حال کے ساتھ

کہاں عبادتیں اپنی کہاں مقامِ عبد
ضرورتیں لیے پھرتے ہیں عرضِ حال کے ساتھ

زبان لائیں کہاں سے جو تُجھ سے بات کریں
فنا پذیر کہاں؟ ذاتِ لازوال کے ساتھ

☆

توصیف تبسم

نعت

طلوعِ مہر نے پہنا دیا لبادۂ نور
کھنچا ہے خاک سے تا آسمان جادۂ نور
اُسی کی خاکِ کفِ پا سے ہے فروغ پذیر
یہ ماہتاب ، سرِ آسمان ، زادۂ نور
وہ جس کے واسطے اُتری ہے آیۂ تطہیر
خدا سمجھتا ہے کیا ہے وہ خانوادۂ نور
یہ فیضِ سُنتِ خیرالانام ہے ، ورنہ
مجال کس کی کوئی کر سکے ، اعادۂ نور
فلک پہ ماہِ منوّر ، زمیں پہ دینِ مبیں
خدا کے حکم سے پورا ہوا ہے وعدۂ نور
یہ حق کی راہ میں انبوہ جاں نثاروں کے
بڑھے گا ، کم تو نہ ہو گا سرودِ بادۂ نور
تمام رنگ اُسی نور کے نظارے ہیں
یہ آنکھ بھی ہے تبسّم ، نگاہ دادۂ نور

☆

سیّد شاکر القادری

نعت

زباں جو اسمِ محمد سے آشنا ہو جائے
نفس نفس یوں مرا ، موجۂ صبا ہو جائے
ہر ایک لفظ خذف ریزہ ہے مرا ، لیکن
جو آئے نعت میں وہ دُرِ بے بہا ہو جائے
قدم قدم پہ ستاروں کی کہکشائیں ہوں
غبارِ راہِ مدینہ مری ردا ہو جائے
صبا جو گلشنِ طیبہ سے ہو کے آتی ہے
خدا کرے مرے آنگن کی وہ فضا ہو جائے
بجا کہ حسنِ عمل سے تہی ہے فردِ عمل
مگر جو اُن کی شفاعت کا آسرا ہو جائے
کوئی سوال نہ پھر تشنۂ جواب رہے
نصاب ، اسوۂ حسنہ اگر ترا ہو جائے
خیال و فکر کی گرہیں تمام کھل جائیں
اگر حدیقۂ جاں سے گزر ترا ہو جائے
ترے حضور شجر جھومتے ہوئے آئیں
ترے حضور تو پتھر بھی موم کا ہو جائے
رہِ حیات میں شاکرؔ نزولِ شب کیوں ہو
چراغِ عشقِ محمد جو رہنما ہو جائے

☆

سعود عثمانی

نعت

وہی ہے خوف جو کم مائیگی کا ہوتا ہے
اگرچہ شوق تو نعتِ نبی کا ہوتا ہے
میں چاہتا ہوں کہ تشبیب سے گریز کروں
اگر تو اِذن قصیدہ گری کا ہوتا ہے
فراقِ شہرِ نبی کی بھی قدر کر مرے دوست!
عجیب ذائقہ اس تشنگی کا ہوتا ہے
یہ اِک سبق بھی پیمبر سے روشنی کو ملا
کہ سب سے تیز سفر جسم ہی کا ہوتا ہے
میں زندہ نعت لکھوں اور زندہ رہ جاؤں
وگرنہ فائدہ کیا شاعری کا ہوتا ہے
سعودؔ نعت کا رُتبہ وہی ہے شاعری میں
جو ساری خلق میں پیغمبری کا ہوتا ہے

☆

رشید امجد

کہانی کا اختتام

میرے آس پاس کسی کو علم نہیں کہ میں لمحہ بہ لمحہ مر رہا ہوں۔

میرے اندر جو گھڑی ہے، اُس کی چابی کُچھ دیر میں ختم ہو رہی ہے۔ گھڑی بند ہونے میں چند لمحے باقی ہیں۔ وقت کا دائرہ ایک سا نہیں۔ وجود کے اندر اُس کا دورانیہ چند گھنٹوں کا ہے۔ وجود سے باہر وقت کا دورانیہ مختلف ہے۔ جوں جوں اوپر اُٹھتے جائیں یہ دورانیہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اوپر بہت اوپر یہ دورانیہ اتنا کم ہو جاتا ہے کہ ایک مقام پر ازل اور ابد ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔ آغاز اور اسی لمحے اختتام۔ جوں جوں نیچے آتے جائیں اور اس مقام سے فاصلہ بڑھتا جائے تو وقت کا دورانیہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ وجود کے اندر یہ دورانیہ پھر کم ہو جاتا ہے اور زمین کے نیچے، قبر میں یہ دورانیہ طویل ہوتا جاتا ہے۔ موت سے روزِ جزا تک طویل۔

وقت کا یہ کھیل مختلف سطحوں پر مختلف انداز سے کھیلا جا رہا ہے۔ میں جو لمحہ بہ لمحہ مر رہا ہوں اور میرے آس پاس والوں کو اس کی خبر نہیں ہے تو یہ بھی اسی کھیل کا ایک انداز ہے۔

ہاں تو، میں لمحہ بہ لمحہ مر رہا ہوں۔ میرے اندر مختلف اعضا بے حس ہوتے جا رہے ہیں لیکن میری بیوی اور بچے بڑے پُر امید ہیں۔

بیوی کہتی ہے: ''آج جس ڈاکٹر کو دکھایا ہے، اُس نے بڑی اُمید دلائی ہے۔ چند دن علاج کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

بڑا بیٹا اثبات میں سر ہلاتا ہے۔

میں مسکراتا ہوں ____ انھیں معلوم نہیں کہ میرے اندر جو گھڑی لگی ہوئی ہے وہ مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ اس کے بند ہونے میں چند لمحے ہیں۔ یہ گھڑی ہر وجود میں فِٹ ہوتی ہے۔ اس کی چابی کی ایک مدت ہے۔ جونھی چابی ختم ہوتی ہے، گھڑی ٹک سے بند ہو جاتی ہے۔

اسی لمحے جب گھڑی بند ہونے میں چند لمحے باقی ہیں، میری ساری زندگی ایک فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھوم گئی ہے۔ جوں جوں پیچھے ہٹتا ہوں، منظر سامنے آجاتے ہیں۔ پنگھوڑے میں چوسنی چوستا مَیں ____ عجب منظر ہے، مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ اس سے پہلے بھی کُچھ ٹکڑے ہیں۔ ایک اندھیرا خول ہے، نرماہٹ اور سکون، اس کے بعد پہلی چیخ ہے۔

سکول کا زمانہ بھی عجیب ہے۔

استادوں کو خوش رکھنا، گھر والوں کو مطمئن کرنا،

پھر ملازمت، گھر بار _____ ایک نہ ختم ہونے والا سفر۔

اور وقت کی شطرنج پر کھیل، جو کئی برسوں پر محیط ہے لیکن درحقیقت چند لمحوں کا ہے۔ان چند لمحوں میں حیرت ایک نعمت ہے، جاتی رہے تو سب چیزیں معمول کی گرد میں اَٹ جاتی ہیں۔خود اپنا آپ یکسانیت کے نہ اُترنے والے پکے رنگ میں اس طرح بے معنی ہو جاتا ہے کہ خواب آنے بند ہو جاتے ہیں۔خواب آنے بند ہو جائیں تو خواہشیں اور اُمنگیں دم توڑ دیتی ہیں۔

اور یہ خواہشیں، یہ اُمنگیں ان کا دورانیہ ہوتا کیا ہے؟

وقت کے کئی دائرے ہیں، وجود سے باہر یہ برسوں پر پھیلا ہوا ہے اور ارد گرد ایک ہمہماتی دُنیا ہے، وجود کے اندر یہ چند لمحے ہیں۔ایک دُنیا اندر ہے، جو لمحہ بہ لمحہ مسمار ہو رہی ہے۔باغی سیل کسی نہ کسی کونے میں موجود ہوتے ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے باغی ریاست قائم کر لیتے ہیں۔یہ باغی ریاست آہستہ آہستہ پورے وجود میں پھیل جاتی ہے اور بس _____

شاید بغاوت کا یہ عنصر ازل ہی سے میری اُس مٹی میں شامل تھا جسے گوندھ کر میرا پُتلا بنایا گیا تھا۔لگتا ہے بغاوت کا یہ پہلو میری جین میں ہے، اسی لیے تو قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا رہا ہے۔کبھی باہر کبھی اندر۔

اور یہ عمر کیا ہے؟

بہ ظاہر برسوں پر پھیلی ہوئی لیکن باطن میں چند لمحوں پر محیط۔

اور یہ وقت _____

جو میرے اندر گھڑی کے ڈائل جتنا ہے، جس کی چابی بھی اتنی ہے۔چابی ختم تو سوئیاں رُک جائیں گی۔

باہر یہ وقت برسوں، مہینوں، ہفتوں اور دنوں پر پھیلا ہوا ہے۔یہ چادر ہے جو آدمی کھول کر، لپیٹ کر، خود کو اس کے اندر بُکل مارے بیٹھا رہتا ہے اور نیچے زمین کے نیچے قبر میں اس ازل سے ابد تک کے فاصلے جانچ نہیں جا سکتے۔

بیوی بچے کہتے ہیں _____ ''ڈاکٹر کہتا ہے چند دنوں میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

بیوی خوشی کا اظہار کرتی ہے _____ ''شکر ہے سارے ٹیسٹ ٹھیک ہیں۔''

میں مسکراتا ہوں۔

انھیں نہیں معلوم کہ میں اپنے اندر جھانک سکتا ہوں۔مجھے معلوم ہے بغاوت کس تیزی سے پھیل رہی ہے اور کتنی سرعت سے تمام اعضا پر کنٹرول حاصل کر رہی ہے۔

اندر کی دُنیا بھی ایک کائنات ہے جو ایک دھماکے سے وجود میں آتی ہے، پھیلتی ہے لیکن یہ پھیلاؤ راست نہیں ہے، عمودی ہے۔پتا ہی نہیں چلتا کہ پھیلی ہوئی لہریں کتنی تیزی سے واپس ایک دوسرے میں سماتی چلی جاتی ہیں، یہ کھیل تو لمحوں کا ہے۔

وقت ایک شطرنج ہے، جس پر مُہرے سجائے جاتے ہیں لیکن کھیل شروع ہونے سے پہلے ہی سمیٹ لیے جاتے ہیں۔
بس شطرنج کی بساط پر لگنا اور سمٹنا، یہی زندگی کا دورانیہ ہے۔
اس مختصر سے دورانیے میں کتنے کام ہو جاتے ہیں، کتنے رہ جاتے ہیں، اس کا علم کس کو ہے؟
میرے آس پاس کسی کو علم نہیں کہ میں لمحہ بہ لمحہ مر رہا ہوں۔
اندر کی گھڑی کی چابی ختم ہونے کو ہے، سوئیاں ایک مقررہ ہندسہ پر ایک دوسرے کے اوپر آنے والی ہیں، چند لمحے، بس چند ہی لمحے _____
وہ سب خوش ہیں کہ سارے ٹیسٹ ٹھیک ہیں۔
ٹھیک ہی ہوں گے لیکن وقت کا دورانیہ!
وقت کے پورے دائرے میں یہ دورانیہ چند لمحے ہی ہے۔
اور جہاں سے یہ سارا کھیل شروع ہوا ہے وہاں دورانیہ ہے ہی نہیں۔
ازل اور ابد ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔
زندگی اور موت بھی ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔
یہ کہانی ادھوری رہ جائے گی۔
ساری ہی کہانیاں ادھوری اور نامکمل ہوتی ہیں۔
نہ لکھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ کہانی ادھوری رہ گئی ہے نہ پڑھنے والے کو اس کا احساس ہوتا ہے۔
یہ کھیل، ایک کھیل ہے اور ہر کھیل کو ختم ہونا ہوتا ہے۔
آغاز، انجام سے جُڑا ہوتا ہے۔
یہ کہانی بھی شروع ہوتے ہی ختم ہو گئی ہے۔

☆

محمد حمید شاہد

ایک مسلسل زرگزشت

سب کچھ ٹھیک تھا۔

نجیب محسن وہاں عین برانچ کھلتے ہی پہنچ گیا تھا۔

اپنی نئی پوسٹنگ پر جب سے وہ وہاڑی آیا تھا تو اُس کی بیوی مائرہ کی سانسیں کچھ زیادہ ہی اُکھڑ گئی تھیں۔

مائرہ کے لیے جیسے کچھ بھی ٹھیک نہ ہو رہا تھا۔

یوں تو اس کا یہ عارضہ پرانا تھا مگر الرجی کا ایسا حملہ کہ چھاتی ہر بار زور سے دبا کر سانس بحال کرنی پڑے، ایسا پہلے نہ ہوتا تھا۔ ایسا کرنے سے اس کی پسلیاں بھی دُکھنے لگی تھیں۔ اُس روز فجر کی نماز کے لیے جب نجیب اُٹھا تو بیوی کی ننھی منی ناک کے نتھنوں اور پتلے پتلے ہونٹوں پر مدہم سروں میں بہتے سانسوں کو پا کر وہ مطمئن ہوا تھا۔ سکون سے سوئی ہوئی مائرہ کا چہرہ اور بھی اُجلا نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے تئیں سوچا کہ اگر وہ تین چار گھنٹے اور نیند لے لے گی تو اس کے لیے بہت مفید رہے گا۔ وہ چپکے سے کمرے سے نکل گیا۔ نماز پڑھ کر لوٹا تو بیٹی کے کمرے میں گھس گیا۔ ندا کا جواں جسم بستر پر بکھرا پڑا تھا۔ وہ بیٹی کے کمرے میں یوں کبھی نہ گھسا تھا اور نہ ہی کبھی اسے یوں صبح صبح جگانے کا خیال آیا تھا۔ وہ رات گئے تک پڑھنے کی عادی تھی اور اپنی سہولت سے اُٹھا کرتی تھی۔ مگر جب وہ ندا کے کمرے میں داخل ہوا اور مدہم نیلی روشنی میں اسے بستر پر اپنے وجود سے بے نیاز پڑے پا کر بوکھلاتے واپس ہونے لگا تھا تو تب تک وہ ندا کی بابت سوچ رہا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں جب اپنی ایڑھی پر گھومتے ہوئے لڑکھڑایا اور دروازے سے ٹکرا گیا تو ندا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ باپ پر نگاہ پڑی تو اپنا لباس درست کیا اور اُٹھ بیٹھی۔ بیٹی کے سنبھلنے تک باپ بھی سنبھل گیا تھا۔ اُس نے ندا کو تاکید کی کہ وہ ماں کا خیال رکھے اور کام والی ماسی آئے تو بھی اسے نہ جگائے کہ وہ بڑے دنوں بعد سکون سے سو رہی تھی اور یہ کہ وہ شہر سے باہر جا رہا تھا، شام سے پہلے واپس نہ آ سکے گا لہٰذا دوپہر کھانے پر اس کا انتظار نہ کیا جائے۔

برانچ آفس پہنچتے ہی اس نے والٹ سے کیش اپنے سامنے ڈھیر کروایا، اسے اپنی نظروں کے سامنے گنوایا اور کاؤنٹر چیسٹ میں منتقل کروا دیا۔ کیش سکرول سے گنی گئی کیش کو جانچا پرکھا گیا۔ پائی پائی برابر نکلی۔ گویا سب ٹھیک تھا۔ اُس نے مینیجر کے آفس میں کھاتوں کی کچھ کتابیں منگوائیں؛ سب کے اندراجات مکمل تھے۔ ابھی اس بینک میں کاروبار پوری طرح کمپیوٹر پر منتقل نہ ہو سکا تھا، ہاں ایسا ہوتا کہ شام جب کیش کا لین دین بند ہو چکا ہوتا، ووچرز اکاؤنٹینٹ سکرول میں لکھ لیے جاتے اور اپنی تئیں تسلی کر لی جاتی کہ سب ٹھیک ہے تو اس دن کے اندراجات کو کمپیوٹر سسٹم پر منتقل کر لیا جاتا تھا۔ نجیب نے سسٹم کھلوا کر حسابات کو وہاں مرتب ہونے والے اندراجات سے ملایا اور تحسین بھری نظروں سے مینیجر کی جانب دیکھا۔ وہ

اپنے باس کے یوں دیکھنے پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ نجیب نے کتابوں پر جہاں بطور وزیٹنگ آفیسر دستخط کرنا تھے، کر دیے تو مینیجر نے اُس ساری ہوا کو منہ کھول کر باہر نکل جانے دیا جو وہ اب تک چھاتی میں روکے بیٹھا تھا۔ گویا اب وہ مطمئن تھا۔

کوٹ سلطان برانچ کے مینیجر کا نام محمد شفیق میاں تھا، اس کی ملازمت کو سولہ سال ہو چلے تھے اور لگ بھگ اس کی ساری سروس اسی برانچ کی تھی کہ وہ منیر احمد کھچی ممبر قومی اسمبلی کا خاص آدمی تھا۔ یوں تو بینک اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے منظور کروائی گئی ایچ آر پالیسی پر عمل کرنے کا پابند تھا جس میں ہر تین سال بعد ایک برانچ کے آفیسرز دوسری برانچوں میں تعینات کر دیے جاتے تھے، مگر اس کا اطلاق بالعموم انھی پر ممکن ہو پاتا جو کام سے کام رکھنے والے ہوتے۔ شفیق میاں جیسے لوگ اس قانون کو بھی غچہ دے جاتے تھے۔ شفیق میاں کاغذات کے مطابق اس برانچ میں اپنی ملازمت کے سارے عرصے میں کوئی چھ بار دوسری برانچوں میں ٹرانسفر کیا گیا تھا مگر ہر بار وہ بس کچھ دنوں کے لیے ہی وہاں رہا ہوگا کہ واپس اسی برانچ میں پوسٹ ہو گیا۔

برانچ مینیجر کا باپ میاں مرید، ممبر صاحب کا منشی تھا، اور ممبر صاحب کا کہنا تھا کہ شفیق میاں جیسے محنتی اور ایماندار آفیسر کو ان کے علاقے کی اِسی برانچ میں رہنا چاہیے۔ ممبر صاحب کو ہیڈ آفس والے بھی خوش رکھنا چاہتے تھے لہٰذا قانون پر عمل بھی ہو جاتا اور واپس ٹرانسفر کرنے سے وہ خوش ہو جایا کرتے۔ جب سے مارشل لا لگا تھا، سیاست دانوں کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے کے لیے اوپر سے بہت دباؤ تھا۔ جن برانچوں کے بارے میں بالعموم شکایات موصول ہوا کرتی تھیں، ان میں یہ برانچ بھی شامل تھی مگر یہاں تو سب ٹھیک تھا۔ نجیب نے مارشل لا کو ایک غلیظ گالی دی اور کتابیں بند کر کے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''ویل ڈن شفیق میاں، آپ کی برانچ تو مسلسل پرافٹ میں جا رہی ہے، بزنس ایکسپینشن خوب ہے اور سب اکاؤنٹس پراپرلی اور ٹائیملی بیلنس ہو رہے ہیں، ویل ڈن۔''

مینیجر نے اپنی تعریف سنی تو اُس کی چربیلی چھاتی کچھ اور پھول گئی۔ اُس نے ہنسنے کے لیے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں کو پوری طرح کھل جانے دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں مندھ گئیں اور طوطے کی چونچ جیسی ناک مزید جھک گئی۔ پھر وہ خود بھی جھک گیا اور چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے، اپنے نئے باس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جلدی جلدی ''تھینک یوسر، تھینک یوسر'' کہا۔ وہ ایک بار اور یہی الفاظ کہنا چاہتا تھا مگر بیچ ہی میں کہیں اُس کی نظر کیش کاؤنٹر کے پاس کھڑے نذیر سلطان پر پڑی اور زبان تالو سے ساتھ چپک کر رہ گئی تھی۔

مینیجر کے اچانک چپ ہونے پر نجیب چونکا اور اس کی نظروں کے تعاقب میں کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا، تین چار کلائنٹس کیو میں کھڑے تھے، دو تین سامنے بیٹھے تھے اور ایک دروازے سے لگ کر کھڑا، مینیجر کے آفس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یقیناً یہ ابھی ابھی وہاں آیا تھا اور باقی وہ ہوں گے جو ٹوکن سنبھالے اپنی باری کا انتظار

کرر ہے ہوں گے۔ ابھی نجیب اُلجھن سے نکلا نہ تھا کہ مینیجر سنبھل گیا اور بلاسبب 'جی سر، جی سر' کرنے لگا۔ اب اس کا باس پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ تو اس کی طرف تھا مگر اس کی آنکھوں میں بھوری رنگت والے ڈھیلے، جال میں تازہ تازہ پھنسی کبوتری کی طرح حواس باختہ دائیں بائیں ہو رہے تھے تو اسے شک ہو گیا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ نجیب جہاں دیدہ شخص تھا۔ شک اس کی جاب کا لازمی جز وتھا، وہ ہر ٹرانزیکشن کو شک سے دیکھنے کا عادی تھا اور جب تک ہر اندراج کا جواز جان نہ لیتا اس کی توثیق نہ کرتا۔ اس عادت نے اس کی ایک ایسے افسر کے طور پر توقیر میں اضافہ کیا جو اپنے کام پر مکمل دسترس رکھتا تھا۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھتا پا کر مینیجر بھی سیٹ سے یوں اٹھا جیسے کوئی سپرنگ نیچے سیٹ کا فوم اور استر کاٹ کر اس کے ماس میں چبھ گیا ہو۔

دو سے تین اضلاع کی برانچوں کے اوپر ایک ریجنل آفس تھا۔ پہلے ہر ریجنل آفس ہیڈ آفس کو رپورٹ کیا کرتا تھا مگر جوں جوں کلائینٹس بڑھے، کام زیادہ ہوا، فیلڈ افسروں کی تعداد میں اضافہ ہوا، نئی برانچیں کھولی گئیں تو بینک کے انتظامی امور کمزور پڑنے لگے اور بدانتظامی کی شکایات بڑھتی چلی گئیں۔ ایسے میں ہر تین ریجنل آفسز کے اوپر ویجی لینس آفس بنا دیا گیا۔ ہیڈ آفس پہنچنے والی ساری شکایات انہیں دفاتر کو بھیج دی جاتیں۔ نجیب محسن ویجی لینس زون ٹو کا ہیڈ تھا جس میں کوٹ سلطان برانچ پڑتی تھی۔ جس شکایت کی انکوائری کے لیے وہ برانچ آیا تھا اُن کی نوعیت مختلف تھی۔ یہ شکایت کسی کلائینٹ کی طرف سے نہ تھی کہ اس سے ثبوت لے کر بات آگے بڑھائی جاتی یا شکایت کنندہ کے بیان کی روشنی میں ریکارڈ کو کھنگال کر شواہد اکٹھے کر لیے جاتے، یہ تو اوپر سے آنے والی سیاسی افراد کی محض ایک فہرست تھی؛ بُری شہرت رکھنے والے، قرض لے کر نادہندہ ہو جانے والے، اور سرکاری ملازمین کو آلہ کار بنا کر سرکاری خزانے کو لوٹنے والے بااثر افراد کی فہرست۔ اور حکومتی ترجمان نے ایک پریس کانفرنس میں بتا دیا تھا کہ ایسے کرپٹ افراد کو اگلا الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جائے گا۔ سرکاری محکموں کو ان افراد کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے تھے۔ نئے سیاسی سیٹ اپ کے تحت عبوری مدت کی وزارت عظمیٰ جس شخص کے حصے میں آئی وہ ماضی میں بنکار رہا تھا لہٰذا حکومت کا سارا زور بنکوں پر تھا کہ ان کے خلاف ثبوت فراہم کیے جائیں۔ یہ مارشل لا اس لحاظ سے مختلف تھا، کہ اسمبلیاں توڑنے کی بجائے کچھ عرصے کے لیے معطل کی گئی تھیں۔ گزشتہ حکومت سے نالاں مگر اچھی شہرت رکھنے والے کچھ اسمبلی کے ممبران نئے سیٹ اپ کا حصہ ہو گئے تھے۔ گویا مارشل لا نے حکمرانی کے لیے جمہوری قبا پہن لی تھی اور اگلے الیکشن سے پہلے وہ اپنے دعووں کے مطابق یہاں کا گند صاف کرنا چاہتے تھے۔ انھیں اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے اسمبلی کے کچھ اور ارکان کی حمایت چاہیے تھی اور اس کے لیے وہ چھان پھٹک کر رہے تھے۔ حکومت کا کہنا تھا کہ ایسے بااثر لوگ جو کرپٹ تھے، ان کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹ صدر بن گیا اور اپنا ایک سیاسی سیٹ اپ بنالیا تو عبوری وزیر اعظم، دوسرے سرکاری اداروں کی طرح بنک کے ہیڈ آفس میں خود آیا اور زور دے کر کہا کہ یہاں سے کچھ نہ کچھ نکلنا چاہیے۔

کچھ نہ کچھ کیا، خبریں آنے لگی تھیں کہ کئی اور برانچوں سے بہت کچھ نکلنے لگا تھا۔

کوٹ سلطان برانچ سے نکلتے وقت نجیب کو مینیجر کی بے کلی کا جواز سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ جب اس کی گاڑی برانچ کی عمارت سے نکل کر ڈبل روڈ پر مڑ رہی تھی، تو رئیر مرر میں دیکھتے ہوئے اسے شک سا ہوا تھا جیسے وہی شخص جو برانچ میں دروازے کے پاس کھڑا تھا، بھاگ کر پیچھے آیا تھا۔ تاہم اس کی گاڑی مڑ جانے سے وہ اب نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو گاڑی آہستہ کرنے کا اشارہ کیا، ڈرائیور نے ادبدا کر بریک پر پیر جما دیا تو ان کی گاڑی کے ٹائر چرا چرائے۔ پیچھے آنے والی کار کو یوں یکدم بریک لگانے پر جو کوفت اٹھانا پڑی تھی اس کا اظہار اس نے تین بار ہارن دے کر کیا۔ نجیب نے ہڑبڑا کر گاڑی کی رفتار بڑھانے کا اشارہ کر دیا اور سائڈ مرر میں جھانکنے لگا۔ اب وہاں اس کے دیکھنے کو کچھ نہ تھا۔ اس نے سیٹ کے پہلو میں ٹٹول کر لیور تلاش کیا، اسے اوپر کھینچا تو سیٹ کچھ اور پیچھے لڑھک گئی۔ اس نے سر پیچھے ٹیک پر گرایا، کندھوں اور پاؤں پر بدن سہار کر کولہوں کو اوپر اچھالا اور واپس آنے دیا اور ٹانگیں دراز کر کے آنکھیں موند لیں۔

وہ آنکھیں موندے، کرسی سے پشت لگائے کچھ سوچتا رہا۔ رپورٹ تیار تھی۔ کوٹ سلطان برانچ کی انسپیکشن کو پانچ روز گزر گئے تھے اور ہیڈ آفس سے دوسرا فیکس ریمائنڈر موصول ہو چکا تھا۔ نجیب ذمہ دار آفیسروں میں شمار ہوتا، ہر کام اپنے وقت پر کرنے کا عادی۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ کوئی اسائنمنٹ وقت پر مکمل کرنا ممکن نہ ہو، مگر ایسے میں یہ ممکن نہ تھا کہ اس نے قبل از وقت اس کا جواز رپورٹ کر کے حتمی تاریخ میں ردو بدل نہ کروا لیا ہو۔ کوٹ سلطان برانچ کی انسپیکشن رپورٹ بھی اس نے اگلے روز ہی مکمل کر لی تھی اور ایک مرحلے پر اس نے اسے ڈسپیچ کرنے کا کہہ بھی دیا تھا۔ مگر اسے رُک جانا پڑا کہ دھیان میں برانچ مینیجر کی آنکھیں آ گئی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو بہت تسلی دی کہ جو لکھا گیا تھا وہ درست تھا۔ جب اُس کا کوئی قصور سامنے نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس برانچ سے کوئی ایسا ریکارڈ ملا تھا کہ منیر کھچی ممبر قومی اسمبلی کے خلاف بہ طور ثبوت رپورٹ کا حصہ بنایا جاتا تو اپنی طرف سے مرتب کردہ 'او کے' رپورٹ کو جمع کرانے اور بعد ازاں اس کے دفاع کے لیے بھی خود کو تیار کر چکا تھا۔ تاہم ایک بات اسے کھٹک رہی تھی یہی کہ اس برانچ سے اس ممبر قومی اسمبلی نے غیر معمولی قرض لیا تھا جو اس کے اپنے نام کے علاوہ اس کے بیوی بچوں اور مزارعین کے نام پر تھا۔ اس باب میں اس نے اپنے آپ کو یوں مطمئن کر لیا تھا کہ ایسے کھاتوں میں اقساط باقاعدگی سے جمع کرائی جا رہی تھیں اور محض قرض لینا کوئی جرم نہ تھا۔ رپورٹ لکھتے ہوئے برانچ مینیجر کی حواس باختگی اور اس کی بھوری آنکھوں کے ڈھیلوں کی پھڑ پھڑاہٹ بھی اسے شک میں ڈالتی رہی تھی۔ اور اب،

جب کہ رپورٹ مکمل ہو چکی تھی وہ آنکھیں موندے مینیجر کی بابت ہی سوچ رہا تھا۔ ایسے میں اچانک ایک جھپاکا سا ہوا، اس کا دھیان اس شخص کی طرف ہو گیا، جو وہاں برانچ میں دروازے کے پاس تھا اور شاید لپک کر گاڑی کے پیچھے بھی آیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس سارے معاملے کو پھر سے دیکھے گا۔ اس نے کندھے پر کوٹ ڈالا جھک کر کال بیل کا بٹن دبا کر دروازے کی سمت دیکھنے لگا۔ بٹن پر انگلی شاید معمول سے کچھ زیادہ دیر کے لیے جمی رہی تھی اس لیے آفس بوائے ہڑبڑاتا اندر داخل ہوا۔ نجیب نے اسے ڈرائیور کو گاڑی باہر لگانے کا کہا، پھر ٹیبل پر پڑی فائل اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔

ابھی وہ گاڑی میں ڈھنگ سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ ایک شخص عین گاڑی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی تھی کہ یہ تو وہی شخص تھا جس کی تلاش میں وہ کوٹ سلطان برانچ کے لیے نکلا تھا۔

وہ اس کے سامنے بیٹھا کچھ دیر تو اس تذبذب میں رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، وہاں مومی لفافے میں لپٹا ہوا کاغذوں کا ایک پلندا نکالا اور نجیب محسن کے سامنے پھیلا دیا۔

''میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے صاحب، بہت ظلم!''

''ظلم؟''؛ نجیب کا دھیان اپنے سامنے پڑے کاغذوں کی طرف ہو گیا۔ سب سے اوپر بنک کے نام ایک درخواست تھی۔ اس نے درخواست دہندہ کے دستخطوں کے نیچے لکھی گئی تاریخ دیکھی، گویا یہ درخواست کوئی دو سال پہلے دی گئی تھی۔

''نذیر سلطان؟''

''جی، جی۔''

نجیب نے اس پر غور نہیں کیا کہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے اس کے پہلے استفسار کا جواب دیا تھا یا اپنے نذیر سلطان ہونے کی تصدیق کی۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھ رہا تھا کہ وہ شخص اپنے ہاتھ بری طرح مسل رہا تھا اور اس کے ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ بات کہاں سے شروع کرے اور کن لفظوں سے شروع کرے اس کا فیصلہ نذیر سلطان نہیں کر پا رہا تھا۔ نجیب کے استفسار نے اس کی مدد کی اور اسے لگا جیسے ''جی، جی'' کہنے سے اس کے حلقوم کے اندر کی پکڑ ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔

''بنک نے کیا کیا اس درخواست پر؟''

''بنک نے کیا کرنا تھا جی۔ ایک بے وسیلہ شخص کی درخواست پر اس ملک میں کیا ہو سکتا ہے۔ جواب نیچے لگا ہوا ہے درخواست کے۔''

نجیب نے درخواست پڑھ لی تھی، نادہندگان کی ایسی شکایات سے اس کا واسطہ پڑتا رہتا اور اسے اندازہ تھا کہ بنک نے اس کا کیا جواب دیا ہو گا۔ اس نے کاغذات کو الٹا پلٹا، ان میں کچھ بنک کی رسیدیں تھیں اور ایک اسٹیٹمنٹ آف اکاونٹ بھی۔

''آپ نے نیلامی سے پہلے کچھ رقم جمع بھی کروائی تھی۔''

''جی۔تین رسیدیں ہوں گی ان میں رقم جمع کرانے کی۔ایک دس ہزار اور دو پندرہ پندرہ ہزار کی۔''

''قسطیں تو زیادہ بقایا تھیں۔اتنے میں نیلامی کیسے رک سکتی تھی؟''

''جی،آپ نے ٹھیک کہا مگر میرے پاس یہی گنجائش تھی اور مینیجر نے ہر بار یقین دلایا تھا کہ نیلامی روکنا اس کے ہاتھ میں ہے وہ روک دے گا۔اور یہ کہ نوٹس تو بس خانہ پری تھے۔''

''خانہ پری؟''

''جی ہاں،اس نے یہی کہا تھا کہ سرکاری کھاتے میں نوٹس ضروری تھے،اس لیے دیے اور کچھ نہیں ہوگا۔اور نیلامی والی تاریخ جو اس اخبار والے نوٹس میں چھپی تھی،اس روز بھی میں برانچ گیا تھا وہاں کچھ نہیں ہوا تھا۔دیکھیں،یہ کاغذ اور تاریخیں ملا کر دیکھیں رسیدوں سے۔''

جو کچھ وہ کہہ رہا تھا بہ ظاہر درست لگتا تھا۔کاغذوں کے پلندے میں بنک کی طرف سے دیے گئے نیلامی کے نوٹس اور ایک اخبار میں چھپے ہوئے اِشتہار کے تراشے کے علاوہ وہ خط بھی تھا جو بنک کی طرف سے اس کی شکایت کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ایسی درخواستوں کے جواب میں لکھا گیا معمول کا ایک خط۔اس میں قانون کی دفعات کا حوالہ دے کر بتایا گیا تھا کہ، اس کے خلاف کی گئی کارروائی نادہندگی کے قانون کے تحت درست طور پر کی گئی تھی۔

نجیب نے کاغذات تہہ کر کے ایک طرف رکھے،کہنیاں میز پر ٹکائیں اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا:

''آپ باہر کمانے گئے تھے،کمایا بھی ہوگا قرض واپس بھی تو کرنا ہوتا ہے۔''

''جی،آپ نے درست کہا۔میں نے خوب محنت کی۔رات دن ایک کیا۔اپنا آپ مارا۔پاکستان آیا تک نہیں اور خوب پیسے بھیجے۔کہا بھی تھا پہلے بنک والوں کی قسطیں جمع کروانا مگر ہم گرے پڑے لوگوں کی ضرورتوں کے منہ مگر مچھ کی طرح منہ کھولے ہوتیں ہیں،پیسے آجائیں تو پہلے ان کے منہ میں ڈالتے ہیں۔''

''تو گویا سب پیسے آپ کے گھر والوں نے اُڑا دیے؟''

''اُڑا نہیں دیے جی،گھر کچا تھا پہلے گرا کر اُس کو پکا کیا،پکا فرش،پکی چھت۔باتھ روم فلش سسٹم۔ میں آیا تو گھر دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ سارا پیسہ تو یہی کھا گیا ہوگا۔بیٹی کی شادی طے ہوگئی تھی اُسے رخصت کرنے آیا تھا۔بنک کے نوٹس پر نوٹس آرہے تھے۔اِدھر یہ اُدھر وہ بیوی پر غصہ آگیا جو منہ میں آیا بک دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔پہلی بار مجھے لگا ان چند برسوں میں وہ بہت بوڑھی ہوگئی تھی۔کہنے لگی؛''تمھاری نظر میں سارا پیسہ پکی دیواروں،فرشوں اور چھتوں پر تھوپ کر میں نے اچھا نہیں کیا،بنک میں جمع کرایا ہوتا۔بیٹی گھر بیٹھی،بوڑھی ہو رہی تھی،اسے بوڑھی ہونے دیتی۔زمانہ بدل گیا ہے نذیر۔بیٹی کا

باپ بن کر سوچ۔ اس پکے گھر کو دیکھ کر ہی تو یہ رشتہ آیا ہے۔ اب تمھارے پاس جو کچھ ہے چاہو تو جا کر بنک جمع کروا آؤ۔ بیٹی کو اگلی چھٹی پر رخصت کر دینا۔'' میں اس کے طنز کو سمجھ گیا اور اس سوجھ بوجھ کو بھی جو ایک ماں کے پاس ہی ہو سکتی تھی۔ میرے پاس پیسے تھے، بنک میں کچھ زیادہ جمع کرا دیتا مگر کچھ دنوں بعد بیٹی کی بارات ہمارے گھر آنے والی تھی اور اسے عزت سے رخصت بھی کرنا تھا۔ بس جتنی گنجائش نکلی وہ جمع کرا آیا تھا۔''

نجیب نے اس کی کہانی سے اُکتا کر کہا:

''اس میں اب میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں ہو سکتا؟''

وہ تڑپ کر سیدھا بیٹھ گیا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور نہایت مایوسی کے عالم میں کہا:

''کچھ کریں جی آپ۔۔۔ ورنہ میں تباہ۔۔''

وہ بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ اس کا حلقوم ایک بار پھر اندر پڑنے والے آنسوؤں نے جکڑ لیا تھا۔ نجیب اٹھا، اس نے اپنے پہلو میں پڑے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے غٹ غٹ سارا گلاس لنڈھا لیا۔ شاید اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی یا پھر شاید وہ اپنے آپ کو اس طرح کچھ کہنے کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔ ہونٹوں سے گلاس الگ کرتے ہی اسے لگا کہ وہ بات کر سکتا تھا۔

''دیکھئے، اب مجھ پر دباؤ بڑھ رہا ہے کہ میں اپنی زمین کا قبضہ چھوڑ دوں۔''

''زمین کی نیلامی تو بہت پہلے ہو چکی۔ آپ نے ابھی قبضہ نہیں دیا؟''

''کیسے دے دوں؟ ''

اس کی آنکھیں اور ہتھیلیاں ایک ساتھ پھیلیں اور آواز اونچی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر مدھم آواز میں کہنے لگا:

''آپ کا کیا خیال ہے میری زمین فضل داد نے بنک والوں سے نیلامی میں خریدی ہے۔ کاغذات میں یہی لکھا ہے نا''

نجیب نے اُچٹتی نگاہ کاغذوں کے پلندے پر ڈالی اور سر اثبات میں ہلا دیا۔

''نہیں صاحب، میری زمین اصل میں ممبر صاحب نے خریدی ہے، فضل داد تو ان کا محض ایک کارندہ ہے۔ ممبر صاحب ہی قبضہ چھوڑنے کا دباؤ ڈال رہے ہیں مجھ پر۔''

نجیب پہلی بار چونکا اور کہا:

''ممبر صاحب؟۔۔۔ گویا منیر احمد کھچی نے؟''

''جی، کھچی صاحب نے۔ جب مجھے پیسوں کی ضرورت تھی دوبئی کے ویزے کے لیے تب میں گیا تھا ان کے پاس۔ ان کی نظر تھی میری زمین کے ایک حصے پر، کہنے لگے یہ لکھ دو اور پیسے لے جاؤ۔ میں بنک کے پاس چلا آیا۔ زمین تو ماں بیٹی جیسی

ہوتی ہے نا کیسے بیچ دیتا۔ اگر پچھلی حکومت ختم نہ ہوتی تو وہ میری زمین کا قبضہ لے بھی چکے ہوتے۔ جی، وہی زمین جو میں نے نہیں بیچی تھی مگر انھوں نے خرید لی تھی۔ اُن کے آدمی مجھے کہہ گئے تھے کہ زمین اب اُن کی ملکیت ہے اور وہ اسے زمان گل خان کو ٹھیکے پر دے رہے ہیں۔''

اس نے لمبی سانس لی اور نجیب سے پوچھا؛'' آپ جانتے ہوں گے ناں گل زمان خان کو؟''

نجیب ہنس دیا'' بھلا میں کیسے جان سکتا ہوں اسے؟''

'' تھوڑا وقت ہوا ہے ناں یہاں آپ کو، جان جائیں گے۔ وہ کابلی پٹھان ہے۔ سود خور کابلی پٹھان اور قاتل بھی۔ کئی لوگ اس سے قرض لے کر اُجڑ چکے ہیں۔ اس کے کئی کاروبار ہیں۔ اور اندر کی بات یہ ہے کہ وہ ممبر صاحب اور پولیس والوں کا خاص آدمی ہے۔ زمین کا ٹھیکہ زمان گل خان کو دیے جانے کا مطلب تھا کہ میری مکمل بربادی۔ یہ میں جانتا تھا اس لیے میں نے بنک کو جو درخواست دی تھی۔ مگر بنک والوں نے کیا کیا، مجھے اس پر اس نے ٹھینگا دکھا دیا۔ بنک کا جواب خود پڑھ لیا آپ نے۔ کہتے ہیں میں نے قرض پر لیا ہوا ٹریکٹر بیچ دیا اور رقم نہیں لوٹائی۔ ہاں میں نے ایسا کیا تھا۔ میں نے پہلے بتا دیا تھا کہ مجھے ٹریکٹر نہیں کیش چاہیے تھا۔''

نجیب نے چونک کر اس کے الفاظ دہرائے:

'' پہلے بتا دیا تھا۔ کیش چاہیے تھا؟''

نجیب نے اس کے دیے ہوئے کاغذات کو ایک بار پھر دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھی کہ اس نے ترت کہہ دیا:

''ان میں کچھ نہیں ہے جی۔ ان میں تو ٹریکٹر کا ہی لکھا ہوگا اور یہ بھی کہ میں نے بیچ دیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی تو بنک نے میری زمین کی نیلامی کے ذریعے واجبات کی وصول کر لیے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔ یہی لکھا ہوا ہے نا، ان میں؟''

''ہاں، اور یہی قانونی اقدام ہوسکتا تھا وصولی کا۔''

'' قانونی؟''

اس نے اپنی ہتھیلیاں ایک دوسری میں لے کر مسلیں۔ اور ایک بار پھر بڑبڑایا۔

'' قاااانو ووونی!''

اس بار اس نے لفظ کھینچ کر لمبا کر لیا تھا اور اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

'' قانون جو ہمارے لیے ہے صرف۔''

اس نے شیشے کی دیوار سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''صرف ہمیں پھانسے والا پھندا''

پھر وہ نیچے دیکھنے لگا اور کچھ سوچ کر جیسے ہنس دیا تھا۔

''مرغیوں کو پکڑنے کے لیے ہم کھارے کا استعمال کرتے ہیں، جی کھارا دیکھا ہے کبھی آپ نے، سرکنڈے سے بنا ہوا ٹوکرا۔ اسے الٹا کر کے ایک کنارا بالشت بھر اس شاخ کے ٹکڑے پر ٹکا لیتے ہیں جس سے رسی بندھی ہوتی ہے۔ مرغیاں کھارے کے نیچے بکھرے اناج کو چگنے آتی ہیں اور ہم اسی تاک میں دور بیٹھے رسی کھینچ لیتے ہیں۔ یہ قانون ہمیں بھی یوں ہی پھانستا ہے۔''

''مگر اس میں بنک کا کیا قصور ہے۔ اس نے تو ایک قانونی اقدام لینا تھا، لیا۔۔۔ اور کیا کرتا۔۔۔ آپ نے بھی تو۔۔۔''

اس نے سر جھکا لیا اور کہا:

''ہاں میں نے بھی تو قرض نہیں لوٹایا تھا۔۔۔۔''

نجیب کو اب اس میں دلچسپی نہیں رہی تھی کہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تھا۔ وہ اس کی باتیں سنی اَن سنی کرتا بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ جو تفصیلات اس شخص نے بتائی تھیں، انہیں کام میں لا کر اسے کھچی صاحب کے ملوث ہونے کا کیس تیار کرنا تھا مگر اس کی بات طویل ہو رہی تھی اور اس میں سے مزید کام کی کوئی بات نہ نکل رہی تھی۔ تاہم اسے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ ایسا کیس بن سکتا تھا جس میں ہیڈ آفس والوں کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ معزول کی جانے والی حکومت میں یہ ایم این اے وفاقی وزیر رہا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کیس اور بھی اہم بن گیا تھا۔ وہ شکر بجالایا کہ خدا نے بروقت اس آدمی کو اس کی مدد کے لیے بھیج دیا تھا ورنہ اگر وہ رپورٹ ہیڈ آفس چلی جاتی جو اس نے تیار کر کے ڈسپیچ ہونے کے لیے رکھ چھوڑی تھی اور بعد میں یہ کیس نکل آتا، جس میں اب کئی طرح کے پیچ پڑ گئے تھے تو سیدھا اِن ایفی شینسی کا کیس بنتا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے وہ اندر سے کانپ گیا۔ اب، اسے ایسی حکمت عملی اپنانا تھی کہ ہر اس بات کو رپورٹ کا حصہ بنایا جا سکے جو اس ایم این اے کے خلاف کیس کو مضبوط بنا سکتی تھی۔ اس نے شکایت کنندہ کو ساتھ لیا اور متعلقہ برانچ پہنچ گیا۔ نئے سرے سے ریکارڈ منگوایا اور اس نہج پر انکوائری شروع کر دی۔ اب وہ سارے قرضے جو کھچی صاحب اور اُن کے گھرانے نے لیے تھے معمول کی بات نہ تھے، ایک ہی خاندان کو نوازنے کی بدترین مثال بن سکتے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا قرض اس لیے دیا جاتا رہا تھا کہ پچھلے بقایا جات ادا ہو جائیں۔ برانچ مینیجر بھی بدلے ہوئے تیور دیکھ کر جان گیا تھا کہ اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ اس کے حق میں نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ حوصلے میں رہا۔ بیچ میں اس نے باہر نکل کر کہیں فون بھی کیا اور واپس آ کر نجیب محسن کے سامنے بیٹھ گیا۔ جب شکایت کنندہ نذیر سلطان کی فائل منگوائی گئی تو مینیجر کے لیے مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے ہونٹوں کے وسطی حصوں کو باہم ملا کر دبا لیا، یوں کہ ہونٹوں کے بیرونی کنارے بطخ کی چونچ کی طرح آگے کو نکل آئے تھے۔

''جی دیکھیے، یہ رہا لون اپلی کیشن فارم، اس میں ٹریکٹر مانگا گیا ہے۔۔۔اور یہ رہا اپروول لیٹر، یہاں بھی ٹریکٹر ہے۔۔۔ اور۔۔۔''

شکایت کنندہ تیزی سے آگے کو جھکا، پوری قوت سے اپنا مکا میز پر مارا اور غصے سے چلا کر کہا:

'' بکواس۔۔۔بکواس ہے یہ سب۔''

اس نے مکا کھول کر پھیلی ہتھیلی کو فائل پر اُلٹایا اور ساری انگلیاں کھول کر اکڑا لیں۔ پھر مینیجر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''قسم اُٹھا کر کہو۔۔۔میں تمھارے پاس ٹریکٹر کے لیے آیا تھا۔۔۔نہیں ناں۔۔۔ مجھے نقد رقم چاہیے تھی۔۔یہی بتایا تھا ناں ۔۔ایجنٹ کو دینے تھے تین لاکھ دوبئی کے ویزے کے لیے۔اور تم نے پانچ لاکھ والے ٹریکٹر کا کیس بنا دیا تھا۔''

مینیجر نے بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فائل کی طرف دیکھ کر نجیب جمال سے کچھ کہنا چاہا:

''اس میں۔۔۔''

''اس ماں کی بات چھوڑو، یہ تو تمھاری بنائی ہوئی ہے۔۔۔۔۔''

طیش میں آئے نذیر سلطان نے اسے نجیب سے بات کرنے نہ دی، تو وہ اسی سے مخاطب ہو گیا۔

''اس پر دستخط ہیں تمھارے۔۔۔ٹریکٹر کے لیے۔''

''ہاں ہیں۔۔۔''

وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ تان کر مینیجر کے سر کر رکھ دیا۔''سمجھو تمھارے سر پر قرآن پاک ہے۔اس کی قسم کھاؤ تم نے نہیں کہا تھا، یہ تو بس خانہ پُری ہے۔وہ کیا کہا تھا انگریزی میں، فارمیلٹی۔۔۔اور کہا نہیں تھا کہ ٹریکٹر بکوا دوں گا میسی گیٹ کے باہر ہی۔۔اور تم نے بکوا دیا تھا اور پچاس ہزار لیے تھے اس کے۔''

مینیجر کے منہ پر جیسے طمانچہ پڑا تھا۔ ہک دک اسے دیکھنے لگا۔

نجیب بڑبڑایا:''پ پ پ پچاس۔۔۔''

''جی صاحب پچاااس ہزار''

نذیر سلطان نے پچاس کا لفظ کھینچ کر ادا کیا اور اپنا ہاتھ بھی ساتھ ہی کھینچ لیا:

''اس سے بعید نہیں صاحب کہ یہ جھوٹا قرآن بھی اُٹھا لے۔اس کی مونچھ کے ایک ایک بال سے سو سو سور بندھے ہوئے ہیں۔ حرام کھانے کی عادت ہے اسے۔حرام کھاتا ہے اور ڈکار جاتا ہے کہ ممبر صاحب اس کے پیچھے ہیں۔''

پھر وہ براہ راست مینیجر سے مخاطب ہوا:

''کہہ دو یہ بھی جھوٹ ہے۔تم نے ممبر صاحب کو جھوٹے نیلام کی کارروائی ڈال کر میری زمین دے دی۔تم یہ ظلم کر سکتے ہو تو جھوٹا قرآن بھی اُٹھا سکتے ہو۔۔۔نہیں نہیں قرآن نہیں،تم پر تمھاری بیوی حرام،رن طلاق ہے تمھیں اگر جھوٹ بولو۔کہو اس میں کیا غلط ہے،کیا جھوٹ ہے۔بولو،بولو۔''

اُس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑنے لگے تھے۔مینیجر اس غیر متوقع صورت حال سے بہ ظاہر گھبرا کر اپنی کرسی سے اُٹھا اور باہر نکل گیا تھا۔شکایت کنندہ بھی اپنی کرسی پر ڈھے گیا تھا۔سارے میں یوں لگتا تھا خامشی ناچ رہی تھی۔ایسے میں ایک بھن بھن کرتی آواز کو صاف سنا جا سکتا تھا۔مینیجر شاید باہر ہال میں کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔یہ سب آناً فاناً ہوا تھا۔بس ایک لمحے میں جو گزر گیا تھا۔مینیجر واپس آ کر نجیب کے سامنے یوں بیٹھ گیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔اس نے دونوں میں سے کسی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔یہی وہ وقت تھا کہ ٹیلے فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔شاید وہ دونوں سے بے نیاز ہو کر اسی گھنٹی کا منتظر تھا۔

''ہیلو۔۔۔جی جناب۔۔۔حاضر سائیں۔۔۔جی یہ لیں سائیں ابھی بات کراتا ہوں۔۔۔''

مینیجر نے مکمل طور پر بحال ہو چکے حواس کے ساتھ اپنے باس نجیب کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''سر آپ کے لیے۔۔۔ایم این اے صاحب ہیں لائن پر۔۔۔''

نجیب محسن نے اگلا پورا دن لگا کر رپورٹ تیار کی تھی۔وہ اپنے تئیں خوش ہو رہا تھا کہ مارشل لا میں کڑے احتساب کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس میں کھچی جیسے کرپٹ سیاست دانوں پر بھی ہاتھ ڈالا جا سکتا تھا ورنہ یہ لوگ قابو میں آنے والے کہاں تھے۔اب یہ دھوکا دہی،نادہندگی اور ایک لحاظ سے سرکاری واجبات کے غبن کا ایسا کیس بن گیا تھا کہ یہ بدمعاش جیل میں ڈال دیا جاتا تو وہیں گلتا سڑتا رہتا۔جب وہ رپورٹ پر دستخط کر رہا تھا تو اسے ٹیلی فون پر گزشتہ روز کھچی صاحب سے ہونے والی گفتگو یاد آ گئی۔پہلے تو اُس نے اس کی نئی پوسٹنگ پر اُسے مبارک باد دی تھی حالاں کہ یہ اب اتنی نئی بھی نہ رہی تھی پھر بہت نرم آواز میں پوچھا تھا،'آپ کی بیٹی ندا،سرسید کالج میں سائنس کی اسٹوڈنٹ ہے نا'اسے تعجب ہوا تھا کہ انہیں اس کی بیٹی کا نام معلوم تھا،اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے 'جی' کہہ کر تصدیق بھی کر دی تھی مگر بعد میں اس کمینے انداز کی دھمکی پر اُس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔اس کے بعد بھی کھچی صاحب نے بہت کچھ کہا تھا مگر اس کے کانوں میں عجب طرح کا شور تھا کہ وہ ڈھنگ سے کچھ نہ سن پایا تھا۔یہ شور تھما تو وہ غصے میں تلملا رہا تھا۔اس نے اپنے تئیں فیصلہ کیا کہ یہی موقع ہو سکتا تھا جب ایسے حرام خور اور ذلیل لوگوں کو سبق سکھایا جا سکتا تھا۔وہ اس باب میں جتنے بھی شواہد جمع کر سکتا تھا،جمع کیے۔شکایت کنندہ اور مینیجر کے علاوہ باقی عملے سے کچھ اس ڈھب سے بیان ریکارڈ کروائے کہ ایک مضبوط کیس تیار ہو گیا۔اب وہ مطمئن تھا اور اس نے اس دوسری رپورٹ پر دستخط کر دیے۔

آنے والے ہر دن کا سورج کڑے احتساب کی خبروں سے ساتھ طلوع ہوتا رہا۔ کئی سیاست دانوں کے نام اخبارات کی شہ سرخیوں میں آنے لگے مگر جس نام کا اُسے شدت سے انتظار تھا شاید ابھی اس کی باری نہیں آئی تھی۔ انہیں دنوں میں سے ایک دن تھا۔ دن نہیں کہ وہ تو ڈھل چکا اور رات پڑ گئی تھی۔ ٹی وی پر رات نو بجے والا خبر نامہ چل رہا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں خبر نامے سے پہلے چلنے والا ڈرامہ دیکھا کرتا۔ اسی دوران وہ کھانا کھاتے اور خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ خبر نامے میں اس کی بیوی اور بیٹی کے لیے دلچسپی کا کوئی ساماں نہ تھا لہٰذا ڈراما ختم ہوتا تو ندا بیٹی وہیں اپنی کتابیں لے کر لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتی اور اس کی بیوی برتن سمیٹنے کچن میں گھس جاتی۔

اُسے بہ ہر حال باقاعدگی سے خبر نامہ سننا ہوتا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ کچھ زیادہ توجہ سے سننے لگا تھا۔ اس روز پہلی مختصر خبر نئی کابینہ کی تشکیل کی تھی پھر دوسری خبروں کا خلاصہ آیا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ خاص خاص خبروں میں احتساب جیسی اہم خبر جگہ نہ پا سکی تھی۔ جس نام کو سننے کا منتظر تھا وہ احتساب والی خبر میں ہی وہ سن سکتا تھا۔ اُسے قدرے مایوسی ہوئی تاہم وہ مکمل طور پر مایوس نہیں تھا۔ اس نے سوچا، ممکن وہ خبر جس کا اسے انتظار تھا مفصل خبروں کا حصہ ہو۔ وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ خبروں کی تفصیل میں بھی پہلی خبر نئی کابینہ کی تشکیل کی تھی جس میں اب ایک ایک وزارت کا بتایا جا رہا تھا۔ اچانک اس میں وہ نام سنائی دے گیا۔ وہی نام جسے سننے کا وہ کہیں اور منتظر تھا مگر یہاں ہکا بکا سن رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا پھر اس کے کانوں میں شور اُٹھا اور اس شور کے اندر سے کسی نے اس کی پیاری بیٹی ندا کا نام لیا۔ اس کی سماعت میں بہت نرمی سے ندا کا نام اُنڈیلا گیا تھا مگر بہت شدت سے اس نے بیٹی کا نام اوپر فضا میں اُچھال دیا۔ اتنی شدت سے کہ وہ اس کا حلقوم پھاڑتا ہوا نکلا تھا۔ پھر وہ بیٹی کی سمت لپکا اور اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچ پاتا، بیچ ہی میں کہیں لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا تھا۔

☆

محمد حامد سراج

مالٹے کا رس

وہ خوشی سے گل نار ہوگئی۔ چھوٹے سے کوارٹر میں خوشیاں یہاں سے وہاں بھاگنے لگیں۔ اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگیا۔ وہ باپ کے گلے میں جھول گئی۔ اس کی ماں خوشی میں توے پر روٹی جلا بیٹھی لیکن رات میں میاں بیوی اکیلے میں ایک دوسرے کو تکا کیے کہ اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ سامنے دیوار۔ عسرت کی اینٹوں سے چنی۔ سناٹا' لیکن باپ نے تیقن کو اپنے دل سے نکال کر بیوی کی ہتھیلی پر رکھا کہ میرے نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ باپ کی دعا اولاد کے حق میں قبول ہے۔ وہ ایک سرکاری ادارے میں ڈرائیور تھا۔ اس نے بیوی سے کہا یہ اس کریم کی عطا ہے کہ ہماری بیٹی کا داخلہ ہوگیا ہے۔ شکرانے کے نفل ادا کرو۔

باتوں باتوں میں بجلی اور گیس کے بل کا ذکر آ گیا۔ آج بل کی آخری تاریخ ہے۔ بل جمع کرا کے آئیں۔ اس تنخواہ میں پوری نہیں پڑتی۔ کتنا پیٹ کاٹا جائے۔ گاؤں کا سوچیں وہاں اب بھی ہزار سکھ ہیں۔ زندگی آسان ہے، پہلے زندگی کو سمجھیں۔

''کیا کریں بچوں کی تعلیم ضروری ہے۔ گاؤں میں تعلیم ممکن نہیں ہے۔ ہماری کوئی جائیداد نہیں ہے۔ ہمارے بچے سونے کا چمچ لے کر پیدا نہیں ہوئے۔''

''آپ ہر وقت جانے کس دنیا کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ زمین ہے اس کے مسائل ازل سے ہیں آج کے نہیں۔ معاشی مسائل بھی جنم کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں ہمارے ساتھ پروان چڑھتے ہیں۔ اور ایک دن ہمیں نگل جاتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کا مقدر ازل سے ایک جیسا ترتیب دیا گیا ہے۔''

لونگوڑی گئی گیس بھی۔۔۔ اب ناشتہ بنانے کا کیا کروں۔ گاؤں ہوتا تو لکڑیاں جلا کے میں بنا لیتی۔

''یہ بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ تو اس ملک میں مستقل عذاب ہوگئی ہے ؟''

''یہ حکومت کے عذاب ہیں جو عوام جھیلتے ہیں۔''

سب عذاب ہیں ہمارے سر پر۔ اب تو خبر نامہ بھی دہشت گردی ہے۔ سارا دن سارے چینل ہمارے گھروں میں کمروں میں بلا وجہ خبریں پھینکتے اور ہمیں دہشت زدہ کرتے ہیں جیسے اس دنیا میں کہیں کوئی خوشی کی خبر ہے ہی نہیں۔ مت لگایا کرو یہ چینل مجھے وحشت ہوتی ہے۔''

''یہ وحشت کا وقت نہیں ہے۔ شائستہ کی فیس' داخلہ جمع کرانا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔۔۔''

''کس نے کہا تھا میڈیکل کالج میں داخل کراؤ۔۔۔اب بھگتو....اچھا بھلا ایف ایس سی کر گئی تھی۔ملازمت مل رہی تھی۔تم نے کہا ہم دن رات ایک کریں گے۔اللہ مسبب الاسباب ہے۔کوئی صورت نکل آئے گی۔''

''لاکھوں کی رقم پس انداز کرنا آسان ہے کیا۔۔۔؟زندگی عذاب کر کے رکھ دی ہے۔ہماری اپنی کوئی زندگی ہے؟نہیں ہے نا۔۔۔بس بچوں کے عذاب بھگتو۔

''حوصلہ نہ چھوڑو'سلائی مشین اور یہ جو نیاری گھر میں کھول رکھی ہے'اس سے اچھی بھلی رقم بچ رہتی ہے..؟''

بس بچے پیدا کرنے کا شوق تھا' کس نے کہا تھا بچے پیدا کرو' نہ کرتے ۔۔۔ہونہہ۔۔۔اس وقت تو تجھے بڑا شوق تھا۔دیر کیوں ہو رہی ہے۔''

''اب کتنی جمع پونجی ہے؟''

''چالیس ہزار جمع کر لیے ہیں تمھارے پاس کتنے ہیں؟''

''پندرہ ہزار روپے ہیں''

''کل پچپن ہو گئے۔۔۔اب باقی کی بھیک کس سے مانگوں؟''

متوسط گھرانہ کے میاں بیوی کا حسن اور جوانی معاشی مسائل نگل گئے اور گھر میں ہر وقت کی بک بک اور چخ چخ نے کئی بیماریوں کو جنم دیا،علاج پر الگ پیسہ اٹھنے لگا وہ دونوں اوسط سوچ کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے لیکن ان کے بیٹی کے نمبر اتنے شان دار کہ اس نے میڈیکل کے لیے ضد کی اور یہ اس کا حق تھا۔داخلہ تو میرٹ پر ہو گیا لیکن آسمان ایسے مسائل اور معاشی تنگی نے انھیں پیس ڈالا۔گھر میں نوک جھونک' معمول بن گئی۔بیٹی نے دن رات ایک کیا لیکن ابھی آدھا سفر باقی تھا ڈاکٹر کی ڈگری لینے میں۔۔۔۔!''

ایک دن وہ دفتر میں میز پر کہنیاں ٹکائے اپنے اندر کے طوفان سے نبرد آزما تھا کہ اس کے ایک کولیگ نے اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔اس کے چہرہ کو غور سے دیکھا اور بولا:

''یار کون سا غم ہے جس نے تمھیں نچوڑ لیا ہے''؟

''یار ہمارے غم کیا...؟یہی مالی مشکلات....عمر کٹ جاتی ہے....ہم کٹ جاتے ہیں لیکن مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔''

''میری ایک بات مان لو۔زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔۔۔۔چلو بہت آسان نہ سہی بہتر ہو جائے گی۔ ہمارے صاحب کو شام کے لیے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ان کی بیگم صاحبہ نے کل بھی مجھے کہا۔میرے خیال میں وہ

تنخواہ اتنی معقول دیں گی کہ تمھاری بیٹی کی فیس کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔

''شام میں دیوٹی کیا ہے؟''

''ان کی بیٹیوں کو ٹیوشن پر لے جانا ہے اور کبھی کبھار بیگم صاحبہ نے خریداری کرنا ہو تو بازار....بس۔۔۔۔!''

دوسرے دن اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تیار ہو کر بیوی سے کہا کہ مجھے ایک جگہ شام کی نوکری کی کرن نظر آئی ہے دعا کرنا۔اس طرح بیٹی کی فیس کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور ذرا ہاتھ بھی کھلا رہے گا۔وہ گھر سے امید باندھ کے نکلا اور صاحب کی کوٹھی پر بیل دی۔نوکر نے گیٹ کھولا اور اسے لان میں بٹھایا۔تھوڑی دیر میں بیگم صاحبہ نمودار ہوئیں۔نکلتا ہوا قد' بال کھلے شانوں پر بکھرے' وہ بجلی کی سی سرعت سے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھو بیٹھو۔۔۔بڑی تعریف سنی ہے تمھاری شرافت کی....''

اس نے سر جھکا لیا....''

''بھئی میری دو بیٹیاں ہیں۔زمانے کا چلن تمھارے سامنے ہے۔ہمیں ڈرائیور کی نہیں ایک اچھے انسان کی ضرورت ہے تم تنخواہ کی فکر مت کرنا۔انھیں اپنی ذمہ داری میں ساتھ لے جانا ہے اور ساتھ واپس لانا ہے''

''آپ بالکل فکر نہ کریں جی....میری اپنی بیٹی کالج میں ہے''

''یہ تو اور اچھی بات ہے''

''دس ہزار روپیہ میں تمھیں ماہانہ دوں گی۔اللہ نہ کرے کوئی مشکل ہو تو بلا جھجک بتا دیا کرنا''

اسے ایسا لگا اس کے دکھ کم ہو گئے ہیں۔وہ پُرسکون گھر پہنچا اور بیوی کو خوش خبری سنائی کہ صاحب کی دو بیٹیاں ہماری بیٹی کی طرح میڈیکل کالج میں پڑھتی ہیں انھیں شام میں ٹیوشن پر لے جانا ہے اور ماہانہ وہ دس ہزار روپیہ دیں گے۔اس کی بیوی کے چہرے پر پہلی بار اطمینان اترا اور اس رات وہ چین کی نیند سوئی۔

اسے اپنے اللہ پر مکمل یقین تھا کہ اس کی بیٹی ایک خوبصورت اور خوش گوار زندگی گزارے گی۔وہ بیٹوں کی طرف سے اتنا فکر مند نہیں تھا لیکن بیٹی کے لئے اس کے سجدے طویل ہو جاتے۔وہ اس کے لیے اچھے گھرانے اور آسودہ زندگی کے خواب دیکھتا۔اس رات اس نے طویل سجدہ کیا اور اپنے رب سے بات کی۔کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ آخر شب اللہ کریم آسمان دنیا پر اپنی مخلوقات کو پکارتے ہیں کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا' ہے کوئی مانگنے والا جس کو میں عطا کروں۔وہ اپنے رب سے بات کرتا رہا۔رب کریم زمین پر سے حیا اٹھتی جا رہی ہے۔ہماری یہ میراث ہمیں لوٹا دے۔ہماری عزت کی حفاظت فرما۔ہم بہت کمزور ہیں۔دل' آنکھوں سے لے کر لباس تک حیا رخصت ہو گئی۔ہماری بیٹیوں کی، بیٹوں کی حفاظت فرما۔ جائے نماز پر اس کی آنکھ لگ گئی۔

وہ صاحب کی بیٹیوں کو ذمہ داری سے لے جانے لانے لگا۔ کبھی ان کی کوئی پارٹی ہوتی تو اسے رکنا پڑتا۔ ایک دن وہ ٹیوشن سے نکلیں تو کہا:

''ہوٹل تک چلنا ہے وہاں ہماری پارٹی ہے۔''

''جی بہتر.....''

وہ انھیں چھوڑ کر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا ۔ اچانک وہ اٹھا اور سوچا میں بھی ہوٹل کا چکر لگا لوں۔ رنگ برنگی روشنیوں اور آئینوں کے عکس در عکس سلسلوں میں وہ راہداریوں سے گزرتا ایک شیشے کے ہال کے سامنے رک گیا۔ وہاں کی دنیا ہی اور تھی۔ رنگ برنگ لباس میں لڑکیاں لڑکے ان کے سامنے شیشے کے حقے' کچھ کے ہاتھوں میں جام اور ایسے بھی تھے جن کے ہاتھوں میں لڑکیوں کی کمر تھی۔ صاحب کی ایک بیٹی ایک لڑکے کے کندھے پر سر ٹکائے شیشہ پی رہی تھی اسے اس وقت سکتہ ہو گیا جب اس کی نظر اپنی بیٹی پر پڑی لیکن وہ شلوار قمیص میں تھی اور اس کے ہاتھ میں اورنج جوس تھا۔ سب حیا سے عاری لباس ٹائٹ اور جینز میں تھیں ۔ وہ واپس کار میں لوٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں خیالات اُلجھ پڑے۔ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے ۔ میں کون ہوں یہ ہم نے کون سی نسل کو جنم دیا ہے؟ اگر ہماری یہ نسل ہے تو پھر یہ کیسی نسل کو جنم دیں گے۔ کیا میں بیگم صاحبہ سے بات کروں؟ وہ ناراض نہ ہو جائیں۔۔۔ اور میری بیٹی اورنج جوس پی رہی تھی۔ اورنج جوس میں حیا کی رتی ہے شاید ہم نے بچوں کو رزقِ حلال کھلایا ہے۔ لیکن میری بیٹی وہاں کیوں گئی....کون لے گیا اسے....؟ ماحول.....؟ کیا وہ بھی ریلے کی لپیٹ میں آ گئی۔ وہ کسی بھی فیصلہ پر نہیں پہنچا تھا کہ صاحب کی بیٹیاں آ گئیں۔

وہ گھر پہنچا تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بیٹی سے سوال کرے۔ وہ چپ چاپ لیٹ گیا۔ تعلیم پر سے اس کا ایمان، شوق سب اُٹھ گیا۔ تربیت کے خال وخد اس کے اندر گڈمڈ ہو گئے۔ کوئی بے بسی سی بے بسی تھی۔ ڈگری کا حصول تعلیم نہیں ہے۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟'' ہنر.....؟ پیسہ کمانے کا ہنر' اداروں میں اب انسان تیار نہیں کیے جاتے بل کہ صرف مشینیں تیار ہوتی ہیں روبوٹ' یہ ترقی ہے....؟ یہ سب کیا ہے....؟ یہ کیا گورکھ دھندا ہے....؟

اگلے روز اس نے جھجکتے ہوئے بیگم صاحبہ سے بات کی۔ وہ بے ساختہ ہنس دیں اور کہا یہ معمولی بات ہے اس کا اثر نہ لو' یہ کلچر ہے تہذیب ہے' نسل نو چاند کے بعد مریخ پر اترنے والی ہے۔ اس لیے کہ ان کے ذہن کھلے ہیں ان پر قدغن نہیں۔ ان کی سوچ آزاد ہے۔ یہ ترقی کی راہ ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو دنیا کو اپنی رو میں بہنے دو، تم ایک اچھے انسان ہو۔

اسی کہانی میں ایک گم شدہ منظر تھا جو کسی کو نظر نہیں پڑا۔ وہ اوٹ میں تھا۔ بالکل الگ سا منظر اور کہانی میں وہ اچانک جڑ گیا۔ یہ اس رات کی بات ہے جب بیگم صاحبہ کی بیٹیاں شیشہ پی رہی تھیں اور ان کا بھائی بھی وہیں موجود تھا۔ جانے وہ وہاں کس سلسلے میں آ نکلا۔ حالاں کہ اس کا مزاج اس کی دنیا ہی الگ تھی۔ وہ کسی اور دنیا میں جڑا ہوا تھا وہ اس گھرانے کا فرد ہی نہیں لگتا

تھا' وہ جو ہنگامے اور ہاؤ ہو اور روشنیوں میں کسی کو نظر نہیں آیا۔ لیکن وہ الگ تھلگ ایک کونے میں ''کافی'' سپ کر رہا تھا اور چپ تھا۔

وہ اپنے مزاج کا تھا۔ گھر پر اس کے شوق بہت مختلف تھے۔ لگتا تھا وہ مس فٹ ہے۔ ہنس مکھ' ملنسار' دکھی انسان کا درد بانٹنا اس کی گھٹی میں تھا۔ نماز وہ گھر کی بجائے باقاعدہ مسجد میں ادا کرتا۔ سادہ شلوار قمیص اس کا لباس تھا۔ سب اُس سے خوش تھے۔ مالی' باورچی' کام کرنے والیاں' چوکیدار' وہ سب سے ہنس کے ملتا اور ان کی مالی مدد میں اس کا ہاتھ بہت کھلا تھا۔ سب کہتے اس کی تربیت دادی نے کی ہے جو ایک تہجد گزار خاتون تھیں۔ ایک دن وہ لان کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس نے مالی کو آواز دی

''مالی بابا۔۔۔۔۔''

جی سائیں۔۔۔۔''

''اندر جاؤ اور عنبرین کو بلا لاؤ۔۔۔''

''جی بہتر سائیں۔۔۔۔''

عنبرین اس کے ساتھ آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔۔۔۔ اور گہرا سانس لیا۔

''بھائی جان۔۔۔ اللہ اللہ آپ نے یاد کیا کوئی خاص کام۔۔۔۔؟''

''بہت خاص۔۔۔ کام ہو گیا تو بہن کو منہ مانگا انعام ملے گا۔۔۔ سمجھ آئی۔۔؟''

''پہیلیاں نہ ڈالیں آپ۔۔۔ میری تو سانس رک رہی ہے''

''تمھیں یاد ہے۔۔۔ ایک بار ایک فنکشن میں ایک لڑکی دیکھی تھی میں نے۔۔۔ جو شلوار قمیص میں دیہاتی سی الگ تھلگ لڑکی۔۔۔ میں نے شاید تم سے اس کا ذکر بھی کیا تھا۔ اتنے میں اس کی ماں بھی لان میں ان کے پاس آ بیٹھی۔ وہ تھوڑا سنبھل گیا۔ بہن سے اس کی دوستی اور بے تکلفی تھی۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں۔۔۔''

''امی بس عام سی۔۔۔ اسے وزن کم کرنے کا شوق ہے۔ ڈرنک کی بات ہو رہی ہے۔ یہ جو آج کی فلیورڈ کولڈ ڈرنکس ہیں۔ ڈیڑھ لیٹر' دو لیٹر' ٹن پیک' یہ سب نقلی ہیں اور صحت کی دشمن' جیسے آج کی فیشن ایبل ٹائٹ میں قید لڑکیاں' بے روح سی' نہ حسن نہ حیا' بس ٹن پیک لڑکیاں۔۔''

''یہ تمھیں لباس سے کیا چڑ ہے۔۔۔؟ جدید فیشن ہے۔ کیا ہم نے زمانے کے ساتھ نہیں چلنا' انسان کی کوئی پرسونلٹی ہوتی ہے''

''امی امی پیاری امی۔۔۔انسان وہی ہے ازل سے' عزت' پرسونلٹی کردار سے ہوتی ہے دولت اور لباس سے نہیں''

''عقل چل گئی ہے تیری۔۔۔۔''

''ہاں تو وہ لڑکی تمھیں یاد ہے نا۔۔۔عنبرین۔۔۔''

''یاد ہے وہ ہمارے ڈرائیور کی بیٹی ہے لیکن بھائی آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کتنی سادہ اور معصوم ہے وہ' اس روز فنکشن میں شلوار قمیص میں مجھے اچھی لگی اور میں بھول نہیں رہا تو وہ' اورنج جوس سپ کر رہی تھی''

''لیکن آپ کی دلچسپی کا سبب میں جان سکتی ہوں۔۔۔۔؟''

''بالکل جان سکتی ہو۔۔۔''

''اس کے گھر جانا ہے' رشتہ مانگنا ہے۔اس دور میں مالٹے کا تازہ رس نایاب ہوتا جا رہا ہے۔''

☆

شفیق انجم

متن سے باہر کہانی

طلسماتی پہاڑیوں کے دامن میں واقع شہرِ اقتدار میں ایک وسیع تر انسانی المیہ جنم لے چکا تھا لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یا شاید جانتے تو سبھی تھے لیکن کوئی بھی کسی کو کچھ بتانے سے گریزاں تھا۔ سب ایک دوسرے کو شکی نظروں دیکھتے، آپ ہی آپ کچھ تجزیہ کرتے کوئی نتیجہ سا گھڑ لیتے اور چپ ہو رہتے۔ زیرِ لب مسکراہٹوں اور آنکھوں آنکھ اشارتوں میں کہانی کہی سنی جا رہی تھی لیکن لفظوں لفظ کوئی تذکرہ نہ بات۔ سراغ رسانوں نے بہتیرا کھوج لگانے کی کوشش کی کہ اصل معاملے تک پہنچا جائے اور اس سے قبل کہ المیہ اہلِ حکم کے دروازوں پہ جا دستک دے، روک تھام کی کوئی تدبیر نکالی جائے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سراغ رساں بھی بس ضابطے کی کارروائی ڈال رہے ہیں۔ افسروں نے خود کو دفتروں، بیٹھکوں اور محلاتی مجلسوں تک محدود کر لیا تھا اور ماتحتوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے پرانی خبروں پر نئے وقوعے رپورٹ کرنا شروع کر دیے تھے۔ سالوں سال گزر گئے اور المیہ طلسماتی پہاڑیوں سے مسلسل سرکتا عام لوگوں کے گھر آنگنوں میں آ بیٹھا لیکن سرکاری کاغذوں میں معاملہ ابھی پہاڑیوں کی ڈھلوانیں نہیں اترا تھا۔ عام لوگوں میں بے چینی بڑھتی گئی، پس وہ ملتجی نظروں ایک دوسرے کو دیکھتے، کچھ کہنے کو کوشش کرتے لیکن ہر کوئی اس خیال سے کہ کوئی دوسرا پہل کرے، رک جاتا۔ شکی نظروں وہ ایک دوسرے کو تاکتے بات کرنے سے گریزاں رہے۔ حکام نے فائلوں کی سچائی کو پیشِ نظر رکھا اور فصیلوں فصیل گھرے خواب سراؤں میں سب اچھا کی رپورٹ نیچے سے اوپر تک برابر پہنچتی داد و تحسین کی نذر وصولتی رہی۔

شہرِ اقتدار کے رنگ ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں۔ چھوٹی کرسی سے بڑی کرسی تک ادب آداب، وضع قطع اور حاصل حصول کے تانے بانے کچھ اس طرح سے الجھا دیے جاتے ہیں کہ پہلو پہل حکم، ارادت، زور اور زر سرکتا رہتا ہے لیکن ہاتھوں ہاتھ بھائی نہیں دیتا۔ نام اور چہرے بدلتے رہتے ہیں لیکن ہر کرسی کا اپنا اپنا ایک جادوئی دائرہ ہے۔ اس دائرے میں داخل ہوتے ہی اچھا بھلا ہوش حواس والا شخص بھی طلسماتی پہاڑیوں میں بنی کسی خفیہ سرنگ میں جا نکلتا ہے جس کے بارے میں مشہور ہوتا ہے کہ اس کے آخری سرے پر جنت ہے۔ پس ہر داخل ہونے والا بشارتیں وصول کرتا آگے بڑھتا، بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ طلسماتی پہاڑیوں کی ایسی سرنگوں میں المیوں کی بازگشت اول تو پہنچتی ہی نہیں اور اگر پہنچتی بھی ہے تو دب دبا جاتی ہے۔

تو ہوا یوں تھا کہ طلسماتی پہاڑیوں کے دامن میں آباد شہرِ اقتدار میں ایک وسیع تر انسانی المیہ جنم لے چکا تھا اور عام آدمیوں کے گھر آنگنوں میں تو آنکھوں آنکھ گھمبیر سراسیمگی پھیل چکی تھی لیکن اہلِ محل و قلعہ اس سے بے خبر تھے۔ یا شاید

خبر رکھتے تھے لیکن بس اتنی ہی جتنی ماتحتوں نے افسروں اور افسروں نے بڑے افسروں تک فائل در فائل پہنچائی تھی۔ گویا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور اگر کچھ ہوا بھی تھا تو اتنا نہیں کہ سراسیمگی کا باعث بنے۔ غلام گردشوں میں زیرِ لب مسکراہٹوں اور آنکھوں آنکھ کچھ کہنے سننے کا سلسلہ تو چلا لیکن پھر سب دب دبا گیا۔ گویا معاملہ کچھ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو بس اتنا کہ ایک پرانی کہانی کو اجڈ لوگوں نے الٹا سوچنا، یقین کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہانی بھی کچھ خاص نہیں تھی بس ایک روایت سی، کہ زمانوں پہلے کسی قوم کو نافرمانی کرنے پر سزا ہوئی اور انھیں انسان سے بندر بنا دیا گیا۔ تب سے اب تک خاندانوں کے خاندان اور قبیلوں کے قبیلے بندر بنے جنگلوں جنگل سزا کے دن کاٹ رہے ہیں۔ یہاں تک تو بات کسی قدر ٹھیک تھی لیکن تاویل کرنے والوں نے بتایا کہ فیصلے کے دن یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ سزا کی مدت کیا ہوگی۔ پھر یہ بھی طے نہیں ہوا تھا کہ اگر دوبارہ کسی نے ویسی ہی نافرمانی کی تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ ایک گنجائش یہ بھی رہی کہ صرف قالب بدلنے کا حکم ہوا تھا؛ عادتیں، جبلتیں اور رسم ورواج وغیرہ کی تبدیلی فیصلے میں شامل نہیں تھی۔ پس بندر بننے والوں کو اول اول تو افسوس ہوا لیکن جلد ہی انھوں نے نئی آزادیوں کی فرحت محسوس کی اور جشن مناتے جنگلوں کو روانہ ہوئے۔ مسئلہ صرف ایک دُم اور چار پاؤں پر چلنے کا تھا۔ لیکن ذرا سی مشق کے بعد یہ عیب بھی خوبی بنا اور شاخ شاخ جھولے پڑے۔ ہر قبیلے نے اپنا اپنا علاقہ طے کیا اور ریاستوں ریاست ایک نیا جہان آباد ہوتا چلا گیا۔ کھانے پکانے، اوڑھنے بچھونے کے جھنجٹ سے خلاصی ملی تو عشق معشوقی کی قدیمی دیرینہ خواہش عود کر آئی اور جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پر اشغالِ عروسی نے راہ پائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں ہر ہر قبیلے کی آبادی اتنی بڑھی کہ دنیا بھر کے جنگل بھی کم پڑ گئے۔ کہتے ہیں انسانی آبادیوں نے یہ عالم دیکھا تو اندر ہی اندر تلملائے اور آہیں بھریں کہ کاش ہم بھی سزاوالوں میں سے ہوتے۔ لیکن افسوس کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا۔ مایوسی کے عالم میں قانون گووں نے سر جوڑا اور ظاہر ہے حکم کے برابر حکم تو وہ لا نہیں سکتے تھے لیکن نئی تعبیر تو کر سکتے تھے۔ پس تدبر کے ساتھ تعبیروں کی طرف بڑھے اور نکتہ نکالا کہ حکم میں یہ بالکل بھی نہیں کہا گیا تھا کہ بندر بن جانے والے صرف جنگلوں میں ہی رہیں گے۔ وہ آبادیوں میں انسانوں کے ساتھ انسانوں کی طرح بھی رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہیں تو اصل میں وہ انسان ہی۔ نکتہ خوب تھا، پسند کیا گیا لیکن مشکل یہ تھی کہ بندروں کو آبادیوں میں رہنے پر قائل کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے طے ہوا اور شاید ساری سوچ بچار کا مدعا بھی یہی تھا کہ انسانی آبادیوں میں بندروں کی سی بود و باش کی کوئی راہ نکالی جائے۔ پس راتوں رات دُم سازی کے کارخانے قائم ہوئے، چار پایوں پر چلنے کے تربیتی مراکز بنے اور گلی گلی اشغالِ عروسی کا اہتمام فیشن بنتا چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی آبادیاں جنگلوں پر حاوی ہوتی چلی گئیں اور بندروں اور انسانوں میں فرق وامتیاز جاتا رہا۔

کہانی بس اتنی سی تھی اور تاریخ کے کسی نامعلوم دور میں کسی نامعلوم مقام سے تعلق رکھتی تھی۔ برس ہا برس پہلے

لوگ اس طرح کی کہانیاں گھڑ بھی لیا کرتے تھے اور یقین کرنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بھی بنا لیا کرتے تھے۔ لیکن ایک ایسے زمانے میں جب انسان چاند پر قدم رکھ کر بحفاظت واپس آ چکا ہو، مریخ پر کامیاب مشن بھیج چکا ہو اور اربوں نوری سال دوری پر موجود کہکشاؤں کی تصویر کھینچنے پر قدرت پا چکا ہو؛ ایسی کہانیوں کا سوچا، یقین کیا جانا یقیناً بعید از قیاس تھا۔۔۔ سراغ رسانوں کے مطابق اجڈ لوگ کہانی کا وقوع مانتے آئے ہیں، یہ کوئی خبر نہیں اور بعید از قیاس بھی نہیں۔ خبر تو یہ ہے کہ طلسماتی پہاڑیوں کے دامن میں آباد شہرِ اقتدار میں کہانی الٹائی ہوئی صورت میں ذہنوں ذہن گردش میں ہے اور اجڈ لوگ اس کے وقوع پر یقین بھی کر رہے ہیں۔ کوئی شہادت تو موجود نہیں لیکن رپورٹ ہوا کہ شہر کے مضافاتی جنگل میں سال ہا سال سے آباد بندروں کو کسی نے کسی کے کہنے پر اکسایا اور یہ بات بتائی ہے کہ جلد ہی شہر پھیلتا پھیلتا پہاڑیوں کی چوٹیوں تک چڑھ آئے گا۔ دو تہائی جنگل تو پہلے ہی کٹ چکا اور تم دیکھ رہے ہو کہ اس جگہ جو جدید شہر بسایا گیا تھا وہاں اب تِل دھرنے کو بھی جگہ نہیں۔ پس بچاؤ کی صورت یہی ہے کہ انسانی گلی کوچوں میں پھیل جاؤ اور جہاں جیسے موقع ہاتھ پڑے اپنی دم سمیٹ قالب بدل لو۔ بندروں نے وقتی طور پر تو کہنے والے کو ٹال دیا اور ظاہر یہی کیا کہ ہم کسی کے کہے سنے میں نہیں آتے۔ سنی ان سنی کرنا تو قدیم سے ہمارا شیوہ ہے، اسی لیے تو ہم پر حکم اترا اور سزا نافذ ہوئی۔ لیکن دنوں متفکر رہنے کے بعد ایک روز قرب و جوار کے سب زیرکوں اور اثر رسوخ والوں کو جمع کیا اور سر جوڑ بیٹھے۔ بہت تفکر کے بعد ان میں سے قدیمی شجروں، نسلوں اور گم زمانوں کے قانون قاعدوں کا علم رکھنے والے نے ہنکارا بھرا اور گویا ہوا کہ حکم کی بابت تو سب کو معلوم ہے لیکن شاید آپ بھول رہے ہیں سزا میں مدت کا تعین تو ہوا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ بھی طے کریں تو اس کی حد معتوب نسل کے آخری فرد کی موت تک ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد کی نسل جو کہ شریکِ جرم ہی نہیں تھی اس پر سزا کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے!!۔۔ پس میرا گیان، تجربہ اور علم کہتا ہے کہ ہم سب خود ساختہ سزا کاٹ رہے ہیں اور نیا قالب ہم نے اپنے اوپر اتنا طاری کر لیا ہے کہ ہم اسے بدلنے کا سوچتے بھی نہیں۔ یا شاید یہ عیش کی زندگی ہمیں خوب راس آ گئی ہے اور ہم اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کسی نئے پرانے جھنجھٹ میں پڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہماری دیکھا دیکھی انسانی آبادیاں بھی ہم سی زندگی جینے کی تمنا میں رہیں اور مدتوں کے چلن کے بعد اب ہم میں اور اُن میں کچھ ایسا فرق و امتیاز بھی نہیں رہا۔ کئی بار خواہش ہوئی اور اب بھی ہے کہ آپ سب کو بتاؤں کہ اگر ہم پھر سے انسانی قالب میں جانا چاہیں تو ذرا سی کوشش سے جا سکتے ہیں۔ کہیں بھی کسی کو بھی مغائرت کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوگا۔ سزا کے خود ساختہ تصور کو ایک لمحے کے لیے ذہن سے جھٹکنے کی ضرورت ہے۔ یوں پل جھپکتے میں ہمارا قالب انسانی قالب میں ڈھل سکتا ہے۔۔۔ اس نے سب کے سامنے اپنے آپ کو انسانی قالب میں ڈھال کر دکھایا اور پھر پل جھپکتے میں دوبارہ سے پرانا قالب اوڑھ لیا تو سب کی آنکھیں حیرت و شادمانی سے کانوں کی لوؤں تک جا چڑھیں۔ آن کی آن میں پورا مجمع اس کی تقلید پر آمادہ ہوا اور پھر ایسا غل

مچا کہ بہت دیر تک وہ سب کے سب قالب بدل بدل ایک دوسرے کو چھوتے، چھیڑتے، خوشی میں آپے سے باہر ہوتے، غباڑہ کرتے رہے۔ یہ اچنبھا ہوسکتا ہے، بالکل ہوسکتا ہے اور تم نے دیکھا کہ ہم ایک دوسرے کے سامنے ایسا کر چکے لیکن سنو۔۔۔! میں جانتا ہوں کہ مجھ سمیت تم میں سے کسی کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے انسان بننا شاید قبول نہ ہو پس کچھ ایسا تدبر کرنا کہ اُدھر بھی تم رہو، اور اِدھر بھی۔ سب نے سنا اور اطمینان سے چھلانگیں لگاتے اپنے اپنے ٹھکانوں کو ایسے چلے گویا خوب سمجھ چکے کہ کیا کرنا ہے۔

فائلوں میں لکھے متنوں میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں لیکن سراغ رسانوں کی زبانی اتنا ضرور رپورٹ ہوا کہ شہرِ اقتدار کے مضافاتی جنگلوں میں دن کے وقت بندروں کی تعداد میں کمی نوٹ کی گئی۔ اور کچھ سروے کرنے کے بعد بتایا گیا کہ ایسا ہونا ماحولیاتی تبدیلیوں کے باعث ہے۔ پوری دنیا میں ایسا ہو رہا ہے، برف پگھل رہی ہے، جنگلات کم ہو رہے ہیں، موسموں میں شدت بڑھ رہی ہے، تابکاری اثرات نے حیوانی زندگیوں کو بری طرح متاثر کیا ہے، وغیرہ۔ جواز منطقی تھا پس افسروں نے اپنے سے بڑے افسروں اور انھوں نے افسرانِ خاص تک یہی رپورٹ کیا۔ کسی نے کچھ خاص توجہ نہ دی لیکن نیچے نیچے کے افسران تک یہ کہانی بھی رپورٹ ہوئی کہ اجڈ لوگوں نے گمان کرنا شروع کر دیا ہے کہ بندر کم نہیں ہو رہے قالب بدل رہے ہیں۔ اور وہ بھی صرف دن کے وقت۔ سورج ڈھلتے ہی وہ اپنے پرانے قالب میں لوٹ جاتے ہیں اور دن کو سنسان نظر آتا جنگل رات کو ان کی دھما چوکڑی سے بھر جاتا ہے۔ کچھ سادھو لوگ جو جنگل میں بسیرا کیے رہتے ہیں اور جانوروں کی بولیاں بھی جانتے ہیں، سے منسوب یہ بات بھی رپورٹ ہوئی کہ بندروں کو اپنی سزا کے ختم ہو جانے کا معلوم ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ انھیں انسان بننا اور انسانوں سی زندگی گزارنا بالکل بھی پسند نہیں لیکن معدومیت کے خطرے سے بچنے کے لیے وہ ایسا کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ پہلے تجربے کے طور پر انھوں نے عام آدمی کے قالب میں ڈھلنا قبول کیا ہے کیونکہ اس میں آزار کم ہے اور یہ سہولت بھی کہ آبادیوں میں عام آدمی کے ہونے نہ ہونے کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ کون کیا کر رہا ہے اور کس حالت میں ہے، چند آس پاس والوں کے سوا کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔ اور آس پاس والے بھی بس اسی وقت تک دھیان رکھتے ہیں جب تک کوئی مفاد وابستہ ہو۔ مفاد نہیں تو ایک گھر میں رہنے والے بھی ایک دوسرے سے لاتعلق ہی رہتے ہیں۔ پس سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں بندر علی الصبح اپنا قالب بدلتے اور دن بھر عام آدمیوں کے روپ میں شہر کی بھیڑ میں گھس جاتے ہیں۔ سال بہ سال اس تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور منسوب ہے کہ ان میں سے بہت سوں نے شروع شروع میں تو جنگل واپسی کا اہتمام کیا لیکن جیسے جیسے وہ انسانی قالب کے عادی ہوئے، شہر میں سکونت اختیار کرتے گئے۔ مشہور ہے کہ اس دوران انھوں نے اپنی آبادی اس کثرت سے بڑھائی کہ آدھے سے زیادہ شہر اُنھی کا ہو گیا۔

سراغ رسانوں کی رپورٹ کی ہوئی کہانیوں کو ماتحت افسران قلم زد کرنے کے مجاز تو ہوتے ہیں لیکن افسران بالا

کو سرسری سا بتا دینا اور غیر رسمی خبریت کے ساتھ خود کو بری الذمہ کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پس کہانی پیرایہ بدل بدل اوپر تک پہنچتی رہی اور اگرچہ کرنے کو کچھ نہیں تھا لیکن کچھ متجسس افسران نے اپنے طور پر ایک خفیہ جے آئی ٹی تشکیل دے کر معاملے کو اعلیٰ سطحی لیول پر جاننے کی ٹھانی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس اَن آفیشل کام کو انجام دینے کے لیے کیسے کسی کو مامور کیا جائے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ماحولیاتی تبدیلیوں پر باریک بین جامع رپورٹ مرتب کرنے کی اجازت لی گئی اور ماہرین کی ایک ٹیم جس میں خفیہ کے دو افسران، داخلہ کے دو مع تین فرانزک ماہر، مامور ہوئی اور ایک حاضر سروس افسرِ قانون کی نگرانی میں کام شروع ہوا۔ باقی سب تو طے شدہ ذمے داری نبھانے پر لگے رہے لیکن ان میں دو کو بتا دیا گیا تھا کہ کرنا کیا ہے۔ پس انھوں نے آدم سے قبل و بعد کے سارے نشانات راتوں رات جمع کیے اور چند ہی دنوں میں خبر پہنچائی کہ مذکورہ کہانی کا شہرِ اقتدار سے کوئی تعلق ہے، نہ گزشتہ چند دہائیوں میں ایسی کسی وقوعے کے کوئی آثار ملے ہیں۔ کہانی میں بندروں کے عام آدمی کے قالب میں ڈھلنے والی بات بھی غلط ہے۔ مضافاتی پہاڑیوں کے جنگل میں ایسے کسی سادھو کی موجودگی ثابت نہیں ہوئی جو جانوروں کی زبانیں جانتا ہو۔ البتہ بندر موجود ہیں اور ان کی تعداد کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ شہر کی آبادی کم و بیش رجسٹرڈ ہے اور ڈیٹا بیس کے مطابق سب انسان ہیں۔ انسانوں کو سزا کے طور پر بندر بنایا جانا قبل تاریخ کے کسی دورانیے میں ثابت شدہ ہے۔ اور یہ بھی ثابت شدہ ہے کہ سزا میں مدت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ یہ قیاس تو نہیں کیا جا سکتا کہ کب انھیں دوبارہ انسانی قالب میں ڈھلنے کی اجازت ملی لیکن یہ طے ہے کہ ڈارون کے عہد تک پہنچتے پہنچتے زیادہ تر بندر انسان بن چکے تھے۔ اس کے بعد سے انسانی نسل جہاں بھی جیسی بھی ہے اس میں بندروں کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں عام آدمی یا خاص آدمی کی تخصیص نہیں اور نہ ہی ذکور و اناث کی، وہ بندر ہم آپ بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ افسران نے پسینہ پونچھتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ماحولیاتی تبدیلیوں پر باریک بین جامع رپورٹ والیم ایک سے دس تک جس میں صرف موسموں موسم فراہم ہونے والے پھولوں، پھلوں اور اناج میں کمی بیشی کی تفصیل درج ہو ایک سال کے اندر اندر جمع کرانے کی ہدایت کی اور چائے پانی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

شہرِ اقتدار میں سراسیمگی مسلسل بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو شکی نظروں دیکھتے اور آپ ہی آپ کوئی نتیجہ اخذ کر کے چپ ہو رہتے۔ زیرِ لب مسکراہٹوں اور آنکھوں آنکھ اشارتوں میں کہانی کہی سنی جا رہی تھی لیکن لفظوں لفظ کوئی تذکرہ نہ بات۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، چہ مگوئیاں بھی ہونے لگیں۔ کسی نے کانوں کان یہ خبر بھی پھیلا دی تھی کہ اوپر خانے کوئی جے آئی ٹی بنائی گئی تھی جس کے ماہرین نے بتایا ہے کہ محض آدھا شہر نہیں سارے کا سارا وہی ہو سکتا ہے جو کہانی میں بتایا جاتا ہے۔ اس میں عام آدمی یا خاص آدمی کی تخصیص نہیں اور نہ ہی ذکور و اناث کی۔ پس اجڈ لوگوں نے کہانی کے اندر سے ایک اور کہانی نکال لی اور پھر جیسی جس کے ہاتھ چڑھی وہ لے دوڑا۔ کہانی الٹائی ہوئی صورت میں تھی یا سیدھی،

یہ بات یقین کی حد تک مان لی گئی کہ اوپر سے نیچے تک زیادہ تر وہی ہے جو کہانی میں ہے۔شروع شروع میں جب لوگوں کو ذرا ایک دوسرے کا پاس لحاظ تھا تو غصے کی حالت میں بے قابو ہو کر بھی فریقین اسی پر اکتفا کرتے کہ بس بس جناب، لگتا ہے آپ وہی ہیں جو کہانی میں ہے۔کبھی کبھار بندر کے ہاتھ استرا لگنا، حور کے ساتھ لنگور ہونا، بندر کیا جانے ادرک کا سواد، یا کچھ اسی طرح کی گول مول بات کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لی جاتی لیکن جیسے جیسے عدم شناخت کا المیہ روز افزوں ہوا فلاں ابن فلاں ابن وہ کچھ، جو کہانی میں ہے، کی طرف مراجعت بڑھتی گئی۔افسرانِ بالا اور اہلِ محل وقلعہ اس معاملے پر گرفت کیا کرتے کہ فائلوں میں کچھ بھی رپورٹ نہیں تھا۔غیر رسمی خبریت کے ذریعے جو کچھ پہنچا اس پر انھوں نے یقین تو نہ کیا لیکن شک نے چادر پھیلائی اور عام لوگوں سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ انھوں نے گمان کیا کہ ہم میں سے بھی زیادہ تر وہی ہیں جو کہانی میں ہیں۔شیروانی والوں نے گاؤن والوں کی طرف، گاؤن والوں نے وردی والوں اور وردی والوں نے بیک وقت دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ٹوہ لینے کی کوشش کی اور خجل مسکراہٹوں کے ساتھ نظریں جھکائیں اور اپنے اپنے کام دھندے پر لگے رہنا مناسب سمجھا۔معاملہ دب دبا گیا اور بڑی کرسی سے چھوٹی کرسی کی طرف یہ غیر رسمی بیانیہ پہنچا دیا گیا کہ انسانی المیے و لیے والی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔اجڈ لوگوں کی گھڑی ہوئی کہانیوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنے اپنے کاموں کی طرف دھیان دیا جائے۔

شہرِ اقتدار بڑھتا، پھلتا پھولتا گیا اور آخر یہی ہوا کہ باقی بچ رہے ایک تہائی جنگل پر سڑکیں چڑھ دوڑیں۔ طلسماتی پہاڑیوں کے دامن میں خوبصورت سیر گاہیں بنیں اور چوٹیوں پر عالی شان ہوٹلوں، قہوہ خانوں اور عیش کدوں نے زیب وزینت پائی۔زیریں پہاڑیوں پر پختہ پگڈنڈیاں چڑھا دی گئیں جن پر لوگ ٹھٹھ کے ٹھٹھ سیر تماشے کو نکلتے، چہل قدمی کرتے اور اپنے جسموں کی تراوت کا سامان پاتے۔دہائیوں پہلے کے میلوں میل پھیلے جنگل میں سے بھرا پُرا شہر نکل آیا تھا اور جنگل کم ہوتے ہوتے جھاڑی جھاڑی سارہ گیا۔بندروں کے یہاں صدیوں سے آباد قبیلوں کے قبیلے غائب ہو چکے تھے اور اکا دکا انتہا پسند غولوں کے سوا سب نے اپنے بچاؤ کی اگلی منزلوں کی طرف قدم بڑھا لیے تھے۔۔۔سنا ہے جب شام ہوتی ہے اور سورج شہرِ اقتدار کے جنوب سے سرکتا ہوا مغربی پہاڑیوں کے پیچھے روپوش ہو جاتا ہے تو عجیب سی سنسانی شہر بھر کو گھیر لیتی ہے۔جیسے قدیمی قبروں سے انسانی ڈھانچے باہر نکل کر چپ کھڑے کسی اپنے جیسے کے دیدار کو ترس رہے ہوں۔یا جیسے ملگجی روشنیوں میں نہائی سڑکوں کے کنارے کنارے نیم غنودہ درخت طلسماتی زمانوں کا سوچتے، عزیز قبیلوں کے غل مچانے، لوٹ آنے کے منتظر کھڑے ہوں۔۔۔کہا جاتا ہے کہ شہر بھر سے کہانی غائب ہو چکی ہے اور اب کوئی ایک دوسرے کو شکی نظروں نہیں دیکھتا۔

☆

سید نصرت بخاری

خوف

ماڈل 1947 رنگ زیادہ سبز اور تھوڑا سفید موجودہ حالت بالکل کھٹارہ۔ انجن معذور، لیکن ہانپتا کانپتا آگے بڑھ رہا ہے۔ اس گاڑی کی بیرونی حالت اداس ہے لیکن اس کے اندر کی آرام دہ، بیش قیمت کرسیاں زندگی سے بھرپور ہیں؛ کچھ اور سہولیات بھی ہوں گی جبھی تو جو ایک بار ان پر بیٹھ جاتا ہے، اس کا بار بار ان پر بیٹھنے کو دل کرتا ہے؛ لیکن ساری گاڑی ایسی خوش حال نہیں۔ اس کے مختلف درجے ہیں، مثلاً: اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم، ہفتم وغیرہ۔ درجہ اول مکمل ایئر کنڈیشن ہے۔ اس میں ٹھنڈی نرم ہوا مستانہ وار گھومتی رہتی ہے، اس میں اس کے علاوہ بھی ہر سہولت موجود ہے۔ اس درجے میں سفر کرنے والے گاڑی کا کرایہ ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ گاڑی کے کرتا دھرتا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گاڑی کی روانی ان کے دم سے ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ گاڑی ان کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ درجہ دوم میں اول کی نسبت کم سہولیات ہیں، درجہ سوم پر کشش تو نہیں البتہ تسلی بخش ضرور ہے۔ درجہ دوم سوم سے بھی کرایہ وصول نہیں کیا جاتا۔ باقی درجوں والوں کو کوئی سہولت میسر نہیں۔ ٹوٹے ہوئے شیشے گرد و غبار، دھواں، غلاظت، بدبو اور مختلف قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑے پھانکتے رہتے ہیں۔ اس اذیت سے چھٹکارا ممکن ہے لیکن ان ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کوئی نہیں سنتا۔ یہاں کی سیٹیں غیر متوازن اور تکلیف دہ ہیں، جگہ جگہ کیلیں ڈنک نکالے کھڑی ہیں، جن کی وجہ بدن پر زخموں کا مسلسل ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ اسی بات پر خوش ہیں کہ انھیں اس گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی ہے وہ اسی کو سہولت سمجھتے ہیں اور بہ وقتِ ضرورت گاڑی کو دھکا لگانا کارِ ثواب اور اپنا اعزاز سمجھتے ہیں۔ ان کی تربیت ہی اسی طرح کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ صرف یہی لوگ کرایہ ادا کرتے ہیں، جو بڑھتے بڑھتے سوگنا ہو گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہی لوگ گاڑی کھینچ رہے ہیں۔ یہ لوگ نسل در نسل یہی کام کرتے آ رہے ہیں۔ ایک دفعہ عجیب بات ہوئی۔ درجہ اول میں بیٹھا ایک شخص چیخ چیخ کر کہنے لگا:

"صرف تم لوگ گاڑی کو دھکا کیوں لگاتے ہو۔ یہ ظلم ہے۔ تم دیکھتے نہیں درجہ اول دوم سوم والے دھکا نہیں لگاتے بلکہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ گاڑی تمھاری وجہ سے چل رہی ہے۔ تم کرایہ دیتے ہو۔ تم اس مشقت میں انھیں شریک کیوں نہیں کرتے"۔ اس کے مخاطب درجہ چہارم پنجم اور مزید نچلے درجے تھے۔ اس شخص کی چیخ پکار سن کر لوگ چونکے:

"یہ آدمی سولہ آنے ٹھیک بات کر رہا ہے۔ گاڑی کا کرایہ ہم دیں، رک جائے تو دھکا ہم لگائیں اور یہ مفت خورے ہمارے پیسوں پر عیش کرتے رہے ہیں، اب ایسا نہیں ہوگا"۔ نچلے درجے کی سواریاں ایک دوسرے کو قائل کرنے لگیں۔

"اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھاتے ہیں۔شاید منزل پر پہنچ جائیں"۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہماری تعداد زیادہ ہے۔ ہماری بات مان لی جائے گی"۔

ان لوگوں نے اسے اس ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا جو درجہ اول کا حصہ تھی۔گاڑی چلنے لگی۔نرم اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نچلے درجے تک بھی آنے لگے۔ یہ تبدیلی سب کو بھلی لگی لیکن درجۂ اوّل کے لوگ اسے برداشت نہ کر سکے۔انھوں نے فوجی وردی میں ملبوس ایک ٹارگٹ کلر کی مدد سے اُسے قتل کروا دیا۔اس بات پر گاڑی میں کہرام مچ جانا چاہیے تھا لیکن کوئی زیادہ شور نہیں ہوا۔کہیں کہیں سے کوئی آواز اس کی حمایت میں بلند ہوئی تھی لیکن اُن آوازوں کا گلا گھونٹ دیا گیا؛اس کے بعد مکمل سکوت۔سیانے کہتے ہیں لوگ ٹارگٹ کلر سے ڈرنے لگے تھے۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہی ٹارگٹ کلر اپنے ہی گروہ کے ہاتھوں مارا گیا۔بہر حال گاڑی چلتی رہی۔عام گاڑیوں اور اس میں فرق یہ ہے کہ اُن کے بنانے والے کا نام معلوم نہیں ہوتا، مالک کا پتا ہوتا ہے کہ کون ہے۔اس گاڑی کے بنانے والے کا نام معلوم ہے مگر مالک کا پتا نہیں چلتا۔عام رویہ تو یہی ہے کہ جو ڈرائیونگ سیٹ پر چڑھ بیٹھا وہی مالک بن بیٹھتا ہے۔بدنصیبی یہ ہے کہ یہ گاڑی اکثر اوقات ان لوگوں کے استعمال میں رہی جو اناڑی تھے؛اس لیے بھٹک کر کبھی چھانگا مانگا اور کبھی مری کے پہاڑوں کی طرف نکل گئی؛ایک بار تو اس کا ایک حصہ ہی کٹ کر گیا تھا؛لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ڈرائیونگ سیٹ کا بھی عجیب مزاج ہے، ہے تو بہت خوب صورت، پرکشش اور آرام دہ لیکن ہر وقت جھولتی رہتی ہے، بادِ مخالف کے تھپیڑے اس پر مستزاد ہیں، جس کی وجہ سے خطرہ ڈرائیور کے سر پر منڈلاتا رہتا ہے، اس لیے بچاؤ کے لیے درجہ اول کے کئی ہاتھ اس کرسی کو تھامے رکھتے ہیں۔ یہ بہت مشکل کام ہے، اس لیے کرسی تھامنے والے پسینے میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن وہ اسے اذیت نہیں سمجھتے؛ کیونکہ اس کے عوض انھیں معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔کرسی تھامنے کا فریضہ بہت اہمیت کا حامل ہے؛اس لیے ہر کس و ناکس کو یہ فرض نہیں سونپا جا سکتا۔بعض سعادت مند ہی یہ بیڑہ اُٹھا سکتے ہیں۔ان سعادت مندوں میں بعض ایسے پارسا بھی شامل ہیں جنھیں دعویٰ ہے کہ وہ اگر دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ یہ پارسا ایک اضافی خدمت یہ بھی انجام دیتے ہیں کہ ڈرائیور کے حق میں ردِ بلا کے لیے چلہ کشی کرتے رہتے ہیں۔البتہ ایک بات ہے، یہ جو خشوع خضوع سے کرسی تھامے رکھتے ہیں، بڑے کمینے ہوتے ہیں۔وہ یوں کہ جب دیکھتے ہیں کہ کرسی زیادہ جھولنے لگی ہے اور اب اسے قائم رکھنا ناممکن ہے تو یہ اسی ڈرائیور کو باہر دھکا دے کر دوسرا ڈرائیور بٹھا دیتے ہیں اور اسی خشوع خضوع سے دوبارہ کرسی تھام لیتے ہیں اور اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ان کی جیب میں ہر قسم کا مواد موجود ہوتا ہے؛ جیسا ماحول دیکھتے ہیں اس کے مطابق موسیقی لگا دیتے ہیں۔ہم نے تو کئی بار یہ مضحکہ خیز منظر بھی دیکھا ہے کہ اگر گاڑی کا رکھوالا بھی لپک کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تو درجہ اول کے ان کمینوں نے یہ دیکھے بغیر کہ اسے ڈرائیونگ آتی ہے یا نہیں، بڑھ کر اس کی کرسی کو بھی تھام لیتے ہیں اور کہتے ہیں:" گاڑی تو صرف

آپ کو چلانا آتی ہے، پہلے جتنے ڈرائیور آئے انھوں نے تو گاڑی کا ستیاناس کر دیا ہے"۔

" کیا واقعی میں بہترین ڈرائیور ہوں؟"۔اُس نے حیرت سے اِن سے پوچھا۔

"بالکل جناب! دیکھیے نا! گاڑی کتنی تیزی سے منزل کی طرف جا رہی ہے"۔اس کے ساتھ ہی یہ سب لہک لہک کر اس کا قصیدہ گنگنانے لگے۔یہ بات درست تھی کہ گاڑی کی رفتار واقعی تیز ہوگئی تھی لیکن بہت دیر کے بعد معلوم ہوا کہ یہ غلط راستہ ہے اور غلط سمت میں بہت سا فاصلہ طے کر لیا گیا ہے۔جب اناڑی یہ کام کریں گے تو نتیجہ آیندہ بھی ایسا ہی نکلے گا۔اب یہ بات تو معلوم ہوگئی ہوگی کہ اس گاڑی نے کئی ڈرائیور بھگتے ہیں لیکن ایک قدر سب میں مشترک ہے، سب کمیشن خور ہیں۔جس جس پٹرول پمپ سے پٹرول لیتے ہیں، اس کا مالک انھیں کمیشن دیتا ہے، جو آپس میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ اگر کمیشن بند ہو جائے یا اس میں کمی بیشی ہو جائے تو یہ دوسرے پٹرول پمپ سے پٹرول لینا شروع کر دیتے ہیں۔پٹرول پمپ کے مالکان ان کے اس رویے سے خوب آگاہ ہیں، اس لیے جب تک اُنھیں اِن سے مطلب ہوتا ہے، اِنھیں باپ بنائے رکھتے ہیں لیکن جوں ہی اَن کو ان سے بہتر گاہک دستیاب ہوتا ہے وہ انھیں دفع دور کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ایک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ مالکان کمیشن کی رقم اپنی جیب سے تھوڑی دیتے ہیں، وہ انھیں گاڑی کے لیے ناقص تیل فراہم کرتے ہیں اور دام کھرے تیل کے وصول کر لیتے ہیں؛ اب ایسا بھی نہیں کہ ان ڈرائیوروں کو اس رویے کا علم نہیں، لیکن انھیں تو اپنے کمیشن سے غرض ہے گاڑی چلے نہ چلے اس سے انھیں کوئی علاقہ نہیں۔البتہ انھیں یہ اطمینان ہے کہ گاڑی خراب یا ناکارہ ہونے کی صورت میں وہ اسے اسی ویرانے میں چھوڑ کر جہاں جانا چاہیں آسانی سے جا سکتے ہیں۔مسئلہ نچلے درجے کے مسافروں کا ہے، وہ اس بات پر اکثر پریشان رہتے ہیں کہ اگر یہ گاڑی مستقل خراب ہوگئی تو وہ ہمیشہ چلتے رہیں گے اور ان کی منزل کبھی نہ آئے گی۔لیکن ان دنوں ایک بار پھر عجیب تماشا ہوا؛ درجہ اول میں مزے سے بیٹھے ہوئے لوگ پھر پریشان ہیں؛ کیونکہ اسی درجہ اول میں بیٹھا ہوا ایک شخص نچلے درجے کے مسافروں کو مخاطب کر کے پھر اسی طرح چیخ پکار کرنے لگا ہے، جس طرح پہلے ایک شخص نے کیا تھا اور ان لوگوں نے اسے ایک ٹارگٹ کلر کے ہاتھوں قتل کروا دیا تھا۔۔اس کی جان کو بھی خطرہ ہے۔

وہ نچلے درجے کے لوگوں سے مخاطب ہے:"انھیں پہچانو، یہی تمھارا خون پیتے ہیں۔ان سے اپنی محنت کا حساب لو"۔

اس کے ساتھ بھی جمِ غفیر ہے لیکن بعض لوگ اس لیے خوف زدہ ہیں کہ کہیں اس کے لیے بھی کسی ٹارگٹ کلر کا انتظام نہ کیا جا رہا ہو۔خوف تو جیسے ان سب کا مقدر ہو گیا ہے لیکن کیا کریں درجہ اول میں بیٹھے لوگوں کا چلن یہی ہے کہ جس کی آواز ان کی آواز سے بلند ہو جائے اس کی جان نوچ لی جاتی ہے۔

☆

اسد محمود خان

شام سے بھیجی گئی ایک اِی میل کا جواب

''نیو اِی میل رِیسیوڈ؛ وِیٹنگ فار رِیپلائی''

لیپ ٹاپ اسکرین کے بائیں اور اُوپری کنارے پر ''پوپ اَپ'' سرخ دائرے میں لکھا پیغام چیخ پڑا؛

پردۂ نمائش پر مرکوز آنکھوں کے سامنے دائیں اُوپری کنارے پر موجود ٹیمپلٹ کے خانے میں ایک طرف بھیجنے والے کے نام کے نیچے ''اَین اَوپن سورس اِی میل'' (An Open Source Email) کا ٹیک دیکھ کر ''اَوپن میسج'' کی آپشن پر کلیک کرنا بنتا تھا؛ اِی میل کی پہلی لائن میں اپنے آپ کو ننگا کرتے چند الفاظ کا بوسہ لینے جڑے لب ہائے کنار نے الفاظ کے لمس پر دَر آنے والے ایک بے مقصد مزے کے سامنے خُود کو بے قابو چھوڑ دیا تھا؛ اُنگلیاں لیپ ٹاپ اسکرین کے سامنے بچھے ''کی بورڈ'' کا اُتار چڑھاؤ میں اُلجھی سوچ کے سنگ تنہا رہ گئیں؛ پرکشش آنکھوں کے اشاروں پر معانقہ کرتے لب ہائے کنار الفاظ کی باہمی کروٹ میں آگے بڑھتے چلے گئے؛

''ڈیئر آل!!!

جانتی ہُوں آپ کے پاس وقت نہیں ہے.....

جبھی تو اپنا تعارف بھی نہیں کراتی؛ بس ''شام'' کو میرا تعارف اور واحد حوالہ جان کر چند لمحے مستعار کیجئے؛ جانتی ہُوں! نئے سال کا آغاز ہونے کو ہے اور آپ سب کو تحائف سے بھری تھیلیوں کی تقسیم بھی تو کرنا ہے؛ تھیلیوں میں بند خوشیوں کے دھماکوں کی گونج پُوری دُنیا میں سنائی بھی دیتی ہے اور منائی بھی جاتی ہے؛ ''نیویارک ٹائمز اسکوائر'' میں جمع ہونے والے لوگوں نے زمین کو چھپا لینے کی تیاریاں کرنی ہُوں گی؛ ''آک لینڈ سکائی ٹاور'' سے آسمان کو آنکڑے ڈالنے والی روشنیوں کی راسیں کسی جارہی ہُوں گی؛ ''بُرج خلیفہ'' سر کرنے کی تیاریاں کی جاچکی ہُوں گی؛ برلن کے ''برینڈنبرگ گیٹ'' کے پلّے نئی صبح کے استقبال کے لیے کھولے جارہے ہُوں گے؛ ماسکو میں سال بھر کے یک بارگی تحائف کی تقسیم کا اہتمام بھی کیا جارہا ہوگا؛ برازیل میں لمبی دوڑ کی آغاز لائن پر کھڑے لوگوں کو بڑھنے کا اشارہ دیا جانے والا ہوگا؛ چین میں رنگوں بھرے تارے اور جاپان میں سفید غباروں کو آسمان پر ٹکائے جانے کا انتظام کیا جاچکا ہوگا؛ لندن اور فرانس میں اُترنے والی تاریک شبوں کو روشن کرنے کا سوچا جارہا ہوگا؛ ''ویٹیکن سٹی'' میں اجتماعی دُعا کی تیاریاں بھی اپنے بامِ عروج کو پہنچ رہی ہوں گی اور ایران و عراق میں جائے نمازوں پر عبادتوں کی صورت بھی بنائی جارہی ہوگی؛

وقت کسی کا نہیں اور نہ ہی کسی کا ہو سکتا ہے؛

شام میں اُترنے والی گہری اور تاریک رات کا سفر کیوں نئے سال کی روشنی کے ساتھ ختم نہیں ہوتا؛ ایک پر ایک نیا سال آتا اور گزر جاتا جا رہا ہے لیکن نہ تو شب بھر کی تاریکی ختم ہونے پر آتی ہے اور نہ ہی نئی صبح کا اُجالا کوئی نوید لے کر آتا ہے؛ گزشتہ برس بھی سال کی آخری شب نے جس دَم نئے سال کی پہلی صبح کو گلے لگایا، اُس لمحے شام میں ٹھہرے قافلوں کی نوحہ گری گونج رہی تھی؛ جس لمحے ''نیویارک ٹائمز اسکوائر'' میں جمع ہونے والے لوگ زمین کو چھپا لینے کی تیاریاں میں اکھٹے ہو رہے تھے، ''حلب'' میں بکھرے اجسام سمیٹ کر زمین کی گود بھری جا رہی تھی؛ جب ''آک لینڈ سکائی ٹاور'' سے آسمان کو آنکڑے ڈالنے والی روشنیوں کی راسیں کھینچی جا رہی تھیں، ''دمشق'' میں اجتماعی جنازوں پر پھینکے جانے والے کفنوں کے کمر بند کسے جا رہے تھے؛ جس ساعت میں ''بُرج خلیفہ'' سر کرنے کی تیاریاں مکمل ہُوئیں، ''عفرین'' کو طاغوتی قوتیں سر کرتی گزر چکی تھیں؛ جو لمحے ماسکو میں سال بھر کے یک بارگی تحائف کی تقسیم کا اہتمام دیکھ رہے تھے، وہی ''السفیرہ'' پر یک بارگی حملے میں فتح و شکست کے عنوانوں کی بندر بانٹ بھی دیکھ رہے تھے؛ ایران و عراق میں بچھائے جانے والی جائے نمازوں اور ''ویٹیکن سٹی'' میں اجتماعی دُعاؤں کے وقت پُورے شام میں معصوموں کی اجتماعی قبروں کی تیاریاں بامِ عروج کو پہنچ چکی تھیں؛

سوچتی ہُوں شاید میرے پاس وقت نہیں ہوگا؛

بے شک وقت بڑا ہی ظالم ہے؛ لاکھ چاہ لیں مگر یُوں بے رُخی سے گزر جاتا ہے جیسے کبھی آشنا نہیں رہا؛ ملک شام کی ایک بڑی مشہور کہاوت ہے:

''***He who has his hand in the water is not like him who has his hand in the fire***''

جی ہاں! آگ میں جلتے ہُوئے ہاتھ کا احساس، پانی میں ڈوبے ہُوئے ہاتھ جیسا کبھی نہیں ہوتا؛ میں ہرگز ایسی خواہش نہیں رکھتی کہ آپ بھی جلتی ہُوئی آگ کے جاں گزیر احساس کے کرب سے لمحہ لمحہ گزریں؛ البتہ! اپنے احساس کے کرب پر آپ کے احساس کا پھاہا رکھنے کی خواہش میں وقت کا تنگ دامن جھنجھوڑ رہی ہُوں؛ میں جہاں بیٹھ کر اِی میل لکھ رہی ہُوں، وہاں پہنچنے اور لیپ ٹاپ تک رسائی میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا؛ کل کی بات لگتی ہے جب میں دروازے میں ہاتھ ہلاتی اپنی والدہ کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں انتظار کرتے بابا کی جانب بڑھی تھی؛

''بیٹی! اپنا خیال رکھنا!!!''

والدہ صبح سویرے جائے نماز سے اُٹھ کر پہلی دُعا میں یہی کہتی اور سکول کے لیے نکلتے لمحے تک دوہراتی رہتی؛ خاص کر جب سے ''حلب'' میں اکھٹے ہونے والے سر پھروں پر حکومتی لائسنس والی بندوقوں سے گولی داغی گئی اور

جواب میں بغاوتی ٹولوں کی گولیوں نے بے سمت نکلنا شروع کیا تو والدہ کی پریشانی کچھ بڑھ سی گئی تھی؛ اگرچہ ہمارا گھر دمشق کے مضافات میں کھڑے ایک بڑے تجارتی مرکز کے پہلو میں موجود اپارٹمنٹس میں تھا لیکن بڑھتے شور نے شہر شہر ایک بے چینی سی پھیلا دی تھی؛

''جی! فکر نہ کریں اور اجازت دیں''

میں چلتے چلتے ٹھہر گئی اور تب تک ٹھہری رہی جب تک والدہ نے آنکھ میں آ جانے والے پانی میں میرا عکس نہیں دیکھ لیا تھا؛ تب وہ دروازے میں کھڑے کھڑے مسکرائی اور سر کو ہلا کر میرے منجمند قدموں کی افسردگی ختم کرنے میں مدد فرمائی تھی؛

''جلدی کرو، دیر ہو رہی''

گاڑی کے اگلے دروازے سے جھانکتی والد کی آواز نے منجمند قدموں کی ختم ہوتی افسردگی میں تیزی بھر دی؛ میں نے ایک بار پھر ہاتھ ہلاتی والدہ کو خدا حافظ کہا اور دوڑتے قدموں کے ساتھ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے والد کے پہلو میں جمی اگلی سیٹ پر آن کر بیٹھ گئی؛ کالج گھر سے تیس منٹ اور والد کا دفتر مزید پندرہ منٹ کی دُوری پر تھا؛ والد مجھے کالج کے گیٹ پر چھوڑ کر اپنے دفتر جو حکومتی پٹوار خانہ تھا، میں دن بھر گزارتے اور واپسی پر مجھے گیٹ سے لے کر دروازے میں انتظار کا کشٹ کاٹتی والدہ کے پاس پہنچا دیتے تھے؛ آس پاس کے سبھی اپارٹمنس سے کئی اور لڑکے لڑکیاں بھی اِسی کالج میں آتے تھے اور جب کبھی ضرورت پڑتی ایک دوسرے کو سواری کی سہولت بھی پیش کر دیتے تھے؛ والد گاڑی لے کر آگے بڑھے تو میں نظروں سے اجھل ہوتی گاڑی کو دیکھتے گیٹ عبور کر چکی تھی جہاں زندگی سے بھرپور سہلیوں کی درمیان وقت کا احساس جاتا رہا؛

''جلدی کرو نکلو؛ پناہ میں آؤ؛ جہازوں نے بم گرائے ہیں''

آسمان کی سمت نکلنے والے جہازوں کی اچانک شور کے پیچھے دھماکوں کی آوازوں نے خوف جگایا تو ہر سمت چیخیں بھاگ رہی تھیں؛

''اللہ! اللہ!! اللہ اکبر!!!''

خوف میں جاگی چیخوں نے دوڑ لگائی تو خدا یاد آیا؛

شُوں؛ شُوں''

جہازوں نے کالج کی حد سے باہر جا کر چکر کاٹا اور واپسی پر پھر سے گرتی چھتوں کا طواف کیا؛

''دھم، دھم، دھاک!!!''

واپسی کے سفر میں برسائے جانے والے بموں نے زمین پر اُترتے ہی شور مچایا؛

''دھڑام، دھڑام''

دیواروں پر کھڑی چھتیں زمین پر اُترے بموں کے پیچھے پیچھے پہنچ گئیں؛

''جلدی، جلدی پناہ میں آؤ''

خوف سے جاگی چیخوں کے درمیان مداوے اور بلاوے کی کئی آوازیں بھی جاگ رہی تھیں؛

میں بھی پناہ کی تلاش میں دوڑنے والوں میں شامل بم دھماکوں سے گرتی دیواروں سے دُور نکلنے کی کوشش میں بھاگ رہی تھی؛ اچانک لگنے والی ٹھوکر نے اعصاب پر طاری خوف اور دوڑ میں اندھیرے بھرے تو چیخوں کی آوازیں آنا بھی چھوٹ گئیں؛ آنکھوں نے روشنی کو محسوس کیا تو بہت دیر گزر چکی تھی بلکہ سچی میں بہت دیر گزر چکی تھی؛ میں اپنے آس پاس سفید لبادوں والوں میں گھری پڑی تھی؛

''تم ٹھیک ہو!!!''

ایک سفید لبادے والے نے جس انداز میں پوچھا، اُس میں ایک مسیحا سے زیادہ کا تشکر جھلک رہا تھا؛

''جی!!!''

میں سمجھ نہ پائی کہ وہ مجھے بتا رہا ہے یا مجھ سے پوچھ رہا ہے؛

''بستر چھوڑو؛ ایک کریٹیکل پیشنٹ ہے؛ جلدی! جلدی!!''

سفید لبادے میں موجود ڈاکٹر نے دوبارہ کہا تو میں نے تیزی سے بستر چھوڑ دیا اور پاس دیوار کے سینے سے جا لگی؛ اگرچہ میرے سر میں اُٹھنے والی درد کی ٹیسیں باقی بدن کے درد سے قدرے ہلکی لیکن موجود ضرور تھیں؛ میں اپنے زخم اور درد کا حساب کرنے کا سوچ رہی تھی کہ سرخ چیتھڑوں میں ملبوس ایک نوجوان کو میرے والے بستر پر لٹا کر سفید لبادے والوں نے پردہ تان لیا؛ ''چیک بی پی''، ''مینٹین آئی وِی''، ''پری پیر فار سرجری'' جیسے یک مشت احکام نے اگلے چند لمحوں میں بستر کو نئے زخمی کے لیے خالی کروا دیا؛ وارڈ میں اور بھی بیڈ موجود تھے اور قریب سبھی پر ایسی ہی صورت کے احکام جاری تھے؛ میں کچھ سوچنے کے قابل ہُوئی تو وارڈ میں زخمیوں پر اُلجھے سفید لبادوں کو چھوڑ کر اکلوتے دروازے سے باہر نکل کر باہر راہداری میں آ گئی؛ راہداری کے ایک سرے پر آپریشن تھیٹر کا کھلتا بند ہوتا دروازہ شور مچا تا رہا جب کہ دوسرے سرے سے اندر داخل ہونے والے اسٹریچرز واویلا مچا رہے تھے؛ میں دیوار کی انگلی پکڑے دروازے سے باہر آئی تو پہلو سے نکلے ایک مضبوط ہاتھ نے تھام کر سامنے لان میں بیٹھے لوگوں کے ساتھ لا کر بٹھا دیا؛ یہاں بیٹھے سبھی نے جسم کے کسی نہ کسی حصّے کو سفید پٹی میں باندھ رکھا تھا البتہ اِن سب کی حالت اَندر رہ جانے والوں سے حد درجہ بہتر تھی؛ لان کے دوسرے کنارے پر بھی

سفید پٹیوں میں ملبوس بے سدھ زخمیوں کی قطاریں تھیں جو نہ تو شور مچا رہے تھے اور نہ ہی اپنے زخموں کا واویلا سنا رہے تھے؛

''تمہارا نام!!!''

سائیں سائیں کرتے کانوں پر دستک ہُوئی تو لہولہان منظر میں گم آنکھوں کے منظر جاگ گئے؛ میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص ہاتھ میں قلم کاغذ اُٹھائے کھڑا میرا نام پوچھ رہا تھا؛

''آمینا.....آمینا بنت فاتحی''

سر میں اُٹھنے والی درد کی ٹیسوں میں گم شناخت بھی لوٹ آئی؛

میرے سمیت باقی لوگوں سے بھی چند سوال پوچھ کر کاغذ پر دائرے بنائے گئے اور کچھ دیر میں ہمارے سامنے آ کر رکنے والی گاڑی میں بیٹھ کر گھر تک چھوڑنے کا پیغام سنا دیا گیا؛ گاڑی چلنے سے پہلے شناخت اور یاد مکمل طور پر لوٹ چکے تھے؛ میں نے کاغذ قلم سنبھالے ادھیڑ عمر شخص سے جہازوں کی بابت پُوچھا تو پتا چلا کہ دن بھر کی کئی پروازوں میں حکومتی عمارتوں کو نشانہ بنانے کی کوشش میں آس پاس کی عمارتیں اور علاقے بھی زد میں آ گئے ہیں جن میں مرنے والوں کی تعداد، زخمیوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے؛

''کیا حکومتی پٹوار کی بلڈنگ بھی!!!''

جہازوں کے نشانہ پر آنے والی حکومتی عمارات کا سن کر میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا؛

''ہاں! وہاں تو کوئی بھی نہیں بچا''

ادھیڑ عمر شخص نے لان کے دوسرے کنارے پر موجود سفید پٹیوں ملبوس بے سدھ زخمیوں کی قطاروں کی جانب دیکھ کر جواب دیا جو نہ تو شور مچا رہے تھے اور نہ ہی اپنے زخموں کا واویلا سنا رہے تھے؛

''کیا!!!''

میں اتنے زور سے چیخی جیسے پٹوار کے دفتر میں بیٹھے والد کو بلا رہی ہُوں؛

''ہاں! اُسی حدف میں تمہارا کالج اور قرب و جوار کے اپارٹمنٹس بھی رگیدے گئے ہیں؛ وہاں بھی جانیں گئیں البتہ زخمی زیادہ ہُوئے''

ادھیڑ عمر شخص بھی اپنے سینے پر رکھا بوجھ ہلکا کرنے بیٹھ گیا تھا؛

میں پاگلوں کے جیسے قطاروں میں بے سدھ لیٹے زخمیوں کی جانب دوڑی؛ دو چار قدم اُٹھائے اور اندھیرے میں جا اُتری؛ روشنی کا جھماکا ہُوا تو ایک بار پھر سفید لبادے والوں میں گھری بستر پر موجود تھی؛ اِس بار درد کی ٹیسوں میں والد کے زخموں سے چُور بدن کا خیال بھی حصّہ ڈال رہا تھا؛ ڈاکٹر کے کہنے سے پہلے ہی بستر چھوڑا اور ایک بار پھر سے بھاگتی ہُوئی

راہداری کے دائیں کنارے پر شور مچاتے دروازے سے باہر نکل کر لان میں پہنچ گئی؛ لان کے دسرے کنارے پر موجود قطاروں میں بے سدھ لیٹے زخمیوں کی جانب بھاگ پڑی؛ زخمیوں کو کفن پہنا دیے گئے تھے اور ایک ایک کر کے پاس کھڑے بڑے کارگو ٹرک پر بنا تابوت ڈالے جا رہے تھے؛ زخموں سے چُور بدن بے جان لاشے تھے جو صبح کی بمباری میں ایسے ٹوٹے کہ ٹکڑے سمیٹ کر تھیلیوں میں بھرے گئے تھے؛ مجھے یُوں آگے بڑھتا دیکھ کر وہی ادھیڑ عمر شخص کہیں سے سامنے آیا؛

''تم کسی کو ڈھونڈ رہی ہو!!!''

اُس نے کاغذ میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہُوئے پوچھا؛

''فاتحی!.....فاتحی بن صالح''

میں نے تیزی سے جواب دیا؛

''فاتحی بن صالح''

ادھیڑ عمر شخص نے کاغذ پر کچھ ڈھونڈنے کے لیے سر جھکایا؛

''حکومتی محکمہ پٹوار میں تھے!!!''

میں نے مزید وضاحت دی؛

''ڈیڈ! باڈی اَن کمپری ہنسیبل''

(مردہ! نا قابلِ شناخت!!!)

جھکا ہُوا سر یُوں اُٹھایا جیسے محکمہ پٹوار کے سبھی افراد کا ڈیٹا حفظ کیے بیٹھا ہو؛

''پٹوار کی بلڈنگ میں کوئی بھی نہیں بچا''

جھکے ہُوئے سر کو اُٹھانے کی توجیح نکال آئی؛

''ٹرک میں ڈالی جانے والی لاشیں نا قابلِ شناخت ہیں، انہیں اجتماعی قبر میں دفن کیا جائے گا''

ادھیڑ عمر شخص نے کاغذ بغل میں دباتے ہُوئے سارا معاملہ صاف بیان کر دیا تھا؛ میں بہت دیر تک قطاروں میں لیٹی لاشوں کو ٹرک میں جاتا دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ ابھی والد مجھے آواز دیں گے لیکن ٹرک بھر کر چلا گیا اور میں وہیں بے سدھ لاشوں والے گھاس پر جمے لہو میں انگلیاں ڈبوتی والد کی خوشبو کھوجتی رہی؛ میں یُوں ہی بیٹھی رہ جاتی جو وہی ادھیڑ عمر شخص مجھ سے گھر کا پتا پوچھ کر میری والدہ کی یاد نہ دلا دیتا؛ ایک بار پھر سے درد کی ٹیسیں جاگیں تو مجھے گھر لوٹنے کا خیال آیا؛ اب کی بار بھی وہی ادھیڑ عمر شخص مجھے ایک گاڑی میں بٹھا کر چلا گیا جو قابلِ رخصت زخمیوں کو گھروں تک پہنچانے کا انتظام

کیے کھڑی تھی؛ میں اپنے اپارٹمنٹ کی سڑک پر مڑی تو بائیں ہاتھ پر کالج کی تباہ شدہ بلڈنگ میری صبح کی یاد دھندلانے کی کوشش میں تھی؛ اپارٹمنٹس والے چوراہے پر بھی ایک بگڈر دیکھی اور صبح تک اپنے کندھوں پر سر اُٹھا کر کھڑی بلڈنگز کو گھٹنوں کے بل بیٹھے دیکھ کر دل بھی بیٹھ گیا؛ لوگوں کا شور، کچھ زخموں کا واویلا مچا رہے تھے اور کچھ میتوں کا رونا رو رہے تھے؛ ہر بلڈنگ سے کوئی نہ کوئی دوسروں کے کندھوں پر جھولتا سڑک کنارے بے سدھ لیٹ رہا تھا؛ میں گاڑی کے آہستہ ہوتے ہی گھر کی جانب دوڑی؛ کچھ نوجوانوں نے یُوں اندھا دھند دوڑتی زخمی لڑکی کا پیچھا بھی کیا لیکن اچانک جم جانے والے میرے قدموں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے؛ میں گھر کے سامنے ٹھیک اُسی جگہ کھڑی تھی جہاں صبح جاتے ہُوئے والدہ کو آخری بار دروازے میں ہاتھ ہلاتے دیکھا تھا؛

''بیٹی! اپنا خیال رکھنا!!!''

ٹُوٹے دروازے کے بیچ بے سدھ پڑی والدہ، آدھی دروازے کی ایک طرف اور آدھی دروازے کی دوسری جانب ہاتھ ہلاتے پُوچھ رہی تھی؛

''والدہ!!!''

میں پہلی بار ایک بھیانک چیخ مار کر دروازے کی جانب دوڑی اور بے سدھ پڑی والدہ کے بے جان بدن سے چپک گئی؛ میں والدہ سے چپکی رہ جاتی جو کچھ مضبوط ہاتھ مجھے کھینچ کر جدا نہ کر دیتے؛ میرا پیچھا کرتے نوجوانوں نے ہی مجھے والدہ سے الگ کیا اور بے جان لاشے کو دروازے کے بیچ سے نکال کر سڑک کنارے رکھے جانے والے بے شمار باقی لاشوں کے پہلو میں لٹا دیا؛ میں نیم مردہ، نیم بدحواسی کی حالت میں شام تک وہیں گھر کے سامنے جمع ہو جانے والے دیگر لوگوں کے ہمراہ موجود رہی؛ شام میں شام کی سرخی آنے سے پہلے سڑک کنارے پھیلی لہو رنگ سرخی کو ایک اجتماعی جنازے کی حجت کے بعد اجتماعی قبر میں رکھ کر مٹی ڈال دی گئی تھی؛ اِس دوران دو بار جہازوں نے اپنی موجودگی کی خبر دی اور سڑک کنارے رکھی جانے والی لاشوں میں اضافہ بھی کیا تھا؛ تھیلوں میں بند لاشوں کی اجتماعی قبریں ایک گھر کی صورت تھیں جہاں پُوری فیملی مل کر ایک ہی دائمی گھر میں رہنے کی تیاریاں کر رہی تھی؛

وہ رات بہت کالی اور لمبی تھی.....

غم کی گہری چیخیں شام کی چادر اَوڑھ کر لیٹیں تو صبح کا سورج سسکیاں لیتے لیتے اُٹھ بیٹھا؛ گزشتہ روز کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کام بھی پُورا نہیں ہُوا تھا کہ چنگھاڑتے جہاز اپنے پیٹ کا بوجھ گھٹانے پہنچ گئے؛ گری ہُوئی دیواروں کی اَوٹ نے نئی لاشوں کی تعداد میں کچھ کمی لائی لیکن ملبے کا ڈھیر بننے والی نئی عمارتوں نے کئی لاشوں کی قبر وہیں پر ہی بنا لی تھی؛ جس طرح جہازوں کے شور میں گرنے والے بموں نے گھر، گلی اور بازار کا پتہ نہیں معلوم کیا، اُسی طرح سے آسمان

چھُوتی بلڈنگز کے ملبے تلے دبی لاشیں بھی عمر و جنس کی تفریق سے بے نیاز مٹی کے کفن میں، اجتماعی قبروں پر بے نام کتبوں کی مستقل قیام گاہوں میں دفن کر دی جاتی ہیں؛ اگلے چند روز کی مسلسل بمباری نے زمینی حملے کی پیشین گوئی کی تو لوگوں نے خالی ہاتھ ہجرت کرنے کا قصد کیا؛ میں ہجرت کرتی تو کہاں جاتی؛ میں خیمہ بستی چلی آئی جہاں چند روز کی اجنبیت نے زخموں سے رِستے لہو کا رشتہ ڈھونڈ لیا؛

کیمپ میں بخشی جانے والی زندگی نے موت کے بدتر خیال کو جھٹک دیا تھا؛

یہاں زندگی کیمروں کی آنکھ سے دیکھی جاتی تھی؛ ہر روز ایک بڑی سی گاڑی کیمپ کے دروازے پر ٹھہر جاتی کچھ کیمروں والے لوگ گاڑی سے اُترنے والوں کے آگے پھیل جاتے اور بخشی جانے والی زندگی کو اپنے کیمروں کی آنکھ میں محفوظ کرتے جاتے؛ یہاں بہت سے بچے اپنی اپنی والدہ کو ڈھونڈ رہے تھے اور بہت سی والدہ اپنی گود میں رہ جانے والے لہو کو سنبھالے سنبھالے گھوم رہی تھیں؛ حیان کو والدہ کے بغیر سونے کی عادت نہیں تھی جبھی تو اُس نے زمین پر اپنی والدہ کی تصویر بنائی اور اُس کی گود میں اپنی ٹانگیں سکیڑ کر سو گیا؛ وہ نہ تو اپنی عادت بدل پایا اور نہ ہی اپنی والدہ کو بھول پایا ہے؛

''والدہ یاد آتی ہے''

میں سوال پوچھ کر خُود سے آنکھ ملانا بھول گئی؛

''نہیں!!!''

اُس نے ہنستے ہُوئے جواب دیا اور ہنسی ہنسی میں آ جانے والی یاد کی چیخوں کو چھپانا بھول گیا؛ اُس کی آنسوؤں والی ہنسی کے ساتھ جھوٹ بولنے کی یہ پہلی کوشش تھی؛ ہم دونوں ایک دوسرے سے منہ چھپائے اپنی اپنی والدہ کو بھولنے کی کوشش میں دُور نکل گئے؛ جہاں پر گرنے والے بموں کی چندھیا دینے والی چمک میں دونوں اپنی اپنی آنکھیں کھولنا بھول چکے تو ایک لمبی خاموشی نے شام کے بعد کی روشنی پر دستک دے کر اگلے پل میں دھکیل دیا؛

کیمپ کے باہر کا مسئلہ تو آپ سب جانتے ہیں؛

آپ ہی تو ہیں جو ساری دنیا کے مسئلوں کا حل تلاش کرتے ہیں؛ معاف کیجئے گا! یُوں کہوں تو بُرا نہ مان جائیں کہ جن مسئلوں کو آپ بنا لیتے ہیں اُنہی کا حل تلاش کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں؛ بغاوتی ٹولوں کی آواز کون بنا اور کس نے کس کے مفاد پر شام میں گہری رات اُتاری، یہ آپ لوگوں سے بہتر کون جان سکتا ہے؛ کہیں بھول رہے ہوں تو یاد دہانی کے لیے بتا دوں کہ یہ انقلابِ عرب کے نام پر جمہوری و غیر جمہوری یا حکومتی اور غیر حکومتی معاملہ نہیں رہا ہے؛ روس کے جنگی جہاز بشار الاسد حکومت بچانے نہیں آتے بلکہ اپنی ''میڈیٹرینین نیول بیس'' کی حفاظت کی ذمہ داری پُوری کرنے آتے ہیں؛

''اِس لڑائی کا کیا نام ہوگا!!!''

میں اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی؛

''جیت ہار کا معیار کیا ہوگا!!!''

آپ لوگ ہی بتا دیں؛

ایک طرف حکومت روس، ایران، حزب اللہ اور شیعہ مسلم لڑاکوں جنھیں ایران، عراق، افغانستان اور یمن سے بھرتی کیا جاتا ہے، کے ساتھ اپنی حکومت بچانے اور مستحکم کرنے کی کوشش میں بالاتفریق لاشوں کے انبار لگا رہی ہے؛ دوسری طرف حکومت مخالف اور آزاد ریاستی لڑاکے، ترکی، گلف ممالک اور امریکی معاملات کے ساتھ اجتماعی قبروں پر مٹی ڈال رہے ہیں؛ تصویر کا تیسرا رُخ خلافت کے دعوے دار آئی ایس آئی ایس والے ہیں جو مذہب کے نام پر لادینیت اور لاقانونیت کا جھنڈا اُٹھائے بچوں، عورتوں اور کمزوروں کو ذبح کیے جاتے ہیں؛ یہ بھی نہیں! یہاں ایک چوتھی قوت بھی اپنے مقاصد کے لیے خون و آگ کے دریاؤں سے گزرنے کو تیار کھڑی ہے؛ جی ہاں! کردوں کی منطق سب سے الگ ہے جو نہ حکومت کے ساتھ ہیں اور نہ ہی حکومت مخالف معاملات میں شامل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو اپنی آزاد و خودمختار ریاست کا قیام مانگ رہے ہیں؛ یہاں بھی ترکی ساتھ کھڑا اپنی ملکی سرحد پر کردوں کی مضبوط ہو جانے والی تحریک کو دبانے کی خاطر ساتھ کھڑا ہے؛ یہ سب وہ باتیں ہیں جو آپ جانتے ہیں لیکن بول نہیں سکتے۔

کیمپ کے اندر کا مسئلہ سب کو جاننے کی ضرورت ہے؛

یہاں پر روز صبح سویرے کوئی ایک این جی او آجاتی ہے اور بچوں میں کھلونے اور ٹافیاں تقسیم کرتی ہے لیکن نہ حیان کی والدہ واپس لاتی ہے اور نہ ہی اُسے والدہ کے پاس پہنچاتی ہے؛ اجتماعی قبروں میں دفن لاشوں کی پہچان کہاں باقی رہتی ہے؛ یہاں تو دُعا بھی اندازے سے بھیجی جاتی ہے؛ کیا پتہ تھیلیوں میں ٹکڑے سمیٹتے وقت بہت سی آلائشیں تو ملبے سے چپک کر رہ گئی ہوں گی جنہیں بچ جانے والے گلی کے مردہ خور جانوروں نے اپنا حق سمجھ کر کھا لیا ہوگا؛ یہاں تک پہنچے بچے، بس بچے کچے ہی ہیں جنہیں نہ تو سرحدوں سے پار جانے کی توفیق ملی اور نہ ہی اپنوں کی کوئی ایک لاش کہ جس کی قبر پر بیٹھ کر حالات کا نوحہ پیٹتے؛ اچھے گھروں کی اولاد یہاں پر ایک بھکاری بننا سیکھ رہی ہے؛ جدید ''گیجٹری'' پر لفظوں کی پہچان سیکھنے والوں کی یادداشت سلیٹ پر فقط ایک سیاہ رنگ باقی ہے؛ زندگی کی مسکراہٹوں سے بھرپُور چہروں نے یہاں کیمروں کی آنکھ کے سامنے مسکرانے کا ہنر سیکھ لیا ہے؛ اب یہ کام سمجھ کر مسکراتے ہیں جس کی اُجرت میں ٹافیوں کے پیکٹ، چابی والے کھلونے اور کھانے کو نان ملتے ہیں؛ یہاں بڑے بھی کیا بچوں سے کچھ کم ہیں؛ یہی سب حرکتیں انہیں بھی دن کی مزدوری پر اُجرت کا حق دار بناتی ہیں؛ اُن کی اُجرت کچھ کم بھی نہیں؛ ایسا کون بچا جس کی خاطر جمع پونجی بچانی پڑ جائے گی؛

میں آپ سے وقت کی بھیک نہیں؛ وقت کا احساس مانگ رہی ہُوں.....

آپ لوگوں کی سوچ ظالم ہوسکتی ہے لیکن دل بہت حساس ہیں؛ میں جانتی ہُوں یہاں انسانوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا ہے لیکن آپ تو جانوروں کے لیے انسانوں سے بھی زیادہ درد رکھتے ہیں ناں!؛ تاریخ گواہ ہے کہ آج تک جتنی درندگی انسانوں نے انسانوں کے ساتھ برتی، اتنی جانوروں نے بھی نہیں برتی ہے لیکن جتنی کوششیں کتوں کے بچوں کو زندگی دینے کے لیے کی جا چکی ہیں، اُس سے کم تر میں انسانوں کے بچوں کو یتیم ہونے سے بچانے کے لیے کی جاتیں تو آج پُوری دُنیا میں اجتماعی قبروں پر اندازۃً مانگی گئی دُعاؤں کا معاملہ درپیش نہیں ہوتا؛ میں ایک امید کے ساتھ آپ کا احساس مانگ رہی ہُوں؛ جانتی ہُوں ابھی کچھ روز پہلے ہی تو آپ نے نیپال کی گلیوں میں نچائی جانے والی ریچھنی رقاصہ کے پیروں سے گھنگرو کھولے، ناک میں پڑی نتھلی توڑی اور آزاد کرا کر ''جوالاخیل'' (*Jawalakhel*) کے چڑیا گھر پہنچایا، جہاں چند روز کی بے قدری نے اُسے زندگی کی بندش سے آزاد کرا دیا؛ ایسے حساس لوگ کیوں کر برہنہ نوجوان لڑکیوں کو نجی محفلوں کی رقاصہ بننے دیں گے؛ مجھے خبر ہے، امریکی عدالت میں لیبارٹری میں استعمال کیے جانوروں پر کیس چل رہا ہے، ''مایُون والکینو'' میں حاملہ سورنیوں کے بچوں کو پیدائش سے پہلے ہی مرنے سے بچا لیا گیا ہے، جرمنی جانوروں کو حقوق مہیا کرنے والا پہلا یورپی ملک بن چکا ہے، نیوزی لینڈ اور سوئٹزرلینڈ نے تو جانوروں کی خاطر اپنے اپنے قانون تک بدل لیے ہیں؛

ڈیئر آل!!!

یہ بھی جانتی ہُوں جو لوگ ''گلوبل گھوسٹ گیئر اِنیشیئٹو'' (*Global Ghost Gear Initiative*) لے کر سمندری جانوروں کو ناگہانی موت سے بچانے کی کوشش میں ہوں، بھلا کیونکر ہجرت کرتے انسانوں کو بے رحم لہروں میں جانے دیں گے؛ مانتی ہُوں ساحلِ سمندر کی ریت کو والدہ کی چھاتی جان کر گلے لگا کر سوئے ''آلان'' کی آنکھ کھلی تو اپنی والدہ کی گود میں ہوگا لیکن شاید وقت اور مقام یہ نہیں ہوگا؛ معذرت خواہ ہُوں، وقت لیا لیکن آپ کے ''اِن بکس'' میں پہنچی میری اِی میل جواب لے آئی تو احساس بھی بچ جائے گا۔ آمینا بنت فاتحی''

پردۂ نمائش پر مرکوز آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو ننگا کرتے الفاظ کا رقص ختم ہُوا تو لیپ ٹاپ اسکرین کے بائیں اور اُوپری کنارے پر ''پوپ اَپ'' سرخ دائرے میں ''نیو اِی میل رِیسیوڈ؛ وِیٹنگ فار رِیپلائی'' کا میسج چیخ رہا تھا؛ اس کی بورڈ پر سوچتی انگلیوں نے ٹچ پیڈ کی رائٹ کلک آپشن پر اِی میل کو ''تھریش'' میں ڈال کر ''رِی فریش'' کا بٹن دبا دیا۔

☆.....☆.....☆

توصیف تبسم

غزل

بچپن اور لڑکپن گزرا ، گزرا دور جوانی کا
بند گلی میں شام ہوئی ہے ، یہ ہے انت کہانی کا
دل کی آگ زباں تک آئی، یوں بھی لذت یاب رہے
آنکھ کھلی تو گزر چُکا تھا ، موسم نوحہ خوانی کا
سب ہنستے ہیں، دیکھ کے اُن کو ہم بھی ہنسنے لگتے ہیں
حال کسی کو کیا سمجھائیں ، اندر کی ویرانی کا
دیکھو تیز ہوا نے کیسے ، سبزہ و گل پامال کیے
کوئی تو ہو جو بڑھ کے روکے ، رستہ اس دیوانی کا
رقص کناں تھے، موسمِ گل میں سب ہی تال پہ پتّوں کی
ایک اکیلا دل ہے اپنا ، ساتھی برگِ خزانی کا
داتا! صبح و شام ملے ، اِک حرفِ ثنا خوشبو جیسا
کھلتا پھول چنبیلی کا ، پھر جھونکا رات کی رانی کا

☆

امین راحت چغتائی

غزل

میں کہ ہم سر نہ تھا مہر و مہتاب کا
پھر بھی عنواں رہا تیرے ہر باب کا

ہر گھڑی زخمِ دل کی طرف دھیان ہے
کتنا ممنون ہوں اپنے احباب کا

واعظِ دیں کی تقریر خواب آفریں
اور اُس میں مزہ بادۂ ناب کا

اُس نے دیکھا نہیں ، میں نے پوچھا نہیں
دخل یوں ہو گیا اِس میں اسباب کا

یوں جو سوچو تو یہ بھی ہے ضعفِ بصر
جاگتی آنکھ سے دیکھنا خواب کا

خود سے پوچھو جواب اس کا مل جائے گا
ہے سبب کوئی تو چشمِ پُرآب کا

ذکر راحتؔ کا ، وہ بھی بھری بزم میں!
کیا مقدر ہے اس جنسِ نایاب کا

☆

خورشید رضوی

غزل

چادرِ ابر میں سورج کو چھپانے کے لیے
وہ پسِ پردہ بھی بیٹھے نظر آنے کے لیے

میں کئی بار خفا ہو کے چمن سے اُٹھّا
پھر کوئی گُل نکل آتا ہے بُلانے کے لیے

دل کچھ ایسا تری مہکار میں ڈوبا ہوا تھا
بوئے گُل آئی مجھے ہاتھ لگانے کے لیے

جانے اس جلوہ گہِ ہست میں آئے کیوں ہیں
ہم کہ خود اپنے لیے ہیں نہ زمانے کے لیے

اُن کے دل میں ہے بہت دردِ نہاں کی دولت
جن کے سینے پہ نہیں داغ دکھانے کے لیے

اُسے ہر طور مرے دل کو لہو کرنا تھا
موسمِ گُل کو رکھا ایک بہانے کے لیے

☆

صابر ظفر

غزلیں

(۱)

ہر پل کسی امتحاں سے گزرا
گزرا جو یہاں سے ، جاں سے گزرا
ہر رُت ہی بغاوتوں کی رُت تھی
میں موسمِ خوں فشاں سے گزرا
لاشوں سے گزر رہے تھے لشکر
میں زندہ جہاں جہاں سے گزرا
ماضی سے گزر کے سوچتا ہوں
کیوں عرصۂ رائیگاں سے گزرا
سُنتا ہوں گزر گیا زمانہ
معلوم نہیں کہاں سے گزرا
ٹھہرا مرا بے وجود ہونا
میں خاکِ گزشتگاں سے گزرا
تم جانے کہاں چلے گئے تھے
جس روز ظفؔر یہاں سے گزرا

(۲)

نظارگی بھی نینوں کے زینوں کو منع ہے
دیکھیں وہ بام ، خاک نشینوں کو منع ہے
لکھا ہوا ہے اُن کے مقدر میں ڈوبنا
ساحل کا حال پوچھیں سفینوں کو منع ہے

اِک دوسرے کی دھڑکنیں گننے کی آرزو
سُنتے ہیں ، دو دُکھے ہوئے سینوں کو منع ہے
تقدیر جن کی پوروں سے ہوتی ہے رونما
اُن انگلیوں سے مَس ہوں ، نگینوں کو منع ہے
دیوار و در سے جس کے، قفس کا گمان ہو
ایسے مکاں میں رہنا مکینوں کو منع ہے
ہجرت کی بات اور ہے ، ہجرت تو ہو چکی
سیرِ چمن پناہ گزینوں کو منع ہے
چھوڑ آئیں اپنا سر ہی سرِ دار اے ظفؔر
سجدہ اگر ہماری جبینوں کو منع ہے

(۳)

ایسا نہیں کہ موت کا میلہ نہیں لگا
اس دشت میں دوبارہ وہ خیمہ نہیں لگا
اس تیر کو کبھی نہیں سمجھا تمھارا تیر
جب تک وہ میرے سینے سے خود آ نہیں لگا
حالاں کہ بے کنار نہیں تھا وہ دشتِ عشق
لیکن کسی کنارے بھی پیاسا نہیں لگا
دیکھی نہیں ہے بارشِ خوں کس نگاہ نے
کس کا وجود ہے ، جسے نیزہ نہیں لگا
جو سانس لے رہا تھا شہیدوں کے بعد بھی
وہ عمر بھر کسی کو بھی زندہ نہیں لگا
اِک واقعہ ہے اور بہت دردناک ہے
تم نے بھُلا دیا ، مجھے اچھا نہیں لگا

دل ڈوبتا رہا مرا ، کس کس خیال میں
جب تک وہ شخص یار ظفؔر جا نہیں لگا

(۴)

کوئی نماز نہ تھی ، جب وضو کیا نہ گیا
مگر لبوں سے وہ بوسے کا ذائقہ نہ گیا

تلاشِ یار میں ہم بے نیازِ دیر و حرم
گئے اُدھر بھی جدھر کوئی راستہ نہ گیا

اثاثہ جاتِ دل و جاں کا کچھ حساب نہیں
لُٹا تو کیا گیا اسباب اور کیا نہ گیا

اکیلے سانس بھی لینا نہ تھا گوارہ مجھے
میں دم بہ خود رہا ، جب تک وہ دل میں آ نہ گیا

میں جا رہا تھا بہت دُور اُس کی خلوت سے
مگر جو اُس نے کہا تھا مجھے ، نہ جا ، نہ گیا

بنا گئی مجھے پتھر شکستگی دل کی
وہ روز روز کا اُس در پہ آنا جانا گیا

چلا بھی جاتا تھا میں خواب گاہ میں اُس کی
پھر اتنی گردشیں آئیں کہ وہ زمانہ گیا

نہ پوچھ آمد و رفتِ خیالِ نا محرم
کہ آیا آیا ، نہ آیا ، گیا گیا ، نہ گیا

اسی لیے تو ظفؔر عاقبت کی فکر نہ تھی
ہمارے دل سے وہ غافل شدہ خدا نہ گیا

☆

غلام حسین ساجد

غزلیں

(۱)

صاحبِ عالمِ ایجاد کہاں رہ گئے ہیں
جن کو آنا تھا مرے بعد کہاں رہ گئے ہیں

کبھی خود سے کبھی آئینے سے خوف آتا ہے
ہم کہ آزاد تھے ، آزاد کہاں رہ گئے ہیں

دندناتی ہوئی پھرتی ہے صبا گلیوں میں
جانے وہ غیرتِ شمشاد کہاں رہ گئے ہیں

گھاس اُگنے لگی ہر سمت گلی کوچوں میں
اب مرے شہر بھی آباد کہاں رہ گئے ہیں

ہُو کا عالم ہے سرِ عالمِ امکانِ طلب
یہ نئے دور کے فرہاد کہاں رہ گئے ہیں

ضعفِ نسیاں ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
یاد کیا آئیں کہ وہ یاد کہاں رہ گئے ہیں

وحشتِ دل کا تلاطم نہ کہیں رقصِ جنوں
وہ جو تھے در پئے افتاد کہاں رہ گئے ہیں

پوچھتے رہتے ہیں لاہور کے باسی مجھ سے
طالبِ بصرہ و بغداد کہاں رہ گئے ہیں

(۲)

خواب اچھے ہیں نہ خوابوں کا بیاں اچھا ہے
جو بھی اچھا ہے ، حقیقت میں کہاں اچھا ہے

آگ احساسِ تحفظ بھی دِیا کرتی ہے
گھر کے چولھے سے جو اُٹھتا ہے دھواں ، اچھا ہے
دل کوئی باغ نہیں ہے کہ فقط گھوم آئیں
کوئی تادیر مکیں ہو تو مکاں اچھا ہے
بات کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
چُپ ہی اچھی ہے نہ یہ زورِ بیاں اچھا ہے
ایک سے لوگ ہیں دیوار کے دونوں جانب
کوئی اچھا ہے یہاں ، کوئی وہاں اچھا ہے
میری تنہائی کا آزاد بڑھا دیتا ہے
اُس کے موجود نہ ہونے کا گماں اچھا ہے
مجھ کو شرمندہ کیا میری غلط فہمی نے
میں سمجھتا تھا کہ یہ دورِ زماں اچھا ہے
ہجر کا لطف اُٹھا کر یہی جانا ساجدؔ
راحتِ وصل کا ہوتا ہے زیاں ، اچھا ہے

☆

سعود عثمانی

غزل

یہ وہم وہ ہے جو ہر آدمی کا ہوتا ہے
وگرنہ کون جہاں میں کسی کا ہوتا ہے

وہ راستہ ہو محبت کا یا سیاحت کا
ٹھکانے والا سفر واپسی کا ہوتا ہے

بڑا کمال ہے خود کو سنبھال کر رکھنا
مگر جو ذائقہ آوارگی کا ہوتا ہے

عجب تو یہ ہے کہ تُو میری جان ہے لیکن
گمان تُجھ پہ کسی اجنبی کا ہوتا ہے

سبھی کو دوست بنانا منافقت ہے سعؔود
کسی کا ہوتا نہیں جو سبھی کا ہوتا ہے

☆

نسیم عباسی

غزلیں

(۱)

مانندِ حبسِ کوچہ و بازار میں ہی تھا
بولی لگی تو اپنا خریدار میں ہی تھا

مجھ سے نہ جانے آپ کو تکلیف کیا ہوئی
اپنے لیے تو باعثِ آزار میں ہی تھا

وہ داستان ختم ہوئی تو پتا چلا
اس داستاں کا مرکزی کردار میں ہی تھا

ان بستیوں میں گھومتی پھرتی تھی زندگی
اس دائرے میں صورتِ پُرکار میں ہی تھا

میں برگِ خشک تھا وہ مجھے ساتھ لے گئی
پاگل ہوا پہ پیڑ کو درکار میں ہی تھا

الزام اور کس کو دوں اپنی شکست کا
اپنے خلاف برسرِ پیکار میں ہی تھا

ریلیز میرے دم سے ہوئی زندگی کی فلم
پردے پہ عمر بھر کا ادکار میں ہی تھا

وہ گر پڑی تو مجھ پہ ہی ملبہ گرا نسیم
اُس وقت زیرِ سایۂ دیوار میں ہی تھا

(۲)

اُس کی پہچان کا ضامن ہے جدھر جاتا ہے
پیڑ کے نام سے منسوب ثمر جاتا ہے

مجھ میں روپوش ہے روٹھا ہوا بچّہ کوئی
جو کسی اور کی تاکید پہ گھر جاتا ہے
جوڑا جوڑا نظر آتے ہیں پرندے کچھ دن
کس کو معلوم ہے پھر کون کدھر جاتا ہے
میں نے دیکھا ہے بڑے شوق سے چھو کر اُس کو
رنگ تتلی کے پروں کا بھی اُتر جاتا ہے
حسبِ مقدور ہی ہوتی ہے رسائی اُس تک
پا بہ زنجیر کوئی خاک بہ سر جاتا ہے
ضربِ احساس سے ہو جاتا ہے ریزہ ریزہ
اپنی نظروں سے جو گر جائے بکھر جاتا ہے
نام دیتا ہے نسیم اُس کو خدا خوفی کا
آدمی اپنی کسی بات سے ڈر جاتا ہے

☆

ضیاالحسن

غزلیں

(۱)

بُجھا ہوا ہے کسی ہوا سے چراغ میرا
بھرا ہوا ہے مرے لہو سے ایاغ میرا
دہک رہے ہیں تمھارے رنگوں سے پھول سارے
مہک رہا ہے تمھاری خوشبو سے باغ میرا
عجیب شور و شغب نے گھیرا ہوا ہے مجھ کو
یہ کن صداؤں سے گونجتا ہے دماغ میرا
یہاں وہاں مجھ کو ڈھونڈتے ہو عبث عزیزو!
ملے گا میرے ہی نقشِ پا سے سُراغ میرا
اسی سمندر میں ڈوب جاؤں گا ایک دن میں
تمھاری وسعت سے جا ملے گا فراغ میرا
دلوں سے دھوئے گا نفرتوں کے یہ رنگ سارے
جسے جسے راس آئے گا اصطباغ میرا
میں سانس لیتا ہوں داستانوں کی سرزمیں پر
وہیں کہیں سے تمھیں ملے گا سُراغ میرا

(۲)

کہیں کہیں سے ادھورا کہیں کہیں پُورا
خبر نہیں ہے کہ پُورا ہوں یا نہیں پُورا
اُتر رہی ہیں بلائیں ان آسمانوں سے
مرا خسارہ کرے گی مری زمیں پُورا
ابھی تو کارِ جہاں سے نہیں ملی فرصت

کبھی تو سجدہ کرے گی مری جبیں پُورا
تلاش کرنے سے آخر میں مِل ہی جاؤں گا
پڑا ہوا ہوں میں اے جاں! یہیں کہیں پُورا
ابھی تو اس کی محبت کے اوّلیں دن ہیں
ابھی سے کیسے ملے گا وہ مہ جبیں پُورا
دل و بدن کی کشاکش سے ہو گیا ہوں نڈھال
نہ میری دُنیا ہی پوری نہ میرا دیں پُورا
زیادہ ہوتا ہوں اپنی کسی کمی میں ضیاؔ
میں آ کے ہوتا ہوں آخر ترے قریں پُورا

(۳)

کہیں کہیں سے تو لگتا رہا کہیں ہوں میں
خبر نہیں کہ کہاں ہوں ، کہاں نہیں ہوں میں
کبھی کبھی مرا سجدے سے سر نہیں اُٹھتا
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے بس جبیں ہوں میں
یہ کس کی چشم چھلکتی ہے رات بھر مجھ پر
یہ کس کی اوس میں ڈوبی ہوئی زمیں ہوں میں
کسی خیال سے پیدا ہوا وجود مرا
کسی گمان سے نکلا ہوا یقیں ہوں میں
ابھی تو باندھ رہا ہوں میں اپنا رختِ سفر
ابھی یہیں ہوں مری جاں! ابھی یہیں ہوں میں
نہ ساتھ چل کہ مرے تیرے راستے ہیں الگ
نہ راہ روک مری ، بادِ واپسیں ہوں میں
پگھل رہا تھا ترے حسن کی تپش سے جہاں
نگاہ کر کہ پڑا رہ گیا وہیں ہوں میں

(۴)

بہت پسند تھا اِک باغِ داستاں مجھ کو
زمیں پہ بھیج دیا اُس نے ناگہاں مجھ کو
میں سُن رہا ہوں بڑے غور سے زمانے کو
سُنا رہا ہے زمانہ کہانیاں مجھ کو
کیے ہیں اُس نے ودیعت سراب وخواب وعذاب
دکھا رہا ہے وہ اپنی نشانیاں مجھ کو
میں بھول جاؤں گا ہر بات بھولنے والے
رہیں گی یاد تری مہربانیاں مجھ کو
زمین ہو گئی اوجھل مری نگاہوں سے
دکھائی دیتا ہے ہر سمت آسماں مجھ کو
تمام عمر گزاری ہے میں نے رخت بہ دوش
قیام کرنا ہے آخر کہاں کہاں مجھ کو
اُڑائے پھرتی ہے ہر سُو ہوائے شوق مجھے
سو دیکھتے ہو عزیزو! یہاں وہاں مجھ کو
میں جتنا دُور بھی جاؤں ترے قریب ہوں میں
تری طرف سے رہیں خوش گمانیاں مجھ کو

(۵)

کام کرنا ہے کوئی کام نہ کرنے جیسا
یعنی جینا ہے ترے ہجر میں مرنے جیسا
پھر کسی اور مسرت کی طلب ہی کیا ہو
جب مقدر ہو ترے دل سے اُترنے جیسا

میں بھی خوش ہوں کہ کوئی اُس سے تعلق تو ہوا
اُس نے باندھا کوئی پیمان مُکرنے جیسا
کر دیا اُس نے محبت سے لبالب مجھ کو
مجھ میں گرتا ہے ہمیشہ کسی جھرنے جیسا
جان جاتی ہے وہ آغوش میں جب آتی ہے
میری بانہوں میں سمٹتی ہے بکھرنے جیسا
میرے باہر ہے دہکتی ہوئی دہشت کی فضا
میرے اندر کوئی موسم سے ٹھٹھرنے جیسا

☆

شاہین عباس

غزلیں

(۱)

دائروں جیسا کوئی اور داستاں ایسا کوئی
پہلے تم ایسے تھے لیکن اب کہاں ایسا کوئی

تم زمانوں بعد جانے کس سے ملنے آئے ہو !
اِس جگہ رہتا نہیں اب آسماں ایسا کوئی

دھول بڑھتی دیکھیے اور لوگ گھٹتے دیکھیے
کارواں سے مل رہا ہے کارواں ایسا کوئی

میں گرا تیری طرف اور تو گرا میری طرف
اک ستارہ آ پڑا تھا درمیاں ایسا کوئی

میرے آنے جانے سے بستی میں کیا تشویش ہے
واقعہ گزرا ہے پہلے بھی یہاں ایسا کوئی ؟

جیسے لا سکتے ہو صحرا میں سے دُنیا چھان کر
لامکاں میں جاؤ اور لاؤ مکاں ایسا کوئی

(۲)

ہماری آنکھ میں اک تِل پرانا رہ گیا ہے
تجھے لگتا نہیں کیا ، تیرا آنا رہ گیا ہے ؟

کماں داروں کا جشن اُس رات تو بنتا نہیں تھا
میں کہتا رہ گیا ، میرا نشانہ رہ گیا ہے

وہ روزانہ کا اک پردہ اٹھاتا اندر آتا
اور آج آیا ہے تو پردہ اٹھانا رہ گیا ہے
یہیں ٹھہرو میں پھر آتا ہوں اپنی شام لے کر
کنارہ ڈوبتے دن کا دکھانا رہ گیا ہے
سروں پر اڑتی پھرتی خاک اور پھر خاک پر خاک
یہ وہ مٹی ہے جس سے گھر بنانا رہ گیا ہے
سڑک پر پھول اک آیا پڑا ہے اور مسافر
کئی ایسے ہیں جن کا آنا جانا رہ گیا ہے

(۳)

ہمہ رفتار ہو گیا تو کیا
تیر تھا ، پار ہو گیا تو کیا !
ابھی ہنس کر دکھانا باقی ہے
گریہ بے کار ہو گیا تو کیا
آسماں کر رہا تھا نقل مجھے
اور گرفتار ہو گیا تو کیا
اچھا آوازہ تھا سو تھوڑی دیر
شہر ، بازار ہو گیا تو کیا
خاک تیار دیکھ کر سرِ خاک
میں بھی تیار ہو گیا تو کیا
یہ خرابہ خدا ہوا اور پھر
خلقت آثار ہو گیا تو کیا

کچھ گمانوں کی سیر تو کر لی
میں گنہ گار ہو گیا تو کیا

(۴)

یہ خرابہ خبر کا لگتا ہے
قفل اِس پہ بھی گھر کا لگتا ہے
اے غبارِ نظر، چل آ مرے ساتھ
تو بھی اِس رہ گزر کا لگتا ہے
آسماں ، آسماں! زمین ، زمین!
یہ شکاری کدھر کا لگتا ہے
در بہ در دن کو دُور سے دیکھو
دُور سے اپنے گھر کا لگتا ہے
لوح آباد ، آدمی آزاد
زخم ہے اور سر کا لگتا ہے

☆

ظہور چوہان

غزلیں

(۱)

بیچ میں دیوار ہے اور زندگی دونوں طرف
یعنی اِک جلتے دیے کی روشنی دونوں طرف

میں نے اپنی ذات مضبوطی سے رکھی تھام کر
جسم کی دیوار جب گرنے لگی دونوں طرف

دل کے ٹکڑے اپنی مرضی سے کیے ہیں دوستو!
کیسے رہ سکتی ہے قائم اب خوشی دونوں طرف

ہے یہ دستورِ زمانہ اور یہی طرزِ حیات
اِک ہنسی دونوں طرف، اِک بے بسی دونوں طرف

ایک سے دو ہو گئے گھر لیکن اس کے باوجود
ایک ہی تصویر کمرے میں لگی دونوں طرف

پھر سمجھ آئی کہ میں دونوں طرف موجود ہوں
اپنی ہی آواز جب میں نے سُنی دونوں طرف

اپنے ہاتھوں سے اُسے تقسیم کر ڈالا ظہورؔ
اس لیے محسوس تو ہو گی کمی دونوں طرف

(۲)

ترے ہونے کا یقیں ہے کہ گماں ہے ، کیا ہے
تو مرے پاس نہیں ہے ، تو کہاں ہے ، کیا ہے

اِک طرف قطرے میں دریا ہے تو ذرّے میں ہے دشت
لامکانی میں کہیں حدِ مکاں ہے ، کیا ہے

کوئی منظر بھی مکمل نہیں ہونے پاتا
دھند میں لِپٹا تغیر کا جہاں ہے ، کیا ہے
ترے ملنے پہ بہت خوش ہوں مگر سوچتا ہوں
یہ فقط میری محبت کا زیاں ہے ، کیا ہے
ایک بھونچال مرے پاؤں سے لِپٹا ہوا ہے
بے نشاں ہوں تو کہیں میرا نشاں ہے ، کیا ہے
گرد اُڑتی ہے دکھائی نہیں دیتا کُچھ بھی
قافلہ ٹھہرا ہوا ہے کہ رواں ہے ، کیا ہے
شکل بنتی ہے تو آواز بھی ہوتی ہے ظہورؔ
یہ مرے سامنے مبہم سا دھواں ہے ، کیا ہے

☆

علی اکبر ناطق

غزلیں

(۱)

صلیبیں نصب ہو چکیں ، مضافِ شہر میں کنوئیں بچھا دیے گئے
حضورِ آفتاب جو چراغ تھے چمک رہے ، بُجھا دیے گئے

ہرے بھرے نواح میں ہمیں تو ایک چشمِ شبنمی نہیں ملی
گھروں کی مشکیں پانیوں سے پُر تو ہیں، پہ دل سے نم اُٹھا دیے گئے

خلا میں اُڑنے والوں کی ساعتیں نہیں رہیں ، ہمیں خبر نہ تھی
وہ لفظ کی ہوا کو بھی نہ چھُو رہے تھے ، ہم صدا دیے گئے

جب ایک شخص سجدہ گہ میں قتل ہو گیا ، یہ فیصلہ وہیں ہوا
نماز روک دی گئی ،صفیں لپیٹ دیں ، دِیے بڑھا دیے گئے

،یں اُس نگر میں کانچ کی مصوّری کے شاہکار بیچتا پھرا
جہاں کی شیشہ گاہوں میں گلاس توڑتے حسیں بٹھا دیے گئے

(۲)

روز سپارے پڑھ کر پھونکے ، دھاگے باندھے ، پیر جتی کے روضے پر سو دِیے جلائے
لیکن دل پر سحر کی گانٹھیں ایسے پڑی تھیں ، گرہیں کھولنے والے قُل بھی کام نہ آئے
آپ کہو تو کشتی لاؤں ، دریاؤں کے پار چلیں گے ، بھیگی ریت میں شام بھریں گے
چپو تیز چلانے والے ، ڈوب مریں گے ، دہاتھ مَلیں گے ،صبح تلک جب ہاتھ نہ آئے

برف کا اُجلا پھول میں لاؤں ، کیسی شرط لگا کر اُس نے دُور پہاڑ پہ بھیجا مجھ کو
بات یہ برفوں بیچ کھلی ہے ، برف کے اُجلے پھولوں والے برف ہوئے ہیں ، لوٹ نہ پائے
آپ نہیں تو کس کے ہیولے پھیل رہے ہیں گھور اندھیرے شہر کی ٹھنڈی اِن سڑکوں پر
چھت پر بیٹھا گھور رہا ہوں تیری شبوں کی تصویریں اور تصویروں کے پگھلے سائے
ایک فسوں تھا ، اُس کی گلی سے پہلے پُل کی زنجیروں پر میں نے پڑھ کر خود پھونکا تھا
ہائے جنوں نے کیا کر ڈالا ، زنجیروں کے ساتھ گلی کے رنگیں نقش بھی سب دھندلائے

☆

منیر فیاض

غزل

زمین و آسماں ہونے سے پہلے
یہاں میں تھا، یہاں ہونے سے پہلے
غبارِ رفتگاں لکھا گیا تھا
ہمیں آئندگاں ہونے سے پہلے
غزل میں جھن جھنن جھن ناچتی تھی
اداسی رائیگاں ہونے سے پہلے
ندی اک پیڑ سے لپٹی ہوئی ہے
سوئے دریا رواں ہونے سے پہلے
ستاروں کی خموشی دیدنی تھی
سحر، پہلی اذاں ہونے سے پہلے
کوئی کردار چن لیں اپنا فیاض
تمامِ داستاں ہونے سے پہلے

☆

عمران عامی

غزلیں

(۱)

جو آتے جاتے رہے رازدان بنتے گئے
کرایہ دار تھے مالک مکان بنتے گئے

کہیں کی مٹی کہیں اور جمع ہوتی رہی
چراغ کھِلتے رہے ، خاندان بنتے گئے

میں اِک جہانِ محبت بسا کے چھوڑ آیا
پھر اس جہان سے کتنے جہان بنتے گئے

یہیں قریب میں جنگل تھا ، اِک گھنا جنگل
درخت کٹتے رہے اور مکان بنتے گئے

میں شعر کہتا رہا اور دفن کرتا رہا
سو خواب اکٹھے ہوئے ، خواب دان بنتے گئے

یہ آب و خاک مرے ساتھ چل پڑے عامؔی
سفر شروع کیا ، بادبان بنتے گئے

(۲)

خدا کو لوگوں کے نزدیک لانا چاہتا تھا
میں اپنے گاؤں میں مسجد بنانا چاہتا ہوں

کچھ اس لیے بھی مری خودکشی ضروری تھی
میں ایک عمر کا جھگڑا مٹانا چاہتا تھا

میں چاہتا تھا وہ روتے میں مسکرا اُٹھے
میں اس کی آنکھ سے مصرع چُرانا چاہتا تھا
کسی مزار کی زینت بنا دیا گیا ہے
میں جس چراغ کو سورج بنانا چاہتا تھا
میں اس لیے بھی ذرا فاصلے پہ ٹھیر گیا
وہ مجھ سے مل کے بہت دُور جانا چاہتا تھا
میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے دل کی بات کرے
میں ایک غار سے پتھر ہٹانا چاہتا تھا
اب اُس کی آنکھ نہیں لگ رہی کہیں عامؔی
جو سارے شہر کی نیندیں اُڑانا چاہتا تھا

☆

عقیل ملک

غزلیں

(۱)

کسی بھی دورِ مکافات سے نہیں چلتا
سزا کا وقت سوالات سے نہیں چلتا
مرے یقین سے پانی ہوئی نگاہ کی سیل
یہ سلکِ اشک کرامات سے نہیں چلتا
بدن اُدھیڑ کے اپنی بساط اُلٹنا پڑی
زمیں پہ کام مناجات سے نہیں چلتا
مصافِ عشق سے چلتا ہے انتظامِ جنوں
کسی بھی ورثہ ، کسی ذات سے نہیں چلتا
درست سمت میں سالم قدم اُٹھاتا ہے
ترا غلام زحافات سے نہیں چلتا
میں اُس مقام سے آگے نکلنے والا ہوں
جہاں خیال علامات سے نہیں چلتا

(۲)

عقل سے کارِ معانی پہ اثر پڑتا ہے
تاش کھل جائے تو رانی پہ اثر پڑتا ہے
دل دھڑکنے کا چلن روکنا پڑتا ہے جناب!
سانس لینے سے کہانی پہ اثر پڑتا ہے

رکھنا پڑتا ہے یقیں ، خواہشِ منزل سے الگ
ورنہ پھر نقلِ مکانی پہ اثر پڑتا ہے
جستجو ہو تو ضروری ہے بہت علتِ خواب
ورنہ آشوبِ جوانی پہ اثر پڑتا ہے
ربط رکھنا کہ خیالات میں سکتہ نہ رہے
خون رُکنے سے روانی پہ اثر پڑتا ہے
اِک تسلسل سے اگر عمر گزرتی ہے عقیلؔ
نسبتِ سوختہ جانی پہ اثر پڑتا ہے

(۳)

اِک ستارہ نکل آیا ہے سحر سے پہلے
نقش قائم بہ جبیں تھا کسی ڈر سے پہلے
ہونٹ چٹخے تو خدا نے کہیں دیکھا ہم کو
ورنہ اِک عمر تلک چاک پہ ترسے پہلے
تم ہی معیار کہیں بیچ میں لائے ورنہ
تمھیں سوچا تھا اگر اور مگر سے پہلے
آنکھ بجھتی ہے تو آواز کہاں آتی ہے
کوئی روتا مرے جانے کی خبر سے پہلے
اب کوئی نقش مکمل نہیں ہوتا مجھ سے
ایک تمثال تو بنتی تھی ہُنر سے پہلے
نام لیتے ہیں شفا پا کے چلے جاتے ہیں
جوگ بھرتے ہیں مسافر ترے گھر سے پہلے

(۴)

گزر رہی ہے خسارے شمار کرتے ہوئے
وگرنہ پاؤں کہاں تھے غبار کرتے ہوئے
میں ایسے دور سے گزرا کہ پیش تک نہ گئی
میں اُس کو بھول گیا انتظار کرتے ہوئے
کمان کھینچ تو بیٹھا میں اِک پرندے پر
پھر ایک گرد اُٹھی شرمسار کرتے ہوئے
شکوہِ خواب ہی ایسا مری نگاہ میں تھا
میں آدھا جھڑ گیا صحرا کو پار کرتے ہوئے
جو آئنہ سی محبت تھی مجھ پہ واری ہوئی
چٹخ کے ٹوٹ گئی رنگ سار کرتے ہوئے
پھر ایک دن ترے افلاک سے نکل آیا
تعلقات کو میں استوار کرتے ہوئے

☆

فیصل ریحان

غزلیں

(۱)

کھجور کا تھا مدینے میں اک عجیب درخت
ملا ہے مجھ کو خزینے میں اک عجیب درخت

میں اس کے سائے میں رہتا ہوں دھوپ سے بچ کر
ہے میرے پاس نگینے میں اک عجیب درخت

کیا ہے کھاد نے ، اُس یاد کی، مجھے سرسبز
اُگ آیا ہے میرے سینے میں اک عجیب درخت

ستارے بن کے چمکتے ہیں رات بھر پتے
ہے آسمان کے زینے میں اک عجیب درخت

دل اپنے پیش کیے لوگوں نے بجائے زمیں
وہ ساتھ لایا سفینے میں اک عجیب درخت

پرانے جھاڑتی ، نئے برگ و بار لاتی ہوئی
ہے زیست اپنے قرینے میں اک عجیب درخت

کریدتا ہوں جو یہ راکھ وقت کی فیصلؔ
ہے مہر گڑھ کے دفینے میں اک عجیب درخت

(۲)

حادثہ وقت کے گرداب میں رکھا کس نے
شہرِ خوابیدہ مرے خواب میں رکھا کس نے

کس نے بخشا ہے مرے جسم کی مٹی کو سکوں
زلزلہ سا مرے اعصاب میں رکھا کس نے
ہو گیا راکھ ، اُسے چھو کے، مرا جسم تمام
آگ کا ذائقہ برفاب میں رکھا کس نے
چاند نکلا تو زمیں ہو گئی روشن ساری
یہ دِیا ،رات کی محراب میں رکھا کس نے
اے زمیں تیری کشش ختم نہیں ہوتی ہے
تجھ کو اس رنگِ ابد تاب میں رکھا کس نے
سوچتا ہوں میری دھرتی، مرے لوگوں کے لیے
زندگی کو خطِ نایاب میں رکھا کس نے

(۳)

اِک غم سے بچ رہیں تو نیا ڈر ہے سامنے
ہر لحظہ انتشار کا منظر ہے سامنے
تحلیل ہو چکے در و دیوارِ خواب تک
ہر دم رہا گمان کہ بس گھر ہے سامنے
ہونے کے کرب سے تو گزر آئے ہیں پہ، ہم
اب کیا کریں عدم کا سمندر ہے سامنے
اک عمر ہو گئی ہمیں سر پھوڑتے ہوئے
جانے یہ کس قماش کا پتھر ہے سامنے
آتے ہیں ذہن میں جو یہ باریک سے خیال
مت پوچھ کون ریشمیں پیکر ہے سامنے

دستک وہ دے رہا ہے نئی صبح کا شعور
اٹھ اے مرے بلوچ ! گوادر ہے سامنے
دل! تجھ کو آرزوئے سخن کی للک ہے کیوں
بیدرد! میؔر جیسا سخن ور ہے سامنے

(۴)

خوشی ملتی نہیں ،ارمان میں کٹ جاتی ہے
زندگی حسرتِ سامان میں کٹ جاتی ہے
دن گزر جاتا ہے مزدوری بھرے صحرا میں
رات ، اک یاد کے دالان میں کٹ جاتی ہے
کبھی کٹتی نہیں اک شامِ جدائی کسی طور
عمر ساری کبھی اک آن میں کٹ جاتی ہے
خواب اغوا کیے جاتے ہیں ہمارے اور پھر
عمر ، تعبیر کے تاوان میں کٹ جاتی ہے
رات اس کُرے پہ چھائی ہے بلاؤں جیسی
زندگی صبح کے امکان میں کٹ جاتی ہے

☆

شاہین عباس

ڈارک روم میں لیکچر

(ناول کا ایک باب)

حضرات!

پھر وہی پینتالیس منٹ کا پیریڈ اور وہی ہم لوگ، اکٹھے ایک چھت کے نیچے!

امید کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ وقت اچھا گزرے گا، اور اچھا کیسے نہ گزرے کہ بات ہی ایسی ہے۔ آپ سنیں گے تو اپنے اپنے بینچوں پر قلم بہ دنداں بیٹھے کے بیٹھے رہ جائیں گے، پنکھے کی ہوا سے سامنے رکھی ہوئی ڈائریوں اور نوٹ بکس کے صفحے اڑتے ہوئے آپ کی توجہ کے طلب گار رہوں گے کہ اور کچھ نہیں تو پروفیسر صاحب کے چیدہ چیدہ نکات کے نوٹس ہی لیتے رہیے، مگر قلم بتیسی سے باہر آئیں گے تو کاغذ پر رواں ہوں گے؛ باہر آئیں گے ہی نہیں۔ وہیں اطمینان سے پڑے زبانوں کو نیلا کرتے رہے گے!

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو کہ آپ کے حق میں جاتا ہے، اور وہ یہ کہ کیا پنکھے کی ہوا پروگرام کے پیش کار پروفیسر کو کچھ نہیں کہے گی؟ کہے گی، کہے گی کیوں نہیں۔ پیش کار کیا کوئی خلائی مخلوق ہے کہ کوئی شے اُڑتی ہوئی آئے اور اُس کے سر پر سوار نہ ہو۔ یہ پر پُرزوں والی ہوا ہے، کوئی مکھی مچھر تھوڑی ہے۔

آپ حیران کیوں ہیں کہ پروفیسر موصوف کہاں دیکھ رہا ہے، پوچھ کیوں نہیں لیتے کہ اُس نے اِس عمر میں یہ کیا چکر چلا رکھا ہے کہ بے روک دیکھتا ہی چلا جاتا ہے! کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ بے شرمی سے دیکھنا اور بے بسی میں دیکھنا سزا اور جزا کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں، اگرچہ دونوں میں چاروں طرف دیکھا جاتا ہے یہاں تک کہ چہار اطراف دیکھنے والے کے کاندھوں پر چڑھ دوڑتے ہیں۔

ہاں تو اطراف جو اِس ہال میں میسّر ہیں، اُن سب کو اطرافِ کُل سمجھ کر گردن گھما کر دیکھنا کوئی عیب کی بات نہیں، خواہ وہ ترازو میں تولنے پر کُل سے کچھ کم ہی کیوں نہ ثابت ہوں، پھر بھی مبالغے کی مد میں گنجایش ہمیشہ نکلتی رہتی ہے، جس کے اندر اندازوں اور تخمینوں کی کمی بیشی کو چھپایا جا سکتا ہے۔ بات کرنے سے پیشتر اپنے سننے والوں کی نشستوں کو ذہن نشین کر لینا اور مطمئن ہو جانا کہ کون طالب علم بینچوں کے ساتھ ٹیک لگا کر براجمان ہے اور کون سیٹ کے کنارے پر سرسری سا ٹکا ہوا، برابر والے کی سانسوں کو سنتا اور گنتا ہوا، لیکچر کو محض سنسنی کا ایک وقفہ سمجھ رہا ہے، قطعی کوئی بُری بات نہیں۔ آپ نے خوامخواہ منہ بنا لیے ہیں، دراصل یہ حاضری رجسٹر کا تقاضا تھا جو پورا کیا گیا بالکل ایسے ہی جیسے غیر حاضری کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں، تب تو آپ میں سے کوئی نہیں بولتا۔

یہاں ایک لمحے کے لیے رُکیے اور بے شرمی والی بات کو غیر حاضری کے ساتھ اور بے بسی والی بات کو حاضری کے ساتھ ملا کر پوری بات سمجھنے کی کوشش کیجے۔ سمجھ گئے تو سزا اور جزا کے گوشوارے بھر سکیں گے ورنہ یہ خالی ہی پڑے رہیں گے۔ اور پھر

ہزاروں برس کے بعد کوئی اِن الماریوں کو کھولے گا اور افسوس کرے گا کہ اِس کلاس کو کس کھاتے میں رکھا جائے!

اچھی بات ہے کہ آج حاضری سو فی صد ہے اور سو فی صد کے سامنے ٹھیلا لگانے کا اپنا ہی خاص لطف ہے۔ مال بکے نہ بکے، آواز لگانے میں مہارت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ راہ چلتے کوئی پوچھ ہی لیتا ہے کہ پروفیسر صاحب، کتنا تجربہ ہے آواز لگانے کا؟ تجربہ بڑھے گا نہیں تو بھرے بازار میں خفت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، یوں جیسے دکان کے شوکیس میں آویزاں خالی شرٹ ہو اور جس کے اندر کوئی وجود نہ ہو؛ نہ بازو، نہ شولڈر، نہ پیٹ نہ کمر۔ پہلی بار سچ مچ بتا دیا تھا کہ تین ماہ کا پروبیشن پیریڈ چل رہا ہے، تو جواب سن کر کوئی ایک بھی نہ رُکا اور ہر کوئی منہ چڑاتا ہوا چلتا گیا ''ہونہہ وہی نوے دن کی ٹریننگ!''۔ اب ہر بار پوچھنے پر نئے سے نیا نمبر بتا دیا جاتا ہے کہ کوئی تو رُکے اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سینیارٹی کی داد ہی دیتا جائے، جیسے پچھلے سیشن کے آغاز پر بتایا تھا کہ دو دہائیوں سے کچھ اُوپر تو اِس بار کچھ زیادہ ہی بتانا بنتا تھا سو کہنا پڑا کہ یہی کوئی تین ساڑھے تین دہائیاں۔ پوچھنے والوں کو مشکل میں ڈال دیا اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر بدبداتے رہے کہ تین ساڑھے تین دہائیوں میں آگے پیچھے دن اور مہینے کتنے تھے، اُوپر نیچے بہاریں برساتیں کتنی تھیں اور دائیں بائیں جاڑے اور خزاں کا شمار کیا تھا۔ مگر آواز اور پانی کا حساب آج تک کبھی کسی سے ٹھیک ہوا ہو تو اُن سے بھی ہوتا۔ پھر بھی اِتنا تو ہوا کہ وہ کاندھا تھپتھپائے بغیر آگے نہ بڑھ سکے۔

دائیں طرف آج آپ پھر دیکھ سکتے ہیں کہ کلاس روم کی قدِ آدم کھڑکیاں ہی کھلتی ہیں کچھ اور نہیں۔ اِن لوہے کی سلاخوں سے اُدھر آباد شہر میں دور دور تک کالج کینٹین کے چولھے کی روشنی پہنچ رہی ہے۔ کینٹین والا آج بھی بریک کا منتظر ہے کہ آدھا وقت گزرنے پر تقریر میں وقفہ ہو اور اُس کی چائے اور سموسے کے شوقین اُس کی طرف لپکیں۔ کینٹین والے کی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ آج اگر کسی نے چائے کا کپ اُس کے اخبار پر رکھ کر خبر پر چاہی رنگ کا دائرہ بنا دیا تو وہ کل سے میز پر اخبار رکھے گا ہی نہیں۔ مگر ایسا کرے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا، خبر کا راستہ رُکا ہے نہ رُکے گا۔ لیکچر روم کے بائیں جانب داخلی دروازے سے اُوپر ایمرجنسی فائر ایگزٹ کا سائن آویزاں ہے۔ سرخ رنگ کی تختی جس کے اندر ہر وقت سفید بلب روشن رہتا ہے، آپ شروع دن سے دیکھ رہے رہے ہیں۔ اب تو آپ کی اچھی خاصی مشق ہو چکی ہے کہ دائیں طرف سے آگ اندر آئے تو بائیں طرف کس طرح بھاگنا ہے اور کتنا بھاگنا ہے کہ قدم لان کی گیلی گھاس پر پڑنے لگیں اور آنکھوں کے سامنے فوارے کا پانی اپنا ساون برساتا ہوا دکھائی دے جائے۔ بس یہ یاددہانی یا ریفریشر ضروری تھا کہ یاد رہے کہ آپ کے دونوں جانب روشنی ہے اور آپ وردیوں والے اُن دو کے درمیان موجود ہیں۔ اِس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے انسان کو دائیں بائیں سے اُس کی اپنی ہی پسلیوں نے گھیر رکھا ہے، اُسی طرح اُسے دو روشنیوں کے بیچ باندھ دیا گیا ہے کہ بلاضرورت اِدھر اُدھر بھاگ نہ سکے۔

دیکھا جائے تو انگلی کے پوائنٹر سے پانچ روپے کے سِکّے کے مانند ایک دعویٰ ہوا میں اچھال دینا کتنا آسان ہے کہ آج کے حساس موضوع کی مناسبت سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، اور نہ دیکھا جائے تو کتنا مشکل ہے اُس دعوے کو دن نکلنے سے پہلے پہلے ابروؤں کی حرکت سمیت، سر کی ہر جنبش اور ہر لرزش لرزے کو بروئے کار لاتے ہوئے سچ ثابت کر دکھانا؛ جُوا ہے تو جُوا

ہی سہی، ففٹی ففٹی چانس کے ساتھ، مثلاً یہ کہ زمانہ خوبصورت ہے؛ نہیں زمانہ تو بدصورت ہے۔ پھر یہ کہ وقت اگر کہیں تھا تو سمجھیے کہ گزر چکا؛ ارے نہیں صاحب، وقت تو ابھی آیا بھی نہیں، پھر گزر کہاں سے گیا! کیا پچھواڑے سے ہوتا ہوا چلا گیا کہ سامنے سے گزرا تو ڈیٹ مارنے والوں کی جوڑیاں گزرنے دیں گی بھلا، اور خود اُسے بھی چار و ناچار جوڑے کے دو میں سے ایک تو بن کر دکھانا ہی پڑے گا، وغیرہ۔ یہ انگلی کا پوائنٹر اِس قدر آوارہ، بے لحاظ اور بدچلن واقع ہوا ہے کہ خدا کی پناہ! آج اگر پیش کار اِس کے اشارے پر چلتا تو کلاس روم میں وقت پر پہنچنے سے رہ جاتا اور چوراہے میں کھڑا اپنی صفائی پیش کر رہا ہوتا کہ خاتون، آپ تو چھوٹتے ہی مجھ پر برس پڑی ہیں، یہ چھینٹے کسی کی گاڑی نے اڑائے ہوں گے، پیدل چلنے والے کی کیا مجال کہ اپنے حصّے کی کیچڑ کسی غیر محرم کے نام کرتا ہوا چلے۔ خیر آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ آج ہمارے موضوع کی نوعیت کیا ہے، یہی کہ زمین کے نیچے خفیہ سٹے بازوں کا پتا چلایا جائے، اُنھیں گھسیٹ کر زمین کے فرش پر لا کر پوچھا جائے کہ بتاتے کیوں نہیں کب سے ٹھکانا ہے وہاں؟

حضرات! گوش گزاری کے فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے پیش کار کے نزدیک سمع خراشی پر پیشگی معذرت کے چند جملے فرض تھے جنھیں کہہ سن کر آگے چلے ہیں، اللہ ہمارا حامی و ناصر ہوگا۔ ایسی اپروچ میں، جس پر پیش کار کا انحصار رہا ہے، خدشہ ہوتا ہے کہ پریزینٹر اور آڈیئنس دو متحارب گروپوں کی صورت میں آمنے سامنے آن کھڑے ہوں گے، اپنے اپنے لیب ٹاپ اور موبائیل فون ایک دوسرے کے سر پر دے ماریں گے اور لیکچر کا پونا گھنٹہ پھیل کر لڑائی کی پون صدی بن جائے گا، جیسے گلی میں انسانی قدموں سے اڑنے والا غبار صحرا کا رُخ کرے تو وہاں کے کلچر سے شہہ پا کر آدمی یا کسی بھی ذی روح کے اڑائے بغیر ہی اڑنے لگے۔ پھر یہ احتمال بھی رہتا ہے کہ پون صدی گزرنے پر جب دوبارہ کلاس شروع ہوگی تو الیکٹران، پروٹان کے فسادی نطفے تازہ دم ہو کر نئی معرکہ آرائی میں پیش قدمی کرتے پھدک پھدک کر اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے پائے جائیں گے، جیسے ریس میں شامل فرس ابنِ فرس بھاگ رہے ہوں؛ عبرانی کہیں کہ عربی ہیں اور عربی کہیں کہ نہیں یہ تو سب عجمی ہیں۔ مگر کیا کیا جائے، خدشوں اور احتمال کو زیادہ سر چڑھا لیا جائے تو ایٹم کے اندر باہر کا ایک ایک فسادی بے وقت ملکِ عدم کی راہ لے لے گا اور الزام پروفیسر بے چارے کی قدامت پسندی پر آ جائے گا۔ پھر آپ ہی کے اندر سے کوئی اٹھے گا اور کہے گا کہ افسوس مداروں اور محوروں کا پوائنٹ آف ویو نہیں سنا گیا کہ وہ مرنا چاہتے تھے یا زندہ رہنا چاہتے تھے، اپنے سیارے پر نہ سہی تو جلاوطن ہو کر کسی اور طرف تو سرک سکتے تھے۔

''سیّارے اور جلاوطن؟''

''جی استادِ محترم، یہ وقت کسی پر بھی آ سکتا ہے کہ جب کوئی اپنے ہی جیسے کسی اور وجود میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ گھبرائیے نہیں، ذرا دیوار سے ٹیک لگا کر پانی کے دو گھونٹ پیجیے، یقین آ جائے گا۔''

اب تک کی گفتگو سے دو ایک نئی باتوں کا پتا چلا ہے اور وہ یہ کہ سیّاروں کا بھی کوئی نقطۂ نظر یا مافی الضمیر ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے فیصلے اُسی کی روشنی میں کرتے ہیں، ایک سیّارے کا دوسرے کو تباہ کرنے کا منصوبہ بھی تباہ کرنے والے کے نزدیک خلافِ ضمیر نہیں ہوتا، جبھی تو وہ معاصر ٹیلوں پر اِتنی بڑی تباہی پھیلانے کے بعد معمول کے مطابق اپنے دن رات گزارتا رہتا

ہے، زیادہ بڑی توند کے ساتھ جیتا ہے اور ہمسایوں سے تو تکار میں پہلے سے بڑھ کر حاضر جواب ہو کر گھر سے نکلتا ہے۔
پیش کار کے علم میں اضافہ کرنے کا شکریہ۔ یہ اچھوتا نکتہ جسے پیش کرنے کے لیے آپ نے سر پر رومال باندھ لیے ہیں اور چہرے کے دونوں طرف کنپٹیوں کی رگیں اُبھر کر نمایاں ہوگئی ہیں، آپ لوگوں کے نام سے اشاعت کے وقت دیگر نکات کی زیرِ طبع دستاویز میں شامل کر دیا جائے گا۔ پروفیسر بھی اپنے تکونی رومال کو سر کے ساتھ چپکا کر آپ جیسا ہونا چاہتا ہے۔
اجازت؟
شکریہ! آپ نے ساتھ دیا ہے تو یاد آ گیا کہ ایک سیّارے کے مافی الضمیر کا بار گرتا پڑتا جب دوسرے سیّارے پر پڑتا ہے تو وہیں ایک گڑھا سا بن جاتا ہے اور اگر پہلا سیّارہ اپنے اُوپر پڑنے والے وزن کو پرے دھکیل دے تو قریب ہی جزیرہ نما ابھر آتا ہے۔ اِنھیں دو کو، یعنی نشیب نما اور جزیرہ نما کو سماجی اختراعات کی فہرست میں گنا جاتا اور سوشل سیٹ اپ کے ارتقا میں شمار کیا جاتا ہے۔
یاد رہے کہ کلاس کے آخر میں معمول کے مطابق سوال جواب کا پورا موقع دیا جاتا ہے، یہ حق آج بھی دیا جائے گا، کل بھی اور پرسوں بھی۔ مگر آپ کو ابھی سے بغلوں کے اندر کھجا کر انگلیوں کو سونگھنے کی ضرورت نہیں۔ خدارا سماجیات کی کلاس کو سرجری کی کلاس نہ بننے دیا جائے۔ اتالیق کو اُس کی مخصوص کراہت میں الجھا کر فرار کی کوشش! نہیں اِس مبارک اور مقدس پیریڈ میں ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا کہ پروفیسر نے ایک ہاتھ سے ناک کی دونوں نالیاں دبا رکھی ہوں اور دوسرے ہاتھ سے آنکھوں پر پردہ تان لیا ہو، محض اِس لیے کہ وہ آپ کو بے وقت کی کھجلی اور خارش سے روکنے میں ناکام ہو گیا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ پسینے کی پیداوار، محض بساند کے علاوہ بھی کچھ ہے، کیا ہے، یہ آپ سے پروفیسر کا سوال ہے۔ گھر جا کر سوچیے گا اور پھر جواب دیجیے گا کہ کستوری ہے، صندل ہے یا کچھ اور!
دیکھیے! اِس طرف نہیں، اُس طرف دیکھیے! یہ بات تو اب کہے بغیر ہی سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ خوبصورتی اور بدصورتی کے تصورات کچھ اِس حد تک تبدیل ہو چکے ہیں کہ زمانہء قدیم میں درجہ بہ درجہ اپنی معراج کو پانے والی خوبصورتی یا بدصورتی اب جھٹ سے اپنی انتہا کو جا لیتی ہے، کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوتا کہ انجام دیکھنے کی عجلت میں بیچ کی کون کون سی گرہیں لگنے سے رہ گئی ہیں اور کن کڑیوں کے ساتھ کیا ہاتھ ہو گیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ بھلے وقتوں میں جب زمین سے اٹھ کر پہلے درجے کے آسمان پر اور پھر وہاں سے ساتویں نمبر کے آسمان پر جانا ہوتا تو مجال ہے کوئی مہم جُو ایک ایک، دو دو سیڑھیاں چھوڑ کر زینے کے تختوں میں طوفان برپا کرتا ہوا اُوپر کو اٹھتا ہو۔ تب تو ہر تختے اور ہر پائیدان پر رُک رُک کر سیر و سفر کا لطف لیا جاتا تھا، گاہے گاہے نیچے کی طرف زمین کو گھاٹی میں بدلتے ہوئے دیکھا جاتا اور ہم سفروں کو آوازہ لگا کر یاد دلایا جاتا کہ وہ رہی ٹاس کے ٹیڈی پیسوں کی طرح اچھلتی ہوئی مخلوق کبھی ہیڈ کبھی ٹیل، یہ وہی تو ہے جسے بازاروں کی دھکم پیل میں پیش پیش، انسانی شکل میں چھوڑ آئے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ آخری پائیدان آ جاتا۔ پھر جب کئی کئی دن کی خیمہ زنی کے بعد کیمپ اکھاڑ کر واپسی کا دن آتا، تو پہلے تو دل ہی نہ مانتا اور اگر اِس وعدہ وعید پر راضی ہو ہی جاتا کہ اگلے سال پھر آئیں گے، تو ہولے ہولے، سہج سہج سیڑھیوں پر پاؤں پڑتا، گردن اُوپر کی طرف اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے نیچے اترتے اور پکارنے لگتے کہ

وہ رہے بونے بونے سے، پدے پدے ہمارے مہمان نواز، کہاں گئیں وہ نکیلی نورانی کٹاریں جنھیں وہاں ایک جشن کی نشستیں، دوسرے کی چاندنیاں اور تیسرے کی مسہریاں کہا جاتا رہا؟ جس طرح جاتے ہوئے پہلے آسمان میں دوسرا، دوسرے میں تیسرا یہاں تک کہ چھٹے میں ساتواں آسمان غائب ہو جاتا اُسی طرح واپس آتے ہوئے ساتویں سے چھٹا، چھٹے سے پانچواں، اور پھر دوسرے سے پہلا آسمان نکل آتا اور پہلے آسمان کے اندر سے زمین الگ ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگتی۔

آپ پروفیسر کے بولنے کی رفتار ہی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بغیر سانس لیے تیز تیز لیکچر دینے کے پیچھے وہی نام وری کی خواہش کارفرما ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں ریکارڈ پر آجائیں اور اگر مستقبل میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ یہ ریکارڈ وہاں بھی بجنے لگیں جہاں آواز ابھی تک دریافت نہیں ہوئی، تو وارے نیارے ہو جائیں گے؛ پروفیسری زندہ باد، موت مردہ باد۔ تو کیوں نہ اِسی بات پر تالیاں ہو جائیں؟ تالیاں!

آپ نے دیکھا اور سن بھی لیا کہ الٹے ہاتھ کی تالیوں کی آواز سیدھے ہاتھ کی تالیوں سے زیادہ تھی اور ایک ہاتھ سے بجنے والی تالی تو اُن سب سے بڑھ کر بلند آہنگ نکلی۔ اِس تعلق سے اگر دُنیا میں ہونے والے فسادات کا جائزہ لیا جائے تو بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر زمین پر تصادم برپا کرنا ہی وقت گزاری کی واحد صورت باقی رہ جائے تو ضروری نہیں دو فریق آمنے سامنے ایک دوسرے کا نشانہ باندھے آ کھڑے ہوں اور پھر تالی کے دو ہاتھوں کی طرح بجتے رہیں، فریقین اُوپر نیچے سے بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں جیسے الٹے ہاتھ کی تالی سے اندازہ ہوا اور اندر باہر سے بھی ایک دوسرے پر جھپٹ سکتے ہیں جیسے ایک ہاتھ کی تالی میں آپ اور میں نے دیکھا۔

بات ہو رہی ہے چھوٹتے ہی انجام دیکھنے کی یعنی عجلت میں نقطۂ آخر کو جا لینے کی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے دُنیا کا آخری موڑ مڑ جانے کی۔ مگر ایسا شاید کبھی ممکن نہ ہو سکے۔ چلیے خیر، یہ بات تو ضمنی تھی جو گلی کے موڑ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کسی گداگر کے ذہن میں بھی آ سکتی تھی اور پھیری والے کو بھی سوجھ سکتی تھی، شیرینی کی پلیٹ پر آ کر بیٹھنے والی مکھیاں بھی روزانہ یہی سوچتی ہیں اور چوہے کو منہ میں دبا کر ممٹی کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی پالتو بلیوں کا نقطۂ نظر بھی ملتا جلتا ہو سکتا ہے۔ آیئے لوٹتے ہیں اپنے موضوع کی طرف، ہزار جتن کے باوجود جس کا کوئی ایک مرکزی خیال سامنے نہیں آ سکا، یوں جیسے مٹی کا تودہ چھت برابر بلندی سے گر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، بالکل ایسے ہی پروفیسر کے پاس اگر خیال کی کوئی سربند گٹھڑی تھی بھی تو یوں سمجھیے کہ وہ بھی سنبھالی نہیں جا سکی، بیچ چوراہے کے الٹ دی گئی اور اندر جو کپڑا لتا تھا ہوا میں اڑنے لگا، دوریوں کٹوریوں کا پیتل تانبا گیند کی طرح ٹھپے کھاتا ہوا اِدھر اُدھر جا پڑا اور جا و بے جا دم سادھ لیا، چھری کانٹوں کا سونا چاندی تو لش لش کرتی دوپہروں کی آنکھ میں جیسے سرمچو کی طرح پھر گیا اور بینائی کو ہمیشہ کے لیے اپنا احسان مند بنا لیا۔ ہاں تو، گانٹھ ڈھیر ہوئی تو دہلیزوں اور تھڑیوں کے آس پاس سامان ہی سامان نظر آیا، کھڑکیوں کے سریوں سے کترنیں بندھی دکھائی دینے لگیں اور سن شیڈ کے ٹین پر مرکزی خیال کا بچا کھچا مال برف کے اولوں کی طرح گرنے لگا۔

اب جس طرح انتہا کا خوبصورت ہونے کے لیے ابتدا میں ذرا سا بھی خوبصورت ہونا کوئی شرطِ اوّل نہیں، اُسی طرح انتہا کا

بدصورت قرار پانا ہوتو پابندی نہیں کہ آپ اپنے آغاز میں بدصورت بھی رہ چکے ہوں۔ 'آپ' سے مراد، ضروری نہیں کہ آپ ہی ہوں، کوئی آپ کے علاوہ بھی 'آپ' ہوسکتا ہے؛ ایک آدمی بھی اور ایک ادارہ بھی؛ ایک ملک بھی اور ایک جنگل بھی تخاطب کے زمرے میں آئیں تو 'آپ' ہی کا صیغہ بہترین ثابت ہوتا ہے: ''اے عقاب، ہم تو آپ کے لیے حلال قرار پائے، مگر آپ ہمارے لیے ناجائز کیوں ٹھہرے۔ تو کیا آپ اپنا بھوجن لینے اِدھر آتے ہیں یا ہم سے ملنے؟'' اور عقاب بول پڑیں: ''اے انسان، ہمیں آپ کے ماتھے سے نکلتی ہوئی شعاعوں سے اُنس ہوگیا ہے۔ بس اِسی لیے آپ کے سر پر اڑنا ہمارے لیے افضل قرار دیا گیا ہے، بھوجن کی تلاش ایک مسئلہ ہے اور روشنی کی تلاش دوسرا''۔ یہی نہیں بلکہ پردہء سکرین کو بھی 'آپ' کہا جاسکتا ہے اور اگر آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی ایل ای ڈی بھی مکالمے، مباحثے یا مجادلے میں شریک ہوگی تو اُسے بھی بے دھڑک 'آپ' کہا جاسکتا ہے، بلکہ ایسا تو پہلے ہی کہا جاتا ہے: ''اے ایل ای ڈی! میں اور آپ جس مجادلے میں شریک ہیں، اُس کی انتہا کیا ہے، مجھے تو کچھ پتا نہیں، آپ ہی بہتر بتا سکتی ہیں، بتائیے نا، شریکِ مجادلہ کو یوں مت ترسائیے آپ!''۔ جن لڑکیوں کی شادی قرآن شریف سے ہوئی، وہ محرمانہ سرگوشی سے لے کر تخاطب و حاجات کے شور و غوغا تک 'آپ' کا استعمال کب اور کیسے کرتی ہوں گی، یہ ایک اور سوال ہے۔ اِس کا جواب ضروری نہیں کہ آپ کل ہی ڈھونڈ کر لے آئیں، قیامت کی صبح کو بھی یہ جواب دیا جاسکتا ہے۔ اگر قیامت کل ہے تو کل، پرسوں ہے تو پرسوں، گرمی کی چھٹیوں کے بعد ہے تو تب آئیے گا جواب کے ساتھ۔۔۔۔۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ انسان نے اپنی انتہاؤں کو خود سے اِتنا قریب کرلیا ہے کہ وہ ابتدا میں ضم ہوکر رہ گئی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب انسان کو رونے اور ہنسنے کی قدر معلوم تھی۔ یہاں قدر محض اہمیت کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ نسبت تناسب کا مطلب بھی دے رہا ہے۔ کہیں صدیوں میں کوئی بین یا قہقہہ فضا میں بلند ہوتا تھا اور کام پر گئے ہوئے لوگ اپنے بلّم، بھالے ایک طرف پھینک کر لنگیاں درست کرتے اُس طرف لپکتے تھے کہ دیکھیں تو سہی وہاں، جہاں سے آواز آرہی ہے، کیا ہو چکا اور کیا ہونے جا رہا ہے۔ تب کبھی رونا غیر ضروری طور پر واقع ہوا نہ ہنسنا کہ مخالفین میں سے کسی کو کوئی انگلی اٹھا کر باور کرانے کی ضرورت پیش آئے کہ اے مخالف، یہاں نہ ہنسنا بنتا تھا نہ رونا، پھر تم ہنسے کیوں، اور تم روئے کیوں۔ اب ایک خیرات کی جگہ دوسری خیرات اور اجرت کے ایک مال کی جگہ دوسری اجرت کا آنا جانا مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ یوں ہر آنے والا 'اصل' قرار پا کر روزمرہ کی ضرورت بن گیا اور جانے والا جو کہ ڈسٹ بن کا ٹریش تھا، کنستر میں جا پڑا۔ وہ زمانہ آپ کے بڑے بوڑھوں نے دیکھا ہوگا کہ جب گھر میں داخل ہوتے تو دیوار کے ساتھ ٹھکے ہوئے لیٹر بکس کو کھول کر دیکھنا معمول تھا کہ اندر کوئی نئی چٹھی تو نہیں دبکی پڑی۔ ایک وقت یہ ہے کہ سارے دن کے تھکے ہارے جب گھروں کو لوٹتے ہیں تو ڈیوڑھی میں رکھی ہوئی کچرے کی ٹوکری پر آنکھ جا پڑتی ہے اور پورے دن کی کارگزاری سمجھ میں آجاتی ہے کہ آج کیا ہوا ہوگا، کسی سے کہنے سننے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک حد ہوتی ہے ٹریش کو سمونے کی بھی، نہیں جانتے تو جان لیجیے کہ کوڑے دان کا بھی آخر دل ہوتا ہے اے کچرا گیرو! اے جہاں گیرو! تو یوں ہے کہ اب وہ ڈسٹ بن بڑا ہوتے ہوتے کھڑ کھڑ کرتے لوہے کے ڈرم کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ ڈرم کے کناروں تک اندر سے ہاتھ پاؤں مارنے والوں کے ہاتھ بھی دیکھے جاسکتے ہیں اور پاؤں بھی، یہاں تک

کہ جب پاؤں پیندے پر پڑے ہوتے ہیں تو گاہے بہ گاہے اُن کے بالوں کا چھجا بھی باہر دکھائی دینے لگتا ہے جیسے کوئی نیا ہیئر سٹائل مارکیٹ میں عام ہو رہا ہو اور جس کی ریہرسل کے لیے ڈرم کو تختۂ مشق بنایا گیا ہو کہ پراڈکٹ یہاں سے لانچ ہو گی تو زیادہ چلے گی۔

ٹریش پر بہت بات ہو چکی، اِتنی عمر تو شاید اِس کم ذات کی تھی بھی نہیں جتنا باتوں باتوں میں یہ ہمارا وقت لے گیا ہے۔ کیا انسان کے پاس اتنی مہلت واقعی ہوتی ہے کہ وہ چوراہے میں کھڑا کچرے کو پھونکیں مار کر اڑاتا رہے اور دیکھتا رہے کہ سامنے والے کے سر پر کس آشیاں کے کتنے تنکے گرے اور آنکھوں میں مٹی کے کیسے کیسے ریزے رڑکنے لگے، پھر وہ اُس چوراہے سے کامیابی کی منادی کرتا ہوا پورے شہر میں سنائی دینے لگے کہ فلاں ابنِ فلاں نے فلاں بنتِ فلاں کے سر کو گندا کر دیا اور آنکھوں کے آگے جالا بُن دیا۔

اب اگر سر پر بندھے ہوئے رومالوں کی گرہیں ڈھیلی کی جائیں اور کنپٹیوں میں رُکا ہوا خون پورے جسم میں دوڑنے لگے تو آگے بڑھا جائے۔ دراصل خون جو دماغ میں رُک گیا ہے، اُسے بھی حق حاصل ہے کہ گشت مکمل کرنے کے لیے پورے وجود میں پھر سے شامل ہو سکے، ورنہ ایک اور قتل کا الزام استاد اور اُس کے شاگردوں پر آ سکتا ہے۔۔۔'ایک اور قتل' جی ہاں ایک اور قتل۔ مگر اِس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اِس ٹیم سے پہلے بھی قتل سرزد ہوتے تھے اور اِس کھیل کے کھلاڑی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ تو کیا ایسا ہی تھا۔ ایسے میں جب کچھ بھی اندازہ نہ ہو رہا ہو کہ تیغ و تبر کہاں کہاں سے ہو گزرے ہیں اور تیر و سناں نے کب سے خدا کی چلائی ہوئی ہوا کو باندھ رکھا ہے، تو آستین کی گواہی لے لینی چاہیے اور اگر آستینیں بھی ہیچر میچر سے کام لیں تو زبان کی نوک کو انگلی سے چھو کر دیکھ لینا چاہیے کہ لعاب کا رنگ کیا ہے اور کب سے ہے۔ خیر قتل تو وہ تھے، مگر کتنے تھے، اِس کا حساب یاد نہیں تو کیا، سر پڑنے پر یاد آ جائے گا۔ چھوڑیے کل کا حساب کتاب، پروفیسر تو آج کی بات کر رہا ہے کہ اگر آج کسی کے قتل کا ارادہ ہے تو ترک کر دیجے اور سوچیے کہ خون بہانے سے کس طرح بچا جا سکتا ہے!

لیجیے استاد کی گرہ تو ہوا ہو گئی۔ اب فنگر پوائنٹنگ میں تیزی آنے لگی ہے۔ یہ پوائنٹر ہے یا بلیک بورڈ پر دھمال ڈالتا ہوا درویش جسے اپنی اترن کا پتا ہے نہ پہناوے کا۔ اِس پوائنٹر سے کیا بعید کہ اترن کو پہناوا اور پہناوے کو اترن سمجھ کر ہی ناچتا رہے! انگشت نمائی سے ردوبدل کا یا اِس سے بھی بڑھ کر الٹ پھیر کا کام لیا جانا کوئی عیب کی بات نہیں، جیسے پروفیسر نے ابھی تھوڑی دیر پہلے چاہا کہ اگلی سیٹوں والے پیچھے جا بیٹھیں اور پچھلی سیٹوں والے آگے آ جائیں، تو ایک لمحے کے لیے انگلی سے اگلی پچھلی سیٹوں کا نشانہ باندھا اور یہ کام کر دکھایا۔ آپ کو اندازہ بھی نہیں ہوا کہ مراتب میں کب اور کیسے اتھل پتھل ہو گئی!

دیکھا جائے تو فی زمانہ ٹریش کا مطلب ہی یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ ہر عہد کا ایک ٹریش ہوتا ہے، جیسے عہدِ اسلامی کا ٹریش، کفر یہ دور کے گنے چنے دن رات کو قرار دیا گیا۔ یہ پہلے ہوتا تھا، اب نہیں۔ اب یوں کہنا بنتا ہے کہ ہر ٹریش کا اپنا ایک عہد ہوتا ہے۔ ہمارے ٹریش کا بھی ہے اور یہ وہ نامی گرامی عہد ہے کہ اگر اِسے جھاڑ جھٹکار سے کسی طرح الگ کر بھی لیا جائے تو رہے گا ٹریش ہی۔ آپ کے شہر میں اِن دنوں دو عمارتوں کا بہت ذکر ہے، اِتنا ذکر کہ جیسے شہر قائم ہی اُن دو کی وجہ سے ہے۔ 'اِن دنوں' سے تو شاید بات انڈر ایسٹیمیٹ ہو جائے گی، یہ شہرہ اُن دنوں سے ہے جب انسان کو

آرے سے کاٹ کر اُس کے دو حصّے کیے گئے تھے اور درختوں کی بنیاد پڑی تھی۔ آپ اُس وقت وہاں موجود تو نہیں تھے، البتہ مخبری کرنے والوں کو سرِ راہے روک روک کر آپ نے جان لیا کہ یہ شہرت، شہرہ، نام وری، نیک نامی یا بعض صورتوں میں آپ یعنی خلقت کے حصّے میں آئی ہوئی بدنامی کس بلا کا نام ہے، کس سرخیل کا شہپر ہے، کس دوزخ کی رہداری ہے اور کس جنت کا محلِ سرا ہے۔۔۔

ایک عمارت نے مشرقی سرے کو گرفت میں لے رکھا ہے اور دوسری نے مغربی حد پر تکیہ جمایا ہوا ہے۔ مگر اُن کی شہرت مشرقی اور مغربی کناروں پر ایستادہ ہونے کی وجہ سے نہیں، طرزِ تعمیر کے نامعلوم آرکیٹیکچر اور اندرونِ خانہ محفوظ، ایٹم کی دریافت سے پہلے کی کچھ تباہ حال باقیات کے باعث ہے۔ اِتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی اُن عمارتوں کی دیواروں اور دروازوں پر خطاطی اور مصوری کے وہ نمونے عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ایک بار دیکھنے پر جو تصویر یا عبارت جہاں نظر آتی ہے، دوسری بار ذرا آنکھ جھپک کر دیکھیں تو وہاں کچھ بھی نہیں ملتا یا عین اُس جگہ کوئی نئی پینٹنگ آویزاں ہو چکی ہوتی ہے۔ اِسی شہر میں دو کردار بھی بہت شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کے نام بتانے کی ضرورت نہیں، آپ خوب واقف ہیں کہ وہ کون ہیں اور کہاں کہاں سے وارد ہوئے ہیں۔ کششِ ثقل کی دریافت اُنھیں کرداروں کے ہاتھوں ہوئی تھی جب اُن کا بوریا اڑتا ہوا ایک دوسرے پر آن گرا تھا اور دونوں کے چبوتروں پر پڑے ہوئے پانی کے دو بھرے ہوئے پیالے تیسرے چبوترے پر جا کر ایک ہو گئے تھے۔ وہ اِس قدر معصوم تھے کہ شروع شروع میں اپنی دریافت کو معمول کا ادل بدل سمجھتے رہے، جبکہ بہت زمانوں بعد اُنھیں احساس ہوا کہ قدرت نے اُن سے کتنا بڑا کام لے لیا ہے۔ اب وہ ایک نئی قوت کے ارتکاز پر کام کر رہے ہیں جس کے ثابت ہو جانے سے ہوا میں اپنی مرضی کے مقام پر تادیر قیام کیا جا سکے گا؛ قیام سے مراد رہائش اور پڑاؤ والا قیام بھی ہے اور قیام و سجود والا بھی، رکوع جس کی درمیانی کڑی ہے۔ یوں اگر کوئی شخص زمین اور آسمان دونوں کی پکڑ سے آزاد ہونا چاہے تو اُس کے لیے بہترین موقع ہوگا کہ جائے اور وہاں رہنے کی خواہش کرے۔ وہاں بھی ملک اور شہر آباد کرنے کا بڑا منصوبہ بن رہا ہے، نقشہ نویسوں کی خدمات لے لی گئی ہیں، بس کچھ ہی دنوں میں الاٹمنٹ کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ اُس کے بعد تعمیر اور تعمیرِ درتعمیر کے مرحلے کا آغاز ہوگا، ملکیت اور وراثت کا ایک نیا تصوّر پیش کیا جائے گا اور روزگار کے نئے مواقع میسّر آئیں گے۔ وہاں ایک گھر، ایک دفتر، ایک باغ اور ایک قبر کا کامیاب تجربہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے، اب پراجیکٹ کا فیتہ کاٹنا باقی ہے، جس کے لیے زمین سے عورت اور آسمان سے خدا کو دعوت دی جائے گی، قینچی کے ساتھ سرخ ربن کٹے گا، تالیاں بجیں گی اور یوں زمین و آسمان کی تائید کے ساتھ کائنات کے نقشے پر ایک نئی کائنات آباد ہونے لگے گی۔ اِس منصوبے سے پرانی زمینوں اور پرانے آسمانوں کی نمبر شماری، یا اگر بات کو سادہ لفظوں میں کہا جائے تو سیریل نمبرز، متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کہ مجوزہ کائنات زمین سے کتنے فاصلے پر ہوگی اور پہلے آسمان سے کتنی دُور، اور پھر یہ کہ وہاں شبِ برات کا جشن منانے والے کس آسمان کو پہلا آسمان کہیں گے؛ ابھی طے کرنا باقی ہے کہ وہاں کے لوگ پہلے آسمان کو کہاں تلاش کریں گے؛ سروں کے اُوپر یا کاندھوں کے آس پاس یا کہیں اور!

مگر ابھی آپ کو اپنی توجہ اِسی شہر کی اُن دو عمارتوں پر مرکوز رکھنا ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن عمارتوں میں سے آئے دن تصویریں

غائب کرنے میں اُنھیں دو کرداروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ایسی چوری چکاری کی ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جب فنا اور بقا میں توازن قائم کرنا ہو اور موت کو زندگی اور زندگی کو موت کی کہانی سمجھ کر سنا اور سنایا جانا عوام الناس کی اوّلین تفریح قرار پا چکی ہو۔سو کی گنتی میں سے اِدھر کا پچاس اُٹھا کر اُدھر اور اُدھر کا پچاس اٹھا کر اِدھر کرنے پر ریاضی دان بہت آگ بگولا ہوئے، مگر تاریخ دانوں نے اُن کا منہ بند کرا دیا۔

اب ایک اور مِس کیلکولیشن کا کیس دیکھیے۔یہ اپنی نوعیت کی پہلی کیس سٹڈی ہے جو آج کے لیکچر کی تیاری میں پروفیسر کے ہاتھ اُس وقت لگی جب سامنے پڑے ہوئے نوٹس اور نکات غائب ہونے لگے اور جو تھوڑے بہت باقی رہ گئے اُن کی عبارتیں خود اُن کے لکھنے والے سے اوجھل ہونے لگیں۔ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔یہ ان ہونی کسی نہ کسی سطح پر ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے، مگر آج اِس کی شدت کئی گنا زیادہ تھی۔وہ یوں کہ تفسیریں، تاویلیں، تمثیلیں ایک ساتھ کاغذ پر دکھائی دینا بند ہو گئیں۔ حرفوں نے پردہ کیا تو آوازیں بھی ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔پروفیسر نے بہت پکارا کہ اے تفسیر، اے تاویل، اے تمثیل! جہاں کہیں بھی ہو لوٹ آؤ، لیکچر کا وقت نکلتا جا رہا ہے، مگر تینوں نے ایسا ایکا کر رکھا تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔سامنے پڑے کاغذوں کو نہ تو پڑھا جا سکتا تھا اور نہ ہی آوازہ لگانے پر خاموشی ٹوٹ رہی تھی۔پروفیسر الٹے پاؤں بھاگتا ہوا اُس ساری صورتِ حال کو آپ تک لے آیا ہے کہ معاملہ تازہ بہ تازہ آپ تک پہنچے اور اُس کی اوّلین تحقیق کا سہرا آپ ہی کے ادارے کے سر بندھے کہ خالی کاغذوں کی بنیاد پر کام کرنے والے پہلے طالب علم آپ لوگ اور کام کروانے والا پہلا شخص یہ پروفیسر، جیسے چُن لیے گئے ہوں۔۔۔یہ رہے میز پر پڑے خالی خولی کاغذ، آپ دیکھ سکتے ہیں۔گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے میں مشکل ہو رہی ہے، تو چلیے باری باری ایک ایک طالب علم میز پر آ کر دیکھ لے کہ کاغذ کا کیا حال ہوا مگر یہاں جمگھٹا بنانے کی ضرورت نہیں، حروفِ تہجی کے اعتبار سے سب کو بلایا جائے گا اور پورا موقع دیا جائے گا کہ ہر کوئی اُس ماجرے کا چشم دید گواہ بن جائے اور ضرورت پڑنے پر عدالت کے روبرو بیان دے سکے کہ قصوروار کون تھا؛ پروفیسر کا قلم یا عبارتیں خود۔۔۔۔ہاں ہاں عبارتیں خود بھی ذمے دار ہو سکتی ہیں، جب وہ محسوس کریں کہ اُن کے ساتھ وہ انصاف نہیں ہو رہا جس کے لیے اُنھیں دلوں، دماغوں اور سینوں پر اتارا گیا تھا، تو وہ خود کو مجاز اور خود مختار تصور کرتے ہوئے کہیں بھی منہ کر سکتی ہیں۔۔مشرق، مغرب، جنوب، شمال۔۔کہیں بھی!

ہاں تو بھاگتے بھاگتے خیال آیا کہ طالب علموں کے ساتھ کیس کو پزل گیم سمجھ کر کھیلا جائے تو کیسا رہے گا، اور اگر ایسا نہ ہوا تو اِسے کسی بلیک اینڈ وائٹ فیچر فلم کے ابتدائی سین کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے، کوئی مضائقہ نہیں؛ پرانے زمانے کی ایک ایسی فلم جس کی شروعات میں لمبی ریل کے ڈبے پٹڑی پر آگے پیچھے بس بھاگتے ہی چلے جاتے ہیں، ساتھ ہی اُوپر سے نیچے تک فلم میں کام کرنے والوں کے ناموں کی پٹی چلتی رہتی ہے اور جب اداکار، مہمان اداکار، عکاسی، میوزک، آوازیں، کوریوگرافی، سیٹ ڈیزائن کے بعد آخر میں ہدایت کار کا نام سکرین پر آ کر رُکتا ہے تو ریل بھی اپنے سٹیشن پر ٹھہر چکی ہوتی ہے۔ایک بوگی سے ہیرو برآمد ہوتا ہے جو اپنی بغچی کو سر پر ٹکائے یا بریف کیس ہاتھ میں تھامے، جنکشن پر موجود ہجوم کو چیرتا ہوا بڑی خاموشی سے سٹیشن کی عمارت سے باہر نکل جاتا ہے۔وہ یہ طے کیے بغیر کہ اجنبی شہر میں سالم سواری کا کیا کرایہ

ہے، بغیر چھت کے ایک تانگے کی اگلی سیٹ پر جا بیٹھتا ہے اور پہلو میں اپنا سامان رکھ کر اُس پر اپنی کہنی ٹکا لیتا ہے۔ پھر وہ جیب سے سگریٹ نکال کر دونوں ہونٹوں میں دبا لیتا ہے اور دائیں بائیں جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے جیسے ماچس یا لائٹر ڈھونڈنے لگتا ہے۔ سکرین پر یوں دکھایا جاتا ہے کہ سوار، کوچوان کو ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتانا چاہتا ہے، غالباً سٹیشن سے اپنے اگلے پڑاؤ کا فاصلہ بتاتا ہے اور اشاروں ہی سے کوچوان کو احساس دلاتا ہے کہ تانگے کی چھت ہوتی تو چار چھے آنے بھاڑا زیادہ بھی دے سکتا تھا، مگر اِس گفتگو کو فلم میں سنوایا نہیں جاتا، بس ہونٹ اور ہاتھ ہلتے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے سنیما کے ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ دونوں میں کیا ڈیل ہوئی اور یہ کہ سوار نے مشرق سے مغرب کی طرف کتنی دور جانا ہے اور مغرب سے مشرق کی طرف کتنا، پھر یہ کہ پورے سفر میں شمالاً جنوباً کوئی سروس روڈ، سولنگ یا پگڈنڈی راہ میں پڑتی ہے تو اُس کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے اور وہاں سے تانگا گزرے گا کیسے اور اگر گزر گیا تو سوار کو اتار کر مڑے گا کیسے۔ یہ سارے فیصلے پانچ، سات روپے کا ٹکٹ لے کر آئے ہوئے فلم کے شوقین خود کر لیتے ہیں، یہ اور بات کہ ہال میں بیٹھے ہوؤں کا اندازہ، گیلری میں بیٹھے ہوؤں سے مختلف ہوتا ہے اور جو داخلی دروازے کی دھکم پیل میں ایک دوسرے کی قمیصوں، کرتوں پر غلطی سے پان کی پچکاریاں مار بیٹھتے ہیں، اُنھیں ابھی تک اندر کے ماحول کا اندازہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ٹکٹ اِس قدر بے رحمی سے ہاتھوں میں بھینچے ہوتے ہیں کہ گر گیا تو فرش پر جھک کر پکڑنے کا یارا کسے ہوگا، جھکیں گے تو ایک ریلا اُن کے اُوپر سے گزر جائے گا اور وہ بغیر فلم دیکھے دُنیا سے چلے جائیں گے۔

کوچوان، جیسے ایسے ہی کسی سوار کا منتظر ہوتا ہے، جس کا پاؤں پائیدان پر پڑتے ہی ہاتھ کا چابک لہرانے لگتا ہے۔ ٹرین کے فراٹوں کی جگہ گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دینے لگتی ہیں اور ساتھ ہی فلم کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے اور فلم بین اِس بات سے بے نیاز کہ ہیرو نے گھر پہنچنے تک کتنے سگریٹ پھونک ڈالے ہوں گے، ہیروئن کی انٹری کے لیے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں اِس کلاس کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک گروپ میں وہ طلبا اور طالبات شامل ہوں گے جو اِس کیس کو انتہائی ایمان داری کے ساتھ پزل گیم ثابت کریں گے اور دوسرے گروپ والوں کا کام یہ ہوگا کہ وہ پہلے والوں سے بڑھ کر ایمان کا مظاہرہ کرتے ہوئے اِس کے اندر سے فیچر فلم کا ابتدائی سین نکال کر لائیں اور سن وسال کی کڑیاں ملا ملا کر دلائل پیش کریں کہ ریل کے ڈبوں کی ترتیب سے کیا مراد ہے، بغچی والا شخص اگر واقعی خاموش تھا تو کیوں، اور اگر وہ ہجوم کے ساتھ مکالمہ کرتا تو بات کہاں سے شروع ہوتی۔ المختصر پہلے گروپ نے 'چال' پر کام کرنا ہے اور دوسرے نے 'آواز' پر اور تحقیق سے ثابت کرنا ہے کہ آج کے دور کی شناخت کیا ہے؛ حاضری یا غیاب؟ دست برداری یا معزولی؟

بات کچھ یوں ہے کہ ابھی کچھ دن پہلے شہر کے لوگوں کا تازہ شوشہ سامنے آیا ہے جسے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر خوب اچھالا جا رہا ہے۔ اُن سب کا یہ کہنا ہے کہ 'فصیل نما' کی ایک دیوار کو مسمار کر کے وہاں دروازہ لگا دینا چاہیے، بصورتِ دیگر وہ انسانی سروں کی سیڑھی بنا کر اندر کود جانے کا حق محفوظ رکھتے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجبور ہو جائیں گے کہ ایسی ہی ایک سیڑھی اندر سے باہر کی طرف بنانے کی منادی بھی کر دیں تا کہ وہ لوگ جنھیں کاندھوں پر چپلیوں سمیت الف ایسے آدمیوں کو

اٹھانے کا تجربہ ہے رابطہ کریں، تاہم سروں اور پنجوں کی مطلوبہ تعداد پوری نہ ہونے کی صورت میں ایک ہی سیڑھی کو دیوار کے دونوں طرف بھی استعمال کیا جاسکتا ہے؛ ایک بار زائرین کو باہر سے اندر لے جاتے ہوئے اور دوسری بار اندر سے باہر گلی کی راہ دکھاتے ہوئے۔ اگر ایسا ہوا تو دیوار پر ایک شخص کو تعینات کر دیا جائے گا کہ وہ اطراف میں مسافروں کی دوطرفہ آمد و رفت کو یقینی بنا سکے۔ یہ وہ شخص ہوگا جو کئی کئی دن تک بغیر کچھ کھائے پیے زندہ رہ سکے گا اور جسے طہارت خانے کی کوئی خاص پروانہ ہوگی۔ سورج اُس کی آنکھوں کی عین سیدھ میں پڑے یا سر کے اُوپر آ کھڑا ہو، اُسے کچھ نہ کہہ سکے گا، بارش اُس کے ساتھ دیرینہ ہمدموں کے مانند پیش آئے گی اور جب سردیوں کی صبحوں میں اوس کے قطرے اُس کی پلکوں سے ٹکرا کر 'فصیل نما' کے ساتھ رینگتے ہوئے نیچے گلی میں گریں گے تو تشت میں یوں اکٹھے کیے جاسکیں گے جیسے بغیر کسی خراش یا دڑاڑ کے چمکتے ہوئے موتی ہاتھ آ گئے ہوں۔ کسی نے اُن لوگوں کے کان بھرے ہیں کہ 'فصیل نما' محض آسمان کو چھوتی ہوئی چار دیواری کا نام نہیں، یہ اُن سب کی زندگی موت کا مسئلہ ہے، اُس کے اندر اُن کا آبائی قبرستان ہے، جہاں آج تک کوئی فاتحہ کہنے نہیں آیا، اِس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے! لوگوں کو پٹی پڑھانے والوں کا کہنا ہے کہ اگرچہ قطاروں میں سجی سجائی ایک جیسی وہ ساری قبریں سورہء فاتحہ کے نزول سے پہلے کی ہیں، جن کے سرھانوں پر نصب قیمتی پتھروں کی گولائی یا موٹائی سے شناخت کرنا مشکل ہے کہ لحد کس کس کی ہے اور کتبہ کس کس کا، مگر یہ بات ایمان کی حد تک درست مانی جاتی ہے کہ وہ مدفن غیر لوگوں کے نہیں، سارے کے سارے اُن کے اپنے لوگ ہیں کہ جب کارِ زمانہ سے اُکتا گئے اور نیند سے نڈھال اِدھر اُدھر گرنے لگے تو زیرِ زمین آرام کی غرض سے چلے گئے تھے اور اب منتظر ہیں کہ 'فصیل نما' مسمار ہو اور اُن کے بچھڑے ہوئے اُن سے آملیں، اُن سے باتیں کریں اور اندازہ ہو کہ جو زبان بولتے ہوئے اُن کے ڈیلے الٹ گئے تھے اور بھنویں کانپ کر ساکن ہوگئی تھیں، کیا اب بھی وہی زبان بولی جاتی ہے یا کوئی اور!

سامعین! اب تک کی گفتگو میں تین زمانوں کی شناخت ممکن ہوسکی ہے اور اگر دل پر ہاتھ رکھ کر سینے کی دھک دھک محسوس کی جائے تو زمانے ہیں ہی تین، جن کے نام ہیں، قبلِ آدم، آدم اور بعدِ آدم۔ خیال رہے کہ آخری زمانے کو غلطی سے قیامت یا قربِ قیامت کا زمانہ نہ سمجھ لیا جائے ورنہ سارے تھیسس کا ستیاناس ہوجائے گا اور سوسائٹی میں باتیں ہونے لگیں گی کہ زمانوں کی یہ تیسری شاخ کوئی نئی بات ہوتی تو مانتے بھی، ہر پھر کے یہ حساب کتاب ہی کا دن نکلا، ہاں ہاں کب تک کوئی بچ سکتا تھا میزان کے دو دھڑوں سے، آخر کو تو یہ جھولا جھولنا ہی پڑتا ہے!

ایک بار پھر سے گزارش ہے کہ بعدِ آدم کو سراسر نئی شروعات سمجھا جائے، آبادکاری پر اپنی رائے دینے سے گریز نہ کیا جائے، عینِ شرع اور خلافِ شرع معاملات پر اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے محنت کی جائے اور خدا اور عورت کی فراہم کی ہوئی آکسیجن سے سلنڈر بھر لیے جائیں، یہ آکسیجن اُس دور میں کام آئے گی کہ جو ہوتے ہوتے آپ کے اِتنا قریب آچکا ہے کہ اب اُس کا ہاتھ آپ کی کلائیوں پر ہے اور پرچھائیں جسموں پر پڑ رہی ہے۔ وہاں آپ کو خدا کی بھیجی ہوئی عورت سے واسطہ پڑے گا اور عورت کے بتائے ہوئے خدا کے ساتھ ملاقات ممکن ہوسکے گی۔

گھبرائیے نہیں، اِس گاؤن والے اور اُس کینٹین والے سمیت وہاں آپ کی سب سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ اِس

کلاس کے تربیت یافتہ ہونے کے ناتے دو زمانے دیکھ چکے، اب تیسرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا بسنے کی تیاری پکڑیے اور بوریا بستر باندھنے میں بال برابر چُوک اور ناخن برابر کاہلی سے بھی ہر لمحہ پناہ مانگتے رہیے۔

ہاں تو بات چل رہی تھی ٹریش کی اور دھیان تاریخ کی لامتناہیت یعنی شہر کی دو عمارتوں اور دو کرداروں کی طرف چلا گیا۔ یہاں آپ ایک سوال خود سے پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ پیش کار کے کاندھے پر بندوق رکھ کر چلائیں گے تو وہ آپ کو دوبارہ تاریخ کی سیر و سیاحت پر لے جائے گا، پھر ایک جگہ بٹھا کر کہے گا کہ دراصل سیر و سفر کے واقعاتی تسلسل میں رخنہ کوئی نئی بات نہیں۔ اب کے بھی پڑا اور یوں پڑا کہ سیاح جو شریکِ سفر تھے، اُنھیں مہم جوئی کا منصوبہ ترک کر کے گھروں کو لوٹنا پڑا؛ وہ رخنہ پرور ایسے دراندا ز تھے کہ اپنی مرضی چلانا چاہتے تھے، سب کے سب مارے گئے، سمجھ لیجیے کہ پیش کار بھی نہیں رہا۔۔۔ اِس لیے اُس سے پوچھنے کے بجائے جواب خود سے تلاش کیجے، مل جائے گا!

بات الجھ گئی نا؟ کیس سٹڈی سے 'چال' برآمد ہوئی نہ 'آواز'۔

پچھلی بار اِس کلاس میں ایک تجربہ کیا گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مٹی کے ایک بہت بڑے تودے کو میز پر رکھ کر چھت کا پنکھا پوری رفتار کے ساتھ چلا دیا گیا تھا۔ ہوا اِتنی تیز تھی کہ کلاس روم ڈسٹ سے بھر گیا اور آپ لوگ مہا گرد کے بادل نما گولوں کے اندر ماہر پیراکوں کی طرح پیرتے ہوئے باہر کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ آپ کو یوں بھاگتے دیکھ کر پروفیسر نے پیچھے سے آواز لگائی تھی، آواز جو کہ آپ کی اگلی اسائنمنٹ تھی۔ پوچھا یہ گیا تھا: ''اے میدان چھوڑ کر بھاگتے ہوئے گروہ کے لوگو، مٹی کے انسانو، ڈسٹ کو آنکھوں میں پڑتے دیکھ کر ایسی دوڑ کیوں لگا دی؟'' پروفیسر کے سوکھے ہوئے حلق کے ساتھ ڈسٹ بری طرح چپک رہی تھی، اور آپ کا تعاقب کرتی ہوئی آواز تھی کہ جیسے میز پر پڑے ہوئے تودے کے نیچے سے آ رہی ہو جس کا کچھ حصّہ بادلوں کی کثافت کو پاٹ کے آپ تک پہنچ رہا تھا: ''ایک ہفتے کا وقت ہے آپ کے پاس، اسائنمنٹ جمع کروانے کا''۔ موصولہ جوابات میں ایک جواب بہت دلچسپ نظر آیا ہے۔ جس کے مطابق جتنی پرانی تاریخ مٹی کی بتائی گئی ہے اُتنی ہی ڈسٹ کی قرار دی گئی ہے اور اصرار کیا گیا ہے کہ ایسا ہی تھا، مگر دونوں میں، یعنی مٹی اور ڈسٹ میں تہذیب کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ جواب میں کہا گیا ہے: یہی وجہ ہے کہ مٹی سے بنے آدمی کو اُس کے اپنے ہی اجزائے ترکیبی میں سے بعض اجزا نے تنگ کر رکھا ہے، یوں جیسے گھر کے بھیدی ہوں اور بلا اجازت آنا جانا چل رہا ہو، یہ شرم کیے بغیر کہ محرم کون ہے اور غیر محرم کون!

اُس طالب علم کے لیے تالیاں جس نے اڑتے ہوئے غبار کا آپ سب سے بڑھ کر تعاقب کیا اور یوں محرم اور غیر محرم سے متعلق اپنا نیا نظریہ پیش کرنے میں کامیاب ہوا۔

نصاب کے وہ لیکچرز جو اِس ہال کی چار دیواری میں دیے جانے تھے، بریک کے بعد مکمل ہو جائیں گے۔ اگلا لیکچر فیلڈ سے متعلق ہے جس میں اِن ڈور سرگرمیوں کو منسوخ کر کے آؤٹ ڈور ریہرسل کا مرحلہ درپیش ہے۔ منصوبہ ایک نئی قوم کو وجود عطا کرنے کا ہے اور لٹمس ٹیسٹ کے طور پر آپ یعنی موجودہ قوم کی آنکھ کی پتلی اور کان کے پردے کو استعمال کیا جانا ہے۔ پروفیسر کے نوٹس کے مطابق آپ سب کو کھلے میدانوں میں حدِ نظر تک پھیل جانے کا ٹاسک دیا جائے گا اور یہ کہا جائے گا کہ

ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کے لیے کوئی کسی کی طرف نہ دیکھے، ہم سفروں کو گفتگو کی حاجت ہو یا قافلے میں سے کسی کو آواز لگانے کا کہا جائے تو گردنیں اُوپر کی طرف اٹھی ہوئی ہوں، دھیان آسمان کی طرف ہو اور مخاطب زمین کی مخلوق ہو۔ یعنی اگر رول نمبر ا، رول نمبر ۲ کو بلائے تو رول نمبر ا کا دھیان انتہائی اُوپر کی طرف ہونا چاہیے، یہی شرط آواز سن کر جواب دینے والوں پر بھی عائد ہوتی ہے کہ کہنے کو تو وہ اپنے ساتھ چلنے والوں کی باتوں کا جواب دے رہے ہوں گے مگر آنکھیں آسمان پر ٹکی ہوئی ہوں گی، یعنی جب رول نمبر ۲، رول نمبر ا کے سوال کا جواب دے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں بلکہ اگر دن کا وقت ہو تو سورج کی کرنیں گنتے ہوئے اور اگر رات ہو تو تارے شمار کرتے ہوئے اپنے شریکِ سفر تک اپنی آواز اور تصویر پہنچانے پر کار بند ہوگا۔ لٹمس ٹیسٹ کی کامیابی تک آپ سب کو فیلڈ میں رہنا ہے اور واپسی کے لیے پروفیسر کے حکم کا انتظار کرنا ہے۔۔ لہٰذا اگلے لیکچر میں کھلے میدانوں کی تجربہ گاہ کا رُخ کیجے یہاں آنے کی ضرورت نہیں، پروفیسر آپ سے وہیں ملے گا۔

ارے یہ کیا؟ آپ لوگ تو ابھی سے گھڑیاں دیکھنے لگے۔ لگتا ہے کہ آپ لیکچر کے پینتالیس منٹ، لڑائی کے پچھتر برس بنا کر ہی دم لیں گے، اِس سے پہلے بریک نہیں لیں گے اور دوسری طرف کینٹین والا کڑاہی میں کرکڑاتے ہوئے تیل کے نیچے شعلے کو کم زیادہ کرتا آپ سب کا انتظار ہی کرتا رہے گا۔ آپ نہ گئے تو وہ پروفیسر کو کوسنے دے گا کہ یہ تو ہے ہی ایسا جو وقت بے وقت کلاس لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے، بولنے لگتا ہے تو رُکتا ہی نہیں، رُک جائے تو بولنے کا یاد نہیں رہتا؛ طالب علم بے چاروں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ بریک پروفیسر کی گفتگو کے دوران میں لینی چاہیے یا خاموشی کے دوران میں!!

☆

زاہد حسن

دردمندوں کا دیس

[نوتصنیف ناوّل کے چند باب]

(۱)

کچھ دنوں کے لے جو جیسے یہ میرے معمول کا حصہ بن گیا۔ میں نے شہر میں اپنی لاحاصل آوارگیوں کو خیر باد کہا۔ دوستوں کی محفلوں کو چھوڑ دیا۔ کام کاج کہ جو بھی ان دنوں کرنے کے لیے میسر تھا، وہاں سے فراغت حاصل کرتے ہی سیدھا گھر پہنچتا۔

وہ روز مجھے اپنے ماضی کا ایک واقعہ سنایا کرتی۔ جیسے جیسے زندگی سے موت کا فاصلہ قریب آتا جارہا تھا اس کی گفتگو میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں اور واقعات میں الجھاو پیدا ہونے لگا تھا۔ اس نے وہ ایک واقعہ بھی سنایا جو اس کی زندگی میں کم وبیش چالیس برس پہلے وقوع پذیر ہوا تھا۔ سردیوں کی یہ ایک طویل اور ٹھٹھرا کر مار دینے والی رات تھی۔ تمھارے باپ نے کسی ذراسی بات پر خفا ہو کر تمھاری ماں جو گھر سے نکال دیا اور اُس کے بچے بھی چھین لیے۔ ماں نے کچھ اس طرح سے بات شروع کی، جیسے اس کی اپنی نہیں، یہ محض میری کہانی ہو اور میں اس سے جدا ہوں، لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ بہت جلد ہی اپنے آپ کو اس کہانی میں شامل کر بھی لیا۔

''میں گھر کے پچھواڑے سخت سردی میں تڑپتی روتی، کُرلاتی رہی۔ اوپر سے بھری بھرائی آبادبستی، بازار سے کوئی آرہا ہے تو کوئی جارہا۔ اپنا آپ چھپانا محال ہوگیا۔ دیوار سے لگی دیوار کا ہی روپ دھارنے کے جتن میں۔۔۔ تمھارے دادا، دادی، چاچے، پھوپھیاں عرصہ ہوا ہم میاں، بیوی کے معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے اگر کوئی بیچ پڑ کر بیچ بچاؤ یا صلح صفائی کی کوشش کرتا تو بات زیادہ بگڑتی۔ عجیب مرنے نہ جی سکنے کی کیفیت ہوجاتی۔ ہمارے لڑائی جھگڑوں میں۔۔۔ ایک خیال یہ آئے کہ بستی سے دور کسی اجنبی راہ پر نکل پڑوں کھیتوں کی طرف، اجاڑ گہری فصلوں میں جلی جاؤں جہاں مجھے درندے چیر پھاڑ کھائیں۔ پھر بچوں کا خیال آتا۔ (اُس نے مجھ سے اپنے بچوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا گویا میں اُن میں شامل نہ ہوں، بلکہ میں محض ایک کہانی سننے والا، ان رشتوں، ناتوں کے پل سے دور کھڑا کوئی ''دوسرا'' ہوں۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ کچھ میں بھی ایسا ہی محسوس کرنے لگا تھا۔) ''تو میں بچوں کے بارے میں سوچتی تھی۔ ماں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں سمجھتی تھی کہ میرا شوہر، میری غیر موجودگی میں بچوں کا خیال نہیں رکھ سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان دنوں، جن دنوں کی میں تم سے بات کررہی ہوں، اسے اپنے بچوں کا ذرا برابر احساس نہیں تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر کسی بات پر بچے رودیں گے یا بھوک لگنے پر کچھ مانگیں گے، تو یہ غصے میں آکر انھیں جلتے چولھے میں پھینک دے گا۔ یقین جانو، اس سے کچھ بعید نہ تھا۔۔

لیکن عجیب بات یہ ہوئی۔'' ماں نے اپنی گفتگو میں ایک مختصر سا وقفہ دیتے ہوئے کہا اور پھر ایسے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے ایک آسودگی بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ظاہر ہونے لگی۔ ادھر وہ مجھے اندر بلانے کے ارادے سے باہر نکلا۔ ادھر میں گھر کے پچھواڑے کھلنے والی کھڑکی، کی طرف بڑھی۔ روتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ پھر ہنسنے لگے اور دیر تک ہنسے ہی چلے گئے۔ ہنسنے کے اس عمل میں ہم نے اپنے بچوں کو بھی شامل کرنا چاہا، جو ادھ سوئے، ادھ جگے خوفزدہ سے بستروں میں دبکے پڑے تھے۔ میں نے دیکھا۔ تمھارے سوئے ہوئے ہونٹوں پر بھی ''ورسی'' پھوٹنے لگی تھی۔ میں نے تیرے ساتھ لپٹ کر تجھے پیار کیا اور سونے کے لے تیرے ساتھ لپٹ گئی۔ (ماں، اپنی کہانی میں ایک بار پھر سے مجھے واپس لے آئی تھی۔) صبح، ہم خوشی کی اسی ہنسی کے ساتھ بیدار ہوئے جس کو پہلو میں لے کر سوئے تھے۔ ایسے جیسے نہ تو ہمارے درمیان کوئی تلخی پیدا ہوئی تھی نہ ہی کوئی رنج وغم۔ نہ ہی یخ بستہ رات میں، میں نے گھر کے پچھواڑے پہروں سسک اور تڑپ کر گزارے تھے ہاں تمھارے والد کے چہرے پر مجھے ندامت کی گہری لکیر ضرور محسوس ہوئی جو وقت کے ساتھ ساتھ مدھم پڑتی گئی۔

میرا اکیلا پن جو ماضی میں ماں کی موجودگی میں تخلیقی کرشموں کا، کارن بنتا، اس کی موت کے بعد اس نے کھوکھلے پن کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایسے جیسے کسی مضبوط تناور درخت میں ہدہد اپنی چونچ سے کھوکھل بنا دے جو بعد میں طرح طرح کے پرندوں کا بسیرا بن جائے۔ پرندے جنھیں درختوں کی کھوکھلی میں رہنے کی عادت ہوتی ہے۔

پہلے وہ میرے اکیلے کے ساتھ رہتی تھی۔ موت سے اسے بانٹ کر رکھ دیا تھا۔ برابر برابر طور پر بٹ کر اپنے تینوں بچوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور تینوں کے حصے میں پوری کی پوری آئی تھی۔ اپنی ذات صفات، روح، بدن، اپنی باتوں اور عادات سمیت۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ میں نے اس کے اپنے ساتھ ہونا دوسرے بھائی بہن سے بڑھ کر محسوس کیا۔ کچھ ویسا ہی، جیسا وہ جیتے جی مجھے احساس دلاتی تھی، بلکہ بعض اوقات تو اس کی موجودگی کا احساس ان جگہوں پر بھی ہوتا، جو اس کی زندگی میں اس کی ذات سے خالی رہتی تھیں۔ لیکن اب بھری بھری لگتیں۔ بعد میں مجھے محسوس ہوتا کہ دراصل ماں کی یادوں کے احساس کے کارن میرا ہونا، مجھے میرے ہونے سے کچھ بڑھ کر لگنے لگا ہے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے ناں کہ آپ ایک انسان کی غیر موجودگی میں بھی اس کی موجودگی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ اپنی ذات کے بھرپور احساس کو برقرار رکھتے ہوئے ماں اور میرے ساتھ کچھ ایسا بھی ہو رہا تھا۔ اس کے جیتے جی کمروں میں، صحن اور گلیاروں میں نظروں سے جھومتا خالی پن اب اس کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد بھرا بھرا سا لگتا۔ ماں کی ذات سے وابستہ اس سنجیدہ اور باوقار تقدس سمیت جو اپنے اندر ہمیشہ ناقابل شکست ارادوں کی گٹھڑی دھرے ہمارے سامنے موجود ہوتی۔۔ میں ان گنت سمے تک وقت کے کنارے پر دھرے اپنے وجود سے باہر نکل نکل کر اسے جھانکتا۔ کئی بار یہ سارا کچھ بہت پرلطف دکھائی دیتا اور کئی بار شدید لووں سے جھلسا اس کا پنجر سا وجود، دکھوں کے ساگر کے جیسے میرے سارے پر اپنی تند و تیز موجیں اچھال دیتا جس کے کارن آنے والے کتنے

ہی دنوں تک میرے اندر ایک کسمساہٹ۔ ایک اتھلا پن سا ہچکولے لیتا رہتا۔

(۲)

گھر کے انتہائی مشرق میں موجود کمرے میں ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہے جہاں باوجود کوشش کے ماں نے ہمیں اٹیچ باتھ نہیں بنانے دیا تھا جس کا خمیازہ بھی خود اسی کو بھگتنا پڑا۔ خاص طور پر زندگی کے آخری ایام میں۔ تاہم اس نے گھر بنوایا خوب یا پھر تقدیری ایسا بن گیا جیسا کہ وہ خود کہا کرتی تھی۔ آج بھی میں دنوں کی اس گزرگاہ پر پلٹ کر با آسانی دیکھ سکتا ہوں کہ وہ گھر کی تعمیر کے دوران میں دن رات ایک کیے رہی۔ کھانے کا ہوش نہ آرام کا خیال۔ مزدور اور مستری بھی کیا مشقت کرتے ہوں گے جو اسی نے کی۔ زرعی زمین کے چھوٹے سے قطعے پر بنا یہ گھر جس کی محض نیو ڈالنے کے لیے کتنے ٹرک ریت اور مٹی کی بھرتی کے ڈالے گئے۔ تب جا کر کہیں اس کی بنیاد، دیواریں اٹھانے کے قابل ہوئی۔ کہنا چاہیے ماں نے گھر کی بنیاد بھی اپنے ارادوں کی طرح سے مضبوط اور پختہ ڈالی۔ کمروں کی بناوٹ کچھ ایسی رکھی گئی کہ جب مشرق کی ہوا چلتی تو سارے گھر میں سے ہو کر گزرتی۔ ایسے جیسے گھر کے مکینوں سے احوال کرنے آئی ہو یا پھر گھر کے راز چرانے آئی ہو، پورے میں دھوپ بھی چھن چھن کر آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود گھر میں سیلن نام کو نہ تھی۔ اگو کوئی چیز سیل گئی تھی تو گھر کے اندر ماں کے چلنے پھرنے کا احساس، ہم اس کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ جہاں ماں نے غیر محسوس طور پر اپنا بسیرا کر لیا تھا جس کا احساس آج تک بھی موجود ہے گویا وہ ابھی کے ابھی اس کمرے سے نکلی ہو اور ابھی پلٹ کر داخل ہونے والی ہو۔ پرانے محلے میں کسی جان پہچان والی عورت سے ملنے گئی ہو۔ یہی ہے وہ احساس جس کے زیرِ اثر ہم اس کمرے میں کم کم ہی بیٹھتے ہیں۔۔۔ پھر اس کمرے میں بیٹھنے، اس میں رہنے کا ماں کا ایک اپنا ہی سلیقہ تھا۔ شاید ایک خاص طرح کی خوشبو کا اسیر ہو چلا تھا یہ کمرہ۔ لہٰذا ہم کوشش کرتے کہ اس میں کسی مہمان کو بھی کم ہی ٹھہرایا جائے کہ اس بیڈالماری اور ان مذہبی اور روحانی کتب پر جو اس کے زیرِ مطالعہ رہتیں اور آنکھوں کی روشنی کم پڑ جانے کے سبب جنھیں وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑے اپنی آنکھوں سے بہت زیادہ قریب لا کر پڑھنے کا جتن کرتی ان سب پر سے اس کا احساس اس کی خوشبو جھڑ نہ جائے۔۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے باتوں کی شروعات میں (جب بھی اس کے بارے میں باتیں ہوتیں) ماں کی شبیہ ہلکے اور نامعلوم رنگوں میں تشکیل پانے لگتی اور پھر یہی ہلکے ہلکے سے رنگ ہمارے اور اس کے مابین رشتے کی نوعیت کے باعث گوڑھے اور بامعنی ہوتے چلے جاتے۔ یوں ہوتا جیسے پہلے پہل کوئی مائع شئے تھی جو ہمارے خیالوں میں آتے ہی ٹھوس ہوتی چلی گئی ہو۔ اپنی نازک باریک تفصیلات کے ساتھ۔ اگرچہ اس کی ذات ہمارے بیانیوں کے پس منظر میں رہتی لیکن ایسے جیسے ہمارے سبھوں کے وجود اور روح پر چھائی، اپنے اثرات چھوڑتی ہوئی اپنی پوری گرفت کے ساتھ۔ جیسا اس کی زندگی تھا بالکل ویسا ہی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کا یہ حسین اور کارگر سانحہ ہمیں ریت کا بنا بنایا سا

لگنے لگا، ہم اسے دُور دُور ہی سے دیکھتے اور آہستہ سے باتیں کرتے۔ گویا اونچا بولنے سے بھی اس سانچے کے ڈھے جانے کا اندیشہ رہتا، ویسے ہی ہمارے تصورات سے تشکیل پایا ہوا ماں کا یہ سانچا، ہمیں بغور تکتا رہتا، چپ چاپ۔ احساس میں بے جان، بے بس، مجبور اور لاچار سا۔ جیسے کچھ کہنا کچھ بولنا چاہتا ہو لیکن کچھ کہہ بول نہ پاتا ہو۔!!''

سردیاں ہوتیں جسموں پہ کپکپی طاری کر دینے والی، دلوں کو دہلا دینے والی۔ دوپہریں ہوتیں گرمیوں سے بھری پڑی جن کی سائیں سائیں سے ہمارے کان بجتے۔ لوئیں جن دنوں میں خیالات تک کو جھلسا کر رکھ دیتیں ہم انھی دنوں میں اپنے ہم جولیوں کے گروہوں کے ساتھ باقی دوستوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے۔ جب تعداد پوری ہو جاتی تو پھر جنگلی کیکروں کی اوٹ میں بنٹوں، اخروٹوں سے یا پھر ٹوٹ جانے والی مٹی کے پکے برتنوں کی ٹھیکریوں سے کھیلتے۔ یونہی کاہلی اور سستی کی ماری مال بردار گاڑی کی طرح بچپن، وقت کی پٹڑی پر سرکتا آگے بڑھتا رہا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس بستی کی تعمیر پھولوں کے قطعوں سے کی گئی تھی، ہاں اس کے دو طرف ہرے بھرے باغات تھے۔ دُور دُور تک ہریالی تھی۔ جس کے بیچوں بیچ فصلیں لہراتی تھیں، قطار در قطار۔ پالتو جانوروں کے باڑے تھے جن سے وہ نکلتے تھے چراگاہوں کی جانب ڈھیروں ڈھیر۔ صبح شام پرندوں کے پرے کے پرے اُڑانیں بھرتے۔ بستی سے ہجرت کا عمل اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ اپنے سکوں کی کتابیں، والد کے ہاتھ کی ملنے والی واحد تحریر اور اس کی ایک اکیلی سیاہ وسفید تصویر اٹھانے کا وقت بھی نہیں ملا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اس بارے میں گمان تک نہ تھا کہ پھر بستی پلٹ کر آنے میں کتنے برس بیت جائیں گے۔ ایک اعلان ہوا کہ میرے ننھیال کے گاؤں جانے کے لیے بس تیار کھڑی ہے جو کچھ ہی لمحوں میں (ماضی میں بستیوں میں حالانکہ لمحوں پر محیط وقت بھی اتنی آہستگی کے ساتھ چلتا تھا ایسے، جیسے راستہ بھٹک کر خشکی پر چلا آنے والا کھچوا۔) لیکن بستی سے باہر نکلنے کی جلدی اور پھر ایسی صورت حال میں کہ جب ایک غیر متوقع موت کی خبر مل چکی ہو۔ چچا یوسف کی دعوت پر ننھیال گاؤں جانے والی اس بس میں چڑھنے کے لیے میں نے زمینوں سے بھینسوں کا دوہ کر لایا ہوا دودھ گھر کی دہلیز پر ہی رکھا۔ (دہلیز پر دھرے ان دودھ کے برتنوں کو بعد میں مہاجرت میں ناگفتہ بہ حالت میں علامتی طور پر برتا گیا اور ماں کے اچھے دنوں کو یاد کرتے ہوئے اس کی بستی میں دوپٹہ بدل کر بہنوں کے راستوں میں آئی عورتوں نے اپنے رونے اور بین کرنے میں اس کا خاص طور پر ذکر کیا۔۔۔) میں جس لباس میں دودھ دوہنے کے لیے زمینوں پر گیا تھا اسی میں تقریباً دوڑتے ہوئے بس کی طرف روانہ ہوا۔ میرے بیٹھتے ہی بس چل پڑی، ایسے جیسے میرے انتظار ہی میں ہو اور جیسا کہ بعد میں بعض زبانی شہادتوں سے پتا چلا، میرا انتظار کیا جا رہا تھا۔ ابھی ہم، میرے ننھیالی گاؤں سے کئی کوس دور تھے کہ گرمی اور سفر کی تھکاوٹ سے نڈھال مسافروں کی پیاس بجھانے کے لیے بس ستگھرہ اڈے پر ٹھہری۔ پانی پینے کے اس وقفے میں ہی، ہمارا سامنا زندگی کی علامتوں کو راستوں کے گرد وغبار سے مٹاتی خودکشی کی افواہ سے ہوا۔ میری پھوپھی جو میری

ممانی بھی تھی اس کی موت کا سندیس لے کر بس کے مسافر روانہ ہوئے تھے۔ سنگھر تک آتے آتے یہ سندیس خودکشی کی افواہ اور کچھ ہی لحظوں میں یہ قتل کے گھناؤنے اور خوف ناک عفریت کی شکل دھارنے والا تھا۔ ستگھرے سے بالا پیر، ملیاں والا اور شمال مشرق کو جو چک کی طرف بل کھاتی ہوئے نیم پختہ سڑک میرے سامنے سراب کا روپ دھارے اچھلتی، سنبھلتی، نہر پر بچھی پگڈنڈی کے ذریعے گاؤں تک چلی گئی تھی۔ ستگھرہ اڈے پر ہی بستی میں موت کی خبر لانے والے نائی کی سرگوشی کے معنی مجھ پر کھلے۔ تمھاری ماں نے آتے وقت مجھے تاکید کی تھی کہ تم ہر حالت میں وہاں پہنچو۔ ماں دو روز پہلے ہی بھائی اور بہن کے ساتھ وہاں پہنچی تھی۔ لیکن اس سب کا ماں کو معلوم تھا میں جانتا تھا نہ ہی موت کی خبر سن کر اجتماعی طور پر افسوس کرنے کے لیے گاؤں پہنچنے والوں میں سے کوئی دوسرا پیش بینی کر سکتا تھا کہ اس ناگہانی موت کے بیک وقت کتنی ہی زندگیوں پر پڑنے والے اثرات خوف، تعصب ، اخلاقی انحطاط، مہاجرت اور افلاس کی نمائش کرنے والے تھے اور کتنے ہی گہرے اور آپس میں مضبوط رشتوں ناتوں کو بات بے بات بہانے فراہم کرنے والے تھے کہ وہ دوسرے پر بھونکتے خوں خوار بھیڑیوں کی طرح جھپٹ پڑیں۔ ایک دوسرے کی تذلیل کر سکیں۔ اپنی بے بسی پر دوسروں کو قصوروار ٹھہرا سکیں اور دوسروں کی بے چارگی پر بے رحمانہ ہنسی ہنس سکیں۔

(۳)

ہم اپنے آپ سے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈر کیسا؟ مرئی اور بدہضمی کا شکار کر دینے والی اُن ضرورتوں کا جن کو ہمارے بے ڈھبے وجود اپنا ایندھن بنانے کے بعد یوں ڈکارتے ہیں، جیسے بچپن میں میرے خوابوں میں ہر وقت میرا پیچھا کرنے والا طاقت ور سانڈ، جو مجھے لامتناہی گرم ریتلے میدان میں دوڑا دوڑا کر ادھ موا کر دیتا۔

''تیرا صدقہ اتارنا واجب ہو گیا ہے میرے بچے خدا تجھے ارضی وسماوی آفات سے محفوظ رکھے۔'' خواب سُننے کے بعد ماں میرے سر پر جلتی ہوئی ثابت سرخ مرچوں کے سات سیدھے، سات الٹے پھیرے دیتی۔ اس دوران میں اپنا سانس بند کیے رکھتی، آخر میں پورے ماحول پر ماں کے ایک دم زور سے سانس لینے کی آواز اُبھرتی۔

میں سوچتا ہوں۔ ماں تیری کہانی کتنی پیچیدہ، کتنی غیر ہموار ہے مجھے کہنے میں اس قدر دقت ہو رہی ہے تجھے گزارنے میں کتنی مشکل آئی ہوگی۔ یہ اسلوب، ڈکشن، بیانیہ یہ سب تو لکھنے والوں کے محض جونچلے ہیں۔ جہاں خودکشی کو قتل بنا کر پیش کیا جانا ہو۔ سیدھے سادھے، سپاٹ، بنے بنائے اصولوں اور ضابطوں کے تحت ایف آئی آر کٹنی ہو محض دو سگریٹوں اور چائے کے ایک کپ کے پینے کے جتنے وقفے سے زیادہ کتنا وقت درکار ہوگا۔ تھانے کی زرد رنگ سے لپی جھڑتے ہوئے سیمنٹ کی قدیمی عمارت کے پچھواڑے چاہے تو تم دُور تک خشک اور کناروں سے کٹی ہوئی پگڈنڈی پر دیر تک گھورتے رہتے۔ کچھ سوچتے رہنے کے دوران اسے لکھ لو، یا جس طرح حالات و واقعات نے اسے ضابطے میں لایا ہو

لیکن تشدد کی وہ ترکیب اپناؤ جس میں آواز دیواروں کے اندر ہی گھٹ کر رہ جائے۔ گہری، گھور اندھیری شام تفتیش کے لیے بہترین سمے ہے۔ دُور کھیتوں میں محض چرند، پرند ہوتے ہیں یا پھر دیر سے لوٹنے والے دہقانوں کی ہاؤ ہو اور ان کے مویشیوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی آواز جو محض ان کی اپنی اُڑائی ہوئی دھول میں دب کر رہ جاتی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر اس روز میں بس میں سوار نہ ہو پاتا تو شاید حقیقی اور غیر حقیقی، ممکنہ اور غیر ممکنہ چناؤ نیوں، ہونیوں اور ان ہونیوں کے بارے میں تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا اور کبھی نہ جان پاتا کہ یہ دنیا ہی ہے جس کا جادو دنیا والوں کو حواس باختہ کیے رکھتا ہے۔ اپنے حواس میں نہ رہتے ہوئے بھی وہ دنیا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ماسوا پھوپھی جیسی معدود چند ہستیوں کے جو انسان کو حد سے زیادہ دیے گئے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہ آسانی سولی پر چڑھا لیتی ہیں۔ گرم دنوں کی دہلیز کی درزوں میں سے پھوٹتی ہوئی یہ کوئی شام تھی جو ملگجے اندھیرے میں گھر کے در و دیوار پھاند کر اندر آئی۔

(۴)

کتنے پہر گزر گئے بھرجائی کو حبس زدہ کمرے میں گئے۔ لوٹ کر نہیں آئی، دروازہ بھی بند کر رکھا ہے؟ ماں کے سرگوشی میں گونجتے اس سوال کی طرف پہلے پہل کسی نے توجہ نہیں کی۔ کتنا سمے اور بیت گیا، باتوں کے درمیان میں سے راستے بناتی ہوئی اوپر نیچے اترتی آ رہی باتیں جو بستیوں میں رشتوں کی راہداری پر چلتے اوس پڑنے تک طول پکڑی چلی جاتی ہیں۔ پھر اچانک ایک انجانے خوف سے بھرے احساس کے تحت سب جیسے جاگ گئے، فلک شیر اٹھا، اٹھ کر دروازے کے قریب گیا۔ اس نے دروازے کو چھوا تو اسے احساس ہوا کہ دروازہ اندر سے بھڑا ہوا ہے۔ نانی نے کئی بار کی دہرائی ہوئی بات ایک بار پھر دہرائی تھی۔ اب اس کے پاس اس ایک ہی واقعے کو نئے لہجوں میں آہیں اور سسکیاں بھر کے سنانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔

گھر بھر میں سے نرم اور پتلے ہاتھوں کی تلاش شروع ہوئی۔ خالہ بتانے لگتی۔ تاکہ اندر سے بھڑے کنڈے کو کھولا جا سکے، مجھے ایسے لگتا تھا کہ وہ ہاتھ میرے ہی ہیں جو گھر بھر پر پڑی آفت میں سے ہمیں نکال سکتے ہیں لیکن میں خاموش تھی، کہیں ایسا نہ ہو میرا دعویٰ عین وقت پر جھوٹا ثابت ہو جائے۔ حالاں کہ اس سے پہلے میں نے یہ کنڈا کئی بار کھولا تھا۔ میں جب گھر میں اکیلی ہوتی تو باتیں کرتے میں اچانک بھر جائی اندر چلی جاتی اور ایسے ہی جیسے آج اس نے اندر سے کنڈا بند کیا تھا۔ کر لیتی میں آوازیں دیتی رہ جاتی اور وہ سُنی ان سُنی کیے چارپائی پر اوندھی پڑی رہتی۔ میں دیر گئے تک درزوں میں سے جھانکتی رہتی اور پھر دل میں ایک انجانا سا ہول اٹھتا۔ میں ہاتھ تو مختلف زاویوں میں لچاتی اندر لے جاتی اور کنڈا کھول دیتی۔ کنڈا کھلتے ہی بھرجائی اُٹھ کر بیٹھ جاتی۔ بے روئے آنسوؤں سے بوجھل آنکھیں میرے من میں ایک عجیب سنسناہٹ سی پیدا کر

دیتیں۔ یہ شروع میں اس کے ساتھ نہیں تھا جب سے آخری بار میکے سے ہو کر آئی تھی تب سے کچھ ایسا ہو گیا تھا۔ بھائی سے بات کرتے ہوئے بھی بوجھل سی دکھائی دیتی۔ خالہ شروع سے آخر تک کہانی بیان کرتی چلی جاتی۔

''پھر شیر کے کہنے پر میں نے دروازے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی سب دیکھ رہے تھے، میرا ہاتھ کانپ رہا تھا اور کانپتے ہوئے دروازے کے دونوں پٹوں کی انیوں سے بچ رہا تھا۔ باجی نے میرا گٹ پکڑا، میں نے حوصلہ پیدا کیا۔ پھر جائی چھت پر برسوں پہلے کہ ڈالے ہوئے دیار کے شہتیر سے چارپائی کی ادوائن گلے میں ڈالے جھول رہی تھی۔۔۔ کتنی مشکل سے اُس کے بھاری وجود کو اُتار کر صحن میں بچھی چارپائی پر ڈالا گیا۔ گاؤں میں ایک اکیلے ڈاکٹر نے نبض چیک کرتے ہی بتا دیا۔ ''سانس بالکل نہیں آ رہی، میرا خیال ہے مر چکی ہیں۔'' میں نے ڈاکٹر کے ان لفظوں کو تنہائی میں کئی بار دہرایا یہ اتنے آسان نہیں تھے، جتنی آسانی کے ساتھ اس نے ہم سب کے سامنے ادا کر دیے۔ یہ لفظ ادا کرتے ہوئے خالہ کی گھگھی بندھ جایا کرتی۔ ابھی ستھر بچھا تھا، ابھی رونے کے دن تھے۔ موت اور موت کے حوالے پیدا ہونے والے طرح طرح کے سوالوں پر باتیں کرنا معمول کا حصہ ہی لگتا۔

لیکن میرے چچا اور اس کے ساتھ آئے بیسیوں لوگ عورت کی اس طرح کی حقیقت کو نہیں مانے۔ ''پوسٹ مارٹم ہوگا اور اگر اسے قتل کیا گیا ہے تو اس کا بدلہ لیا جائے گا، جو نہایت بھیانک ہوگا۔ لاش کو بس میں رکھتے ہوئے ہمارے دُور پار کے بھاری وجود والے رشتے دار کے یہ آخری الفاظ تھے جو اس طرح کی صورت حال میں جمع ہو جانے والے مجمع میں شامل جو آدمی نے سُنے اور پھر یہ کہتے ہوئے اور اپنے ہاتھ چہرے اور سینے پر جھلاتے ہوئے، گرمی کس قدر تیز ہے؛ ہر کوئی اپنے اپنے گھر جانے لگا۔ گاؤں کے لوگوں کا مصیبت کے وقت میں اس طرح کا رویہ عام تھا۔

چچا اور دوسرے مردوں کا پھوپھی کی ناگہانی اور غیر متوقع موت پر افسوس کی بجائے اپنے عزائم کے برملا اظہار کے بعد جسے وہاں موجود ہر انسان کی طرح میں نے بھی سُن لیا تھا۔ میں ماں کی کھوج میں گھر کے اندر داخل ہوا۔ وہ گھر کے شمال میں واقع کچی مٹی سے لپے مکان میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ موجود تھیں۔ اس کمرے میں ایک عرصہ سے نانی رہتی چلی آ رہی تھی۔ میں ماں کی طرف بڑھا۔ غم جو حالیہ موت نے دیا تھا اُس نے اور آنے والوں کے ارادوں نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ اُس کا کئی دنوں سے اَن دُھلا ماتمی لباس پسینے میں تر تھا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ ایک لحظے کے لیے مجھے لگا کہ میں ماں کو اس سفاک منظر نامے میں نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ میرے سامنے تو تیز پتی سے چائے بناتی اور اس میں اپنی یادوں اور باتوں کی شیرینی گھولتی، باسی روٹیوں کے ٹکڑوں کو پانی اور رابی گُڑ میں بھگو کر حلوہ بنا کر ہمیں کھلاتی۔ طرح طرح کے جتن کرتی، پسینے میں نڈھال اچانک یوں ہمارے پاس چلی آنے والی ماں تھی، جیسے آپ کمرے کی کھڑکی کھولیں اور سامنے سے سرسبز و شاداب وجود کے ساتھ ہنستی مسکراتی چلی آتی ہیں یا ایسی صورت حال میں بھی۔ میں یہ تصور کرتا تھا لیکن اس اچانک ٹوٹنے والی قیامت نے اسے روح تک

گھائل کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا پل کے پل میں اس کے کبھی نہ جھکنے والے کندھے، رونے اور مسلسل جگراتے کے باعث نمایاں تو تھے اس کے ماتھے پر پڑنے والی گول تہہ دار جھریوں اور موٹاپے کی طرح رجوع کرتے ہوئے سرخ وسفید وجود نے زندگی کے اس موڑ پر رونما ہونے والی تبدیلی اس پر کبھی نہ مٹنے والی تھکاوٹوں کے نشان چھوڑ رہی تھی۔ اس سب کا اظہار ابھی بھی ہوا لگتا تھا۔ اگر چہ زندگی کے ان سفاکانہ رویوں سے ماں کا سامنا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے طور پر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ یقین رکھتی ہے کہ پہلے ہی کی طرح یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ ہاں، شاید کچھ ایسے نقش ضرور چھوڑ جائے جنھیں زمانے کا کوئی مرہم بھر نہ سکے۔ میں سوچوں تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ ماضی میں کم از کم پانچ ایسے سانحے تو ضرور گزرے جب میں نے اسے ایسی ہی متغیر اور وجود کا رنگ تک تبدیل کر دینے والی حالت میں دیکھا اور ایک بار بھی میری طرف سے ادا ہونے والے تسلی کے بول اس کے لیے سنبھلنے کا باعث نہ بنے۔ پھر بھی اس پہلی بار سے لے کر جس کی اب یاد تک بھی اس کے ذہن سے مٹ چکی تھی۔ اُس نے اُن کے بارے میں سُننے پر خوشی کا اظہار نہ کیا۔ ان پانچ میں سے جب پہلا واقعہ رونما ہوا زندگی تب مستقل کی شاخ پر کھیلنے والے پھول کی مانند تھی۔ سب کچھ جنوں خیزی کی عبارت میں ٹنکے ہوئے استعاروں کی مانند لگتا۔ اس کے باوجود میں نے ہر بڑھتے ہوئے قدم پر سوچا اور ہر بار یہی فیصلہ کیا کہ مجھے ماں کے ساتھ ساتھ رہتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، اس کے ساتھ رہتا ہے اس کا ساتھ دینا ہے۔ تب وہ اس قدر تنہا لگتی کہ انسانی تنہائی کی ساری معنویتیں، سبھی تمثالیں اس کی ذات پر پورا اترتے دکھائی دیتیں۔ زندگی بھر زندگی کے بارے میں اس کے کیے فیصلوں کو مانتا ہے کہ اس کے ہر فیصلے کا محور و مرکز ہماری زندگی سے وابستہ ہے۔ اپنے بچوں کی زندگی سے اس کا کیا گیا ہر فیصلہ خاص طور پر ہمارے حوالے سے سچائی اور دیانت داری کا عکاس ہوتا ہے۔ بہ نسبت دوسرے افراد کے جو میرے اندر ماں کی ذات کے حوالے سے بدگمانی پیدا کرنے جیسی سعیِ لاحاصل میں لگے رہتے ہیں۔۔۔ ایسا بھی ہوتا کہ سفاکیت کی انگلیوں سے تشکیل پانے والے پنجے کے ماں کی طرف بڑھنے کے ساتھ ہی مجھے باپ کی یاد آئی جس کی ذات کے حوالے سے میں نے خواہ مخواہ ایک طرح کی زنگ لگی تہہ چڑھالی تھی۔ ایسا ہی سوچتا تھا۔ شاید ایسا نہ ہو۔ بلکہ یہ تہہ جسے میں نے اپنے طور پر زنگ لگی تہہ قرار دے رکھا ہے میرے کسی اپنے ہی احساس کی آئینہ دار ہو لیکن ہر بار سوچتے ہوئے میں اسے اپنے باپ کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں باپ کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی زندگی کے ہمیشہ ان دنوں کو ایک تصویر کے ذریعے یاد کرتا، جو موجود ہے اور فریم میں جڑی ہے، گھر میں اس سیاہ وسفید تصویر کے ہونے کے بارے میں مجھے ویسے ہی یقین تھا جیسا والد کے فوت ہو جانے کے بعد بستی کے جنوب مغرب میں واقع قبرستان میں آسودہ خاک ہونے کا۔ لیکن ہماری جبری مہاجرت کے بعد گھر کے دوسرے سامان ہی کی طرح اسے بھی کسی نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ بعد میں بڑے عرصہ اور بہت مشکلوں سے جب یہ تصویر دوبارہ ملی تو اس کا پچھلا حصہ زنگ سے پیلا پڑ گیا تھا اور یہی پیلا پن بعد میں ہمیشہ میری یادداشت میں زنگ لگی تہہ کی صورت میں محفوظ رہا۔ والد ایک دو بار جو میرے خوابوں میں آئے

تو تصویر پر پڑے اس پیلے رنگ کے سبب، خوابوں پر بھی وہ دھندلا پن جوں کا توں موجود تھا جو اس تصویر کی پشت پر تھا اور جس نے اب رفتہ رفتہ پوری تصویر پر پھیلنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سارا کچھ دھندلاہٹ میں ڈوبے ماضی کی طرح تھا۔ ان حبس زدہ راتوں میں آنے والے خوابوں میں بھی جب جولائی کی مسلسل بارشوں کے باعث بستی کا نظام کچھ ایسا بے ترتیب اور نشیب و فراز کا شکار ہو جاتا تھا۔ جیسے بستی کو چھوٹے چھوٹے تالابوں میں مٹی کے تختے اتار کے تعمیر کیا گیا ہو۔ حالاں کہ ایسے موسموں میں دکھائی دیے جانے والے خوابوں میں مجھے اڑنے کی صلاحیت بھی حاصل ہوتی اور اپنی منشا سے تشکیل دیئے ہوئے رنگوں سے خواب بننے کی بھی۔ لیکن ایسے میں بھی آنے والے اکثر خوابوں میں سامنے سے ماں ہی آتے ہوئے دکھائی دیتی۔ گھر کے مرکزی کمرے کی پشتی دیوار سے نقب لگا کر نکالے ہوئے دروازے سے، جس کے پٹ ہلکی لکڑی سے بنے ہوئے ہونے کے سبب ہمیشہ ٹیڑھے ہی رہتے یوں اگر ہم کسی طرح کنڈی چڑھا لیتے تو کھولنا مشکل ہو جاتا، ایسے ہی کھلی ہوئی کنڈی کو بھیڑنا۔ اس کڈھب طریقے سے بھیڑنے والے دروازے کے باعث والد کے بارے میں ڈھکے خوابوں کو باہر آنے کا رستہ نہ مل پاتا۔

ماں کے ساتھ پیش آنے والے پانچوں واقعات کے بارے میں آج سوچنا کیسا لگتا ہے۔ اس بارے میں بات کرنے سے زیادہ اچھا ہوگا کہ بیتے سمے میں خفتہ، ماں سے متعلق یادوں کو اُبھارا جائے۔ اگرچہ ماضی میں وہ جب بھی میرے سامنے آئی۔ ایک بیٹے کے طور پر کتنا عجیب سا لگتا ہے اس کے سامنے آنے کے بارے میں سوچنا پھر بھی کچھ پوچھتی ہے۔ کوئی بات کرتی ہے یا جھگڑے کے موڈ میں ہوتی۔ میں ہمیشہ یہ سوچ کر آگے بڑھ جاتا۔ بہت سی باتیں بہت سے معاملات اس سے کہنے، ان سب میں اس کو شریک کرنے کے لیے۔ کچھ بہتر کی فرصت درکار ہے سب کچھ کہہ دوں گا اور اُس سے ان سب کا حل لے لوں گا، لیکن آج عمر کے اس حصے میں آ کر بھی اسی سوال کا سامنا کرنا پڑا ہے، کہ کیا وہ کچھ پہر کی فرصت میسر آئی؟ یہاں تک کہ ان پانچوں سفاک واقعات کے بارے میں، جن کے وقوع پذیر ہوتے ہوئے مجھے اس کی صورت تک متنفر ہوتی دکھائی دی، اُس سے کُھل کر بات نہ ہونے پائی۔ وہ ان واقعات کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی یا نہیں۔ اس کے بارے میں منوانا، اسے تیار کرنا کیا مشکل تھا۔ آخر کو مان ہی جاتی، ماں ہی تو تھی۔

(۵)

اجنبی جگہیں اور اجنبی بستیاں تو رہیں ایک طرف، برسوں کی دیکھی بھالی، اپنے اوپر بھگتی اور جن میں ایک عمر گزار دی، وہ بستیاں بھی کس طرح تھوڑا سا سمے دُور رہنے پر آپ سے اپنا رخ بدل لیتی ہیں۔ دوبارہ ان میں جانے پر کچھ بھلا بھلا سا تو معلوم ہوتا ہے جیسے اُن سے کبھی واقفیت، کبھی آشنائی تو ضرور رہی ہو لیکن من میں اس طرح سے نہیں بسنے پاتیں جس طرح ان کو آپ کے اندر رچ بس جانا چاہیے۔ جن میں تمھاری آنول نال دبی ہوتی ہے۔ ایک بار پھر سے ان کو اپنے اندر بسانے کے لیے آپ وہاں سے ہٹتے ہیں تو کتنے ہی عرصہ کے لیے یہ کس قدر منہ موڑے رکھتی ہیں پرے پرے سے۔

بارِدگر آشنائی پیدا کرنے سے جھجکتی رہتی ہیں۔ آخر کار آہستہ آہستہ اپنے تلووں پنڈلیوں، پیٹ اور سینے کے راستے آپ کے دماغ تک رسائی تو ضرور حاصل کر لیں گی۔ لیکن آشنائی کا رچاؤ۔ روح میں رچنے کے لیے اور وقت چاہے گا اور آپ کو یہ وقت دینا ہی پڑے گا۔ زندگی میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں جن کے بارے میں یاد کرتے ہوئے سارا کچھ آنکھوں کے سامنے لرزتے ہوئے سراب کے جیسا لگتا ہے۔ ایسے، جیسے اس سارے کا حقیقت سے دُور دُور تک کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ یہ سارا کچھ تمھارے خوابوں میں وقوع پذیر ہوا ہو۔ ماں کے ساتھ بھی کچھ ایسے ہی ہوا۔ ہمارے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اس کی یادداشت سے سرک کر ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ تب میں بہت چھوٹا تھا۔ چھوٹا بھائی ابھی پیدا ہوا تھا یا نہیں کچھ کہہ نہیں سکتا، ہاں، اگر وہ پیدا ہو چکا ہوتا تو اسے ہمارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اس گرودوپہر میں جب ہم تارکول کو بنی نئی سڑک پر دوپہر میں جھلستے چلے گئے۔ بہت آگے جا کر ہم سے ایک شخص ملا جو یقیناً ہماری بستی کا کوئی دردمند انسان تھا۔ اس کے پاس ایک بائیسکل تھی۔ اس نے ہمیں ایک نہر کے پل پر چھوڑا، جہاں سے گزر کے ہم ایک کھٹارا لاری کے ذریعے دریائے راوی سے ماڑی پتن پل پر پہنچے۔ پل جو کشتیوں کو ترتیب سے باندھ کر بنایا گیا تھا۔ لیکن نامعلوم اس پل پر سے آنا جانا کس لیے بند تھا۔ کشتی کے ذریعے دریا پار کرنے کے بعد ہم اپنے ننھیالی گاؤں پہنچے۔ وہاں پہنچنے کی وجہ ہمیشہ کی طرح باپ کا ماں سے جھگڑا ہی تھا،..... بعد میں نہر کا یہ پل ایک بار میرے خواب میں بھی آیا۔ سوکھا سوکھا سا۔ سارے میں کٹی ہوئی جھاڑیاں، کپڑوں کی کٹی پھٹی درزیں، سوکھے ڈنٹھل، چھوٹے موٹے رینگتے کیڑے مکوڑے اور سانپوں کی اتاری ہوئی ''کینچ'' پڑی تھی۔ خواب میں خشک پڑتی اس نہر کے پل پر سے گزرنے کے واقعہ کے بارے میں، میں نے ماں سے کئی بار پوچھا لیکن کہانی سنانے کے ہر مرحلے کے دوران ماں نے اس واقعہ کے بارے میں ہمیشہ سوچنے کی کوشش کی اور ہمیشہ سر کو منفی میں جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''دوپہر کو سڑک پر پھسلتے پھسلتے سراب میں ہمارے جانے کا ایسا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس واقعہ کے بارے میں بالکل بھول چکی ہیں جب کہ میرے ذہن کی سلیٹ پر یہ واقعہ کندہ ہو چکا ہے، لیکن یہ سوال میرے ذہن میں ضرور اُبھرتا کہ ہمیشہ اس واقعہ کو باطل ثابت کرنے کے لیے جب وہ سوچنے لگی تھی تو اس کا رنگ پھیکا کیوں پڑ جاتا تھا۔ آج بھی ویسے کا ویسا اپنے اندر خوف کی پرچھائیوں سا لرزتا ہوا یہ واقعہ میرے سامنے کئی بار وقوع پذیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ شاید ماں کا اس سے جڑا ہوا خوف میرے وجود تک پھیل آیا ہے۔

☆

محمد شیراز دستی

ساسا

[نوتصنیف ناول کے دو باب]

(۱)

میرے گاؤں کے آج کل کے بچے تو خیر اپنے اسمارٹ فونوں کی طرح خاصے تیز ہوتے ہیں مگر جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو اس قدر سادے تھے کہ گُڑ دے کر گُو ہا لے آتے تھے۔

موسمِ بہار کے ایک دن ماسٹر جی کہیں سے ایک ہفتے کا کوئی کورس کر کے واپس آئے تو ہم سب کو اسکول کے گراؤنڈ میں لے گئے۔ ہم حسبِ اُصول قد کی ترتیب سے پروئی ہوئی ایک قطار میں جُڑ گئے تو کہنے لگے: ''ارے بچو، سنو آج ہم ایک کھیل کھیلیں گے۔'' کھیل کا ذکر سنتے ہی میرا دِل کِھل اُٹھا۔ ''اِس کا عنوان ہے 'تلاشِ گم شدہ'۔ ہمارے گاؤں کی تیس پینتیس چیزیں گم ہوگئی ہیں۔ ان سب کے نام ان پرچیوں پر لکھے ہوئے ہیں۔'' اُنہوں نے بُھربُھری زمین پر پڑے ایک ڈِبے کی طرف اشارہ کیا جس میں قرعہ اندازی کے لیے تیار رنگ برنگی پرچیاں لپٹی پڑی تھیں۔ ''باری باری سب ایک ایک پرچی اٹھائیے اور اس پر لکھی چیز ہمیں بتاتے جائیے تاکہ ہم اپنے پاس درج کر لیں۔'' اُنہوں نے واسکٹ کی جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکالتے ہوئے کہا۔ ''پھر جائیے اور آدھی چھٹی سے پہلے پہلے اپنے ذمے کی چیز کا پتہ ڈھونڈ لائیے۔ شاباش، شاباش۔''

سب سے پہلی باری سب سے چھوٹے قد کے مالک سادے کی تھی؛ مَیں سب سے آخر میں کھڑا بے صبری سے اپنی باری کا منتظر تھا۔ کسی پرچی پر 'نیکی' لکھا تھا تو کسی پر 'سکون'، کسی پر 'غیرت' تو کسی پر 'تمیز'۔ سب نے ایک ایک پرچی اٹھالی۔

میری باری آئی تو ڈِبے میں نیلے رنگ کی ایک ہی پرچی رہ گئی تھی جس پر مدھم سی روشنائی سے لکھا تھا:

''محبت!''

اپنے اپنے حصے کی پرچی اٹھا کر سب بچے اسکول سے باہر آ گئے۔ کچھ کھیتوں کی طرف چلے گئے اور کچھ گاؤں کو، تاکہ جا کر لوگوں سے پوچھیں کہ انھیں یہ گم شدہ چیزیں کدھر سے ملیں گی۔

اب تو خیر میں اس موضوع پر ایک جملہ بھی کہوں تو مکتبِ محبت کا نصاب ٹھہرے مگر چوتھی جماعت میں محبت مجھے شفقت اور عنایت وغیرہ کی کوئی بہن بھرجائی لگ رہی تھی۔ شاید لاشعوری پن کے اسی بچے نے میرا رخ کھیتوں کے بجائے

گاؤں کی طرف موڑ دیا جس کی باگ ڈور دن کے اس پہر کو خواتین کے ہاتھ ہوا کرتی تھی۔ بھاگتا بھاگتا میں گاؤں کی چوڑی گلی میں آ گیا جو ہر آنے جانے والے کا سایہ اُس کے پیچھے سمیٹتی جا رہی تھی۔

''چچی آپ نے محبت تو نہیں دیکھی؟'' میں نے ایک عورت سے پوچھا جو گھر کی ڈیوڑھی سے باہر جھانک کر نہیں معلوم کیا دیکھنے آئی تھی۔ میرے سوال پر جھنجھلا کر اس نے پہلے تو دونوں ہاتھوں کے پنجوں سے لعنت کھول کر مجھ پر تنی اور پھر یوں جلدی سے پلٹ گئی جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

میں آگے بڑھا تو ایک بڑھیا بالن کے لیے خشک لکڑیوں کی ایک گٹھڑی بائیں بغل میں دبائے، اونچی اونچی آواز میں گلی کے فرش پر لگے جوتوں کے نشانوں سے باتیں اور دائیں ہاتھ سے اشارے کرتی ہولے ہولے چلتی آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے پوچھا: ''دادی، آپ نے محبت کو دیکھا ہے؟''

''کیا آ آ آ آ؟'' بڑھیا نے کان پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں کہا۔

''محبت کہاں ہے محبت؟''

''کچھ جان ہو تو اُونچا بول سکو۔ کیا کہتے ہو خبر نہیں۔'' بڑھیا نے اونچی آواز میں کہا اور چل دی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ دو تین قدم تو بڑھیا کو میری اس ہم سفری کی خبر نہ ہوئی مگر پھر میں اس کے آگے آیا تو وہ ڈر سی گئی۔

''کیوں پیچھے پڑ گئے ہو؟؟'' اُس نے دادیا کے کہا۔

''محبت کدھر ہے محبت؟۔۔۔ محبت کدھر ہے محبت؟۔۔۔ محبت کدھر ہے محبت؟۔۔۔'' میں نے تین چار بار بڑھیا کے کانوں کی طرف اچھل اچھل کر کہا تو ارد گرد کی دیواروں پر عورتوں کے سر یوں اُگ آئے جیسے صورِ اسرافیل پھونک دیا گیا ہو۔

''بکریاں کھول گئے، کیوں ں ں ں ں ں؟'' بڑھیا نے جو سمجھا اسی کا جواب دے دیا۔

وہاں سے ذرا آگے منزہ کے دادا کی بیٹھک تھی۔ وہ برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھے، حقے کو اپنے پاؤں کی قینچی میں پھنسائے کش لگانے میں یوں مگن تھے جیسے دنیا فتح کر کے بیٹھے ہوں اور یہ حقہ نہیں مالِ غنیمت میں آئی باندی ہو۔ ان سے بات کرتے ہوئے میں ہمیشہ دوہرے خوف کا شکار ہوتا تھا۔ کچھ تو ان کا اپنا ڈر اور کچھ ابو جی کا۔ منزہ کے دادا پہلے کھُسہ استعمال کرتے۔ لگ جاتا تو ٹھیک، چُوک جاتا تو سیدھے جا کر ابو جی سے شکایت کرتے اور ابو جی ان کی شکایت پر اتنے سیخ پا ہوتے کہ کم از کم دو تین دن تک مجھ سے کلام نہ کرتے۔ اٹھتے بیٹھتے امی جی کو سناتے رہتے: ''اپنے شہزادے کو سمجھاتی کیوں نہیں۔ ملک شمشیر علی پھر آئے ہیں ہمارے در پہ۔ اور تھوڑے بچے ہیں اس گاؤں میں کھیل کود کے لیے؟ علی کے ساتھ لڑائیاں اور پرائی دھی کے ساتھ دوستیاں۔۔۔''

''دادا مجھے محبت کہاں سے ملے گی؟'' میں نے جملہ یوں جلدی سے بولا جیسے لوگ آج کل قیام میں فاتحہ پڑھتے

ہیں۔

''ہائیں؟'' منزہ کے دادا نے گرج کر کہا۔ غصے میں دونوں ہاتھوں سے چارپائی کو پکڑا، حقہ گر کر زمین پر پڑے دو کھسوں کے درمیان جا بیٹھا۔ آنکھیں یوں باہر آئیں کہ مجھے لگا ابھی ان کی گھنی سیاہ بھوؤں کی کمان سے چھوٹ کر میرے ماتھے پہ آ لگیں گی۔

''محبت؟'' اُن کی آواز مجھے اپنے پیچھے والی دیوار سے آتی سنائی دی۔ ''میں نے پہلے ہی کہا تھا سکینہ سے کہ منزہ کو اس اُوباش سے دور رکھ۔ ابھی دیتا ہوں تجھے محبت۔۔۔ رک میں تیرے وات میں دیتا ہوں محبت۔۔۔ ٹھہر میں تیری نانی کی دھوتی میں بجاتا ہوں محبت کا ڈھول.....'' اسی طرح کی کچھ اور چیزیں کرنے کا عہد کرتے ہوئے وہ اٹھے، کھسہ اٹھایا، میرے پیچھے دوڑے اور پھر میرا نشانہ باندھ کر دے مارا.....

کُھسہ میرے کندھے کو چھوتا ہوا میرے سامنے جا گرا۔ میں نے جھوٹ موٹ کی اُوئی اُوئی تو کی مگر شکر ہے کہ کھسہ چھپاک کر کے بھی نہیں لگا کہ تلاشِ محبت کا مشن نامکمل چھوڑنا پڑتا اور سرے سے میل دور بھی نہیں گزرا کہ منزہ کے دادا میری شکایت لگا سکتے۔

اسی طرح کے دو چار اور بُجے، کھسے اور گالیاں وغیرہ کھا کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محبت کو ڈھونڈنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ سو گاؤں سے خالی ہاتھ واپس اسکول کو چل دیا۔ اب مجھے قطار میں سب سے آگے کھڑے سادہ کے نصیب پر رشک آ رہا تھا جس کی پرچی پر 'نیکی' لکھا ہوا تھا۔ اُس پانچ وقت کے نمازی سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ نیکی کدھر ہے۔

میں ہانپتا کانپتا واپس اسکول پہنچا تو آدھی چھٹی کی گھنٹی بج رہی تھی اور بچے قطار میں اپنے قد مِلا رہے تھے۔ بے دِلے قدم اٹھاتا مَیں گراؤنڈ میں داخل ہوا اور جا کر قطار کو مکمل کیا۔

''ہاں بھئی بتایئے پھر مل گئیں سب گم شدہ متاعیں؟'' ماسٹر جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جی ماسٹر جی'' تقریباً سبھی نے جوش سے کہا۔ ''شاباش، شاباش''، ماسٹر جی نے ستائش کی، ناموں والی فہرست کھولی اور ایک ایک سے پوچھنے لگے:

''سادہ، نیکی کہاں ہے؟''

سادہ کا نام تو محمد صادق تھا مگر گاؤں والے اسے سادہ سادہ کہتے تھے، جو اس کی غریبی پہ یوں جچا کہ مٹیالے رنگ کی اکلوتی قمیص کی طرح اس کی جلد سے چپک کر رہ گیا۔

''استاد جی، مسجد میں۔'' سادہ نے فوراً کہا۔

''شاباش میرا لائق بچہ! اظہر، آپ کو سکون ملا؟''

''جی ماسٹر جی، مل گیا۔ وہ مدینے پاک میں ہے، ماسٹر جی۔''

''شاباش!! وقار، پیسہ کہاں ہے؟''

''بینکوں میں ہے، اُستا جی۔'' وقار نے 'اُستاد' کی 'د' کھا کر کہا۔

''اور تمیز؟''

''عورتوں میں۔'' نزلے موچی نے چھینک کی سی تیزی سے کہا۔

''اور غیرت'' ماسٹر جی نے اختر سے پوچھا۔

''مردوں میں، استاد جی، مردوں میں۔''

''اور علی میاں، انڈیا؟''

''تتی خانے میں، ماسٹر جی۔'' علی نے اپنی توتلی زبان میں 'ٹ' 'ت' بنا کر کہا۔

''اور محبت، سلیم میاں؟'' انھوں نے یوں گرج کر کہا کہ جیسے پوری فہرست میں سب سے سنجیدہ سوال یہی ہو۔

''منزہ کے دادا کے کھسے میں'' میرے منہ سے نکلا۔

یہ فضول جواب اگر کسی اور نے دیا ہوتا تو آدھی چھٹی ختم ہونے سے پہلے ماسٹر جی کی سزاؤں کا جلاد بشکو نائی اس کے سر پر استرا پھیر چکا ہوتا۔ مگر میرے ساتھ ماسٹر جی نے روایتی نرم دلی برتی اور بچوں کے ساتھ ہنس دیے، پھر کہنے لگے:

''سلیم میاں، اب کیا ہوا؟ سبق تو فرفر یاد ہوتا ہے۔۔۔ چلیے کوئی بات نہیں، سردار صاحب سے پوچھ کر آیئے گا کل۔''

ماسٹر جی تقسیمِ ہند کے مسافر تھے۔ ان کے والدین انہیں مرغیوں والے ڈربے میں بٹھا کر کسی دور دراز کے شہر سے ہجرت کر کے ڈیرہ غازی خان لا رہے تھے کہ خُود لقمۂ فساد ہو گئے، تاہم ان کا ڈربہ کسی طرح منزل تک پہنچ گیا اور ماسٹر جی در در کی ٹھوکریں کھاتے جوان ہو گئے۔ وہ ہجرت کی داستان سناتے تو آواز بدل جاتی۔ راستے کے مظالم کا نقشہ کھینچتے تو ہم رو دیتے۔ ہمارے اسکول میں ماسٹر لگ کر آئے تو انھیں ہمارا گاؤں بہت اچھا لگا۔ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ابو جی نے انھیں گھر بنانے کے لیے زمین دے دی۔ اس پر مکان بنانے کا ارادہ باندھا تو گاؤں والوں نے چند ہی دنوں میں دیواریں اُسار دیں۔ جوش میں آ کر منزہ کے دادا نے ٹی آر رگارڈر منگوا کے چھتیں ڈلوا دیں اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے ان کا مکان مکمل ہو گیا۔ سرکاری نوکری اور نیا مکان ہو تو شادی انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ یہی دو چیزیں دیکھ کے ساتھ والے گاؤں سے کسی نے ماسٹر جی کو لڑکی دے دی، اور مکان گھر ہو گیا۔

''بل کہ سردار صاحب سے مت پوچھیے گا، خود ڈھونڈتے رہیے۔ کبھی مل جائے تو ہمیں آ کے بتانا ضرور کہ کہاں

ہے محبت!''

''جی ماسٹر جی،''میں نے آہستہ سے کہا۔

ماسٹر جی نے ایک مرتبہ پھر سب بچوں کو''شاباش، شاباش'' کہا اور چلے گئے۔آدھی چھٹی کا وقت ختم ہونے کو تھا مگر وقت کے حساب سے بے نیاز سب بچے اودھم مچانے کے لیے میدان کو بھاگ گئے۔میں قمیص کا پچھلا پلو گود میں ڈال کر وہیں زمین پہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا اور خود سے ایک وعدہ کیا۔یہ وعدہ ایسا ہی تھا جیسا اُس وقت کے بچے کرتے تھے۔'کچھ بھی ہو اپنی بستی کی اس گمشدہ چیز کو ڈھونڈ لاؤں گا۔مجھے محبت کو ڈھونڈنا ہے۔ماسٹر جی کی شاباش لینی ہے۔۔۔۔'

(۲)

میری یونی ورسٹی میں سمسٹر بریک کا آغاز ہوتے ہی طلبہ کے The Skies نامی ہاسٹل کے پچاس میں سے کوئی چالیس سے زائد رہائشی دوسری ریاستوں یا ملکوں میں چھٹیاں گزارنے چلے گئے تھے۔کوئی MIT میں نوم چومسکی کے ساتھ تصویر کھنچوانے کے شوق میں تو کوئی لاس اینجلس میں ایما واٹسن سے ہاتھ ملانے کی خواہش میں، کوئی فلوریڈا میں ڈزنی لینڈ دیکھنے تو کوئی آئیوا میں یوگا کی ورک شاپ میں شریک ہونے۔کوئی یورپ گھومنے تو کوئی جنوبی امریکا۔جو بچ رہے ان میں سے چار پانچ نے تو بولڈر شہر کے مضافات میں بلند و بالا پہاڑی سلسلے Rocky Mountains پر کیمپنگ کی منصوبہ بندی کر لی اور وہ ایک دن منہ اندھیرے روانہ ہو گئے۔فلپینی کنگ میڈی کو فیکٹری نما باورچی خانے سے فراغت ملی تو وہ اپنے ٹونی کے ساتھ اس قدر مشغول ہوئی کہ اسے باقی کے چھ سات لوگوں کا کھانا بنانا جیسے یاد ہی نہ رہا۔ویسے بھی ان چھ سات لوگوں میں سے ایک اپنے بوائے فرینڈ کو بولڈر اور مضافات کے ریستورانوں سے متعارف کرانے میں مصروف تھی۔دوسری، صبح ہوتے ہی جوگنگ کرتی تین چار میل دور اپنی ماں کے گھر پہنچ جاتی اور اس کے بقول چوں کہ اس کی ماں کا نیا خصم کام کے لیے''دفع'' ہو چکا ہوتا ہے لہٰذا اسے وہاں کھانے پینے، نہانے دھونے اور کبھی کبھی کچھ دیر سونے کا بھی موقع مل جاتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ The Skies میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔میڈی کے کُتے ٹونی کے علاوہ اینا اور اس کی بہترین دوست جینی بھی پیچھے رہ جانے والوں میں شامل تھیں۔

☆

میں کارنر روم کے انتہائی گداز صوفے پر دونوں بازو پھیلائے مخمور آنکھوں سے اسکرین پر ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا۔صوفہ تو نرم و گداز سا تھا ہی مگر میرے دائیں طرف بیٹھی جینی بھی کسی طور کم نہیں تھی۔بائیں طرف اینا جو میرے ہاتھ کو مسلسل سہلا رہی تھی، اس قدر قریب بیٹھی تھی کہ اگر آج میرے بچپن کے ماسٹر جی کہیں سے آ کر دیکھ لیتے تو میرے ساتھ تمام تر

نرمیوں کے باوجود فوراً بشکو نائی کو بلوا کر مجھے گنجا کروا دیتے۔۔۔اور اگر خود بشکو دیکھ لیتا تو یقیناً پاگل ہو جاتا، اپنے ہی سر پہ استرا پھیر لیتا۔حالاں کہ ایسا ویسا تھا کچھ نہیں۔خالی ایک ٹانگ دوسرے کی ٹانگ پر رکھ لینے سے کوئی کسی کی گود میں تھوڑی بیٹھا ہوتا ہے۔

اگرچہ میں اپنی پسندیدہ فلم Vertical Limit کے سحر میں تھا پھر بھی اخلاقی ذمہ داری کا پاس رکھنے کے لیے وقفے وقفے سے دائیں اور بائیں ہاتھ سے دوشیزاؤں کے کندھوں کے گول گول کونوں کو ہلکے ہلکے تھپک دیتا تھا۔فلم کے بیشتر مناظر پاکستان کے تھے جو بار بار مجھے وہیں پہنچا دیتے۔ایک بار مروتاً میں نے اینا کے ہاتھ پر ذرا سا بوسہ دیا تو پہلے مجھے اپنا گاؤں یاد آیا۔پھر ابو جی کے گھوڑے اور پھر اُن کی لگام۔

مجھے امریکا آئے تقریباً دس ماہ گزر چکے تھے اور میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ بھی آ رہا تھا۔ایم اے انگریزی کے دو سمسٹر ہو گئے تھے، اینا مل چکی تھی، میرے مضامین پاکستان کے انگریزی اخبار اور جرائد میں چھپنے لگے تھے اور گاڑی تو یہاں پہنچتے ساتھ ہی میں نے لے لی تھی۔تاہم اب بھی جس کو جی بھر جانا بولتے ہیں ناوہ رَجا ہوا احساس نہیں آیا تھا۔ سوا بھی توبہ نہیں کی تھی۔ مجھے وطن کی یاد آتی تو تھی مگر ستاتی نہیں تھی۔ میرا واپس جانے کو من نہیں تھا۔ American Dream ادھورا تھا۔میری Vertical Limit کی حدا بھی نہیں آئی تھی۔

فلم کے ایک سین میں ایک پاکستانی فوجی، بھارتیوں کو جگانے کی پدرانہ ذمہ داری نبھانے کا عہد کر کے سینہ تانے پہاڑی کے کنارے پر لگی مشین گن کی طرف گیا تو اس حُسنِ کارکردگی پر داد وصولنے کے لیے میں نے دائیں دیکھا۔ جینی میرے جوان کو دیکھنے کے بجائے سامنے میز پر رکھے اپنے گلاس کو گھور رہی تھی۔جس میں ریڈ وائن کا ایک گھونٹ ابھی باقی تھا۔

"Hey, chin up, Jenny."

میں نے اس کے سر پر ٹھوڑی رگڑتے ہوئے کہا۔

"I can't, Saleem. I'm hurt. I'm feeling guilty..."

یہ کہتے کہتے اس نے سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

"You don't have to. That asshole dumped you, you didn't dump the mother fucker."

اینا نے تند لہجے اور اپنی مغلظ زبان میں جینی اور ڈیو کی علیحدگی کا ذمہ دار ڈیو کو ٹھہراتے ہوئے کہا۔

جینی نے خاموشی سے آگے بڑھ کر گلاس اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔لیکن اس سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔آنسو اس

کی آنکھوں میں یوں اُمڈ آئے جیسے ان میں ابھی شہد سے تر سلائی پھیری ہو۔اس نے سامنے میز پر سے ٹیڈی بیئر اٹھایا اور اس کے ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ پھر 'آئی ایم سوری' کہہ کر ٹیڈی بیئر کو سینے سے لگائے وہاں سے اٹھی اور بالائی منزل پر اپنے کمرے کو چلی گئی۔

فلم ختم ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا مگر اینا تو جیسے جینی کے جانے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔

--☆--

اینا مجھے The Skies کے ڈائننگ ہال میں یوں مل گئی تھی جیسے کسی انتہائی غریب بچے کو یک مشت سو کا نوٹ مل جائے، اور وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر اسے اچک تو لے مگر پھر یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتا رہے کہ اسے کب، کہاں اور کیسے خرچ کرے؟

اُس خوش قسمت روز، میں یونی ورسٹی سے واپس ہاسٹل آیا تو حسبِ معمول پُول ٹیبل پر گیا اور اسٹک اٹھا کر بالز کو ہولز میں ڈالنے کی مشق کرنے لگا۔ زمان اور مکان کے اُس تراشیدہ سنگم پر میرا بایاں ہاتھ ٹیبل پر سپورٹ بن کر ساکت تھا، دایاں کمر کے پیچھے سے اسٹک کو آگے پیچھے چلا رہا تھا کہ میری نظر بال سے اٹھ کر سامنے فریج پر جھکی لڑکی کی کمر پر جا ٹکی۔ یہ کمر، اس ہاسٹل میں مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

وہ سیدھی ہوئی تو نظر کو جیسے وہیں گوند ہی لگ گیا۔ یہ سراپا دیکھنے سے پہلے غالب کی 'سرو قامت' والی ترکیب میرے دماغ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ یقیناً تہذیبِ سندھ کے زمانے کے کسی فن کار نے تراشا تھا یہ بدن۔ اُس نے لانگ شوز، سیاہ اسکن ٹائٹ پتلون، اور لال رنگ کی ایک نفیس سی شرٹ پہنی ہوئی تھی جو اُس کی کمر سے یوں والہانہ لپٹی ہوئی تھی جیسے سرخ بیل تاج محل کی عقبی دیوار سے۔ اچانک میرا دایاں ہاتھ چھُوٹ گیا۔ اسٹک بالز سے ٹھاک کر کے ٹکرائی، بالز ایک دوسرے سے۔۔۔ اور یہ آوازیں اُس کی سماعتوں سے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ''ہائے'' بول کر بے نیازی سے فریج کی طرف پلٹی؛ ایک بار پھر پیچھے دیکھا، پھر ذرا غور سے دیکھا۔۔۔ اور کسی قوتِ غیبی کے زیرِ اثر میری طرف کھنچی چلی آئی۔

"Hi, I'm Anna." اس نے پول ٹیبل کے اُس پار سے کہا۔

"Hello, I'm Saleem." میں نے شاہانہ انداز میں اسٹک بلند کر کے کہا۔

یہ اور بات کہ اسٹک اگر پول ٹیبل کے اوپر لٹکے فانوس سے ٹکرا جاتی تو منظر بدل کر 'مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے' سا ہو جاتا۔ مگر وہ دن شاید میرا تھا اور میں اس وقت کسی بالی ووڈ فلم کے گانے کی تمہید بنا خود کو اس دوشیزہ کی سنہری زلف کا اسیر بنتے دیکھ رہا تھا۔ دل پھینک مَیں بالکل نہیں تھا، مگر آج جو حسینہ میری آنکھوں کے سائے میں آ ٹھہری تھی اس

کے حسن کے استعارے میں نگری نگری گھما آیا تھا۔اس کی پیشانی کی تراش گویا کسی جدید ترین لیزر سے کی گئی تھی۔آنکھوں کی جگہ دو نیلے موتی جڑے ہوئے تھے۔رخسار نہ تھے دو مقعر عدسے تھے، جن پہ میری نظر پھسل پھسل جا رہی تھی۔اس کی ناک نفاست کا مترادف تھی اور پیشانی برف پوش پربت کی، لب لالی کے ہم معانی تھے اور کان کہانی کے۔۔۔۔میرے سامنے میرے گاؤں کی متاعِ گم گشتہ، میرے پرائمری اسکول کی اسائنمنٹ کھڑی تھی۔

بہ خدا میں نے اسی طرح کے حسن کی تلاش میں یہاں داخلہ لیا تھا۔ویزا لینے امریکی سفارت خانے میں ایسی ایسی چیزیں اتار کے گیا کہ جنہیں کبھی مسجد میں بھی اتارنے کا نہیں سوچا تھا۔اپنی مٹی کا منکر بن کر پردیس روانہ ہوا۔ثقلِ زمین سے بغاوت کر کے کوئی بیس گھنٹے ہزاروں فٹ کی بلندی پر اڑتا رہا۔شکاگو ایئرپورٹ پر تین گھنٹے اُلو بنا بیٹھا رہا تا کہ امریکی سیکیورٹی اہلکار یہ طے کر سکیں کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں۔بہ ظاہر تو یہ سب کچھ علم کی پیاس بجھانے کے لیے جھیلا تھا کیوں کہ سچ نہ والدِ محترم جناب ضیاءالدین بلوچ کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی اپنی سپر پاور امریکہ کو۔مگر سچ یہی ہے کہ میں اس حسن کی دیوی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ویسے بھی یہ ایم اے انگریزی تو میں پہلے ہی نمل سے کر چکا تھا۔شیکسپیئر اور مارلو، ارسطو اور ایلیٹ، ادبی نظریات اور تاریخ، جین آسٹن اور فیلڈنگ، سلویا پلیتھ اور ٹونی موریسن، ان سب کو تو میں پڑھ چکا تھا۔اگر کچھ پڑھنا باقی تھا تو وہ ان نیلی آنکھوں کا نصاب تھا۔اس وقت بس اسی کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اینا ٹیبل کے اُس کنارے سے اِس تک آئی؛ میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر تیسری بار ''ہائے'' بولا۔

"I like the shine on your hair" اس نے رسماً کہا۔

"Thank you! Nice shirt!" میں نے سیکڑوں خوب nice چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کر کے کہا۔

میں چند ہی دنوں میں اینا کو اسی پول ٹیبل پر لے آیا۔یا شاید وہ مجھے وہاں لے آئی۔اسلام آباد کے میگا زون میں سنوکر کھیلتے رہنے کی بہ دولت میں اس کھیل میں مشاق تھا۔اینا کو اس کھیل کے اصول بتائے، اسٹک پکڑنے، سپورٹ دینے اور ہٹ کرنے کے گُر سکھائے۔بدلے میں اینا نہ صرف مجھے پیار دیتی بل کہ کافی میکر سے میرے کپ میں کافی بھر لاتی، اس میں براؤن شوگر ملاتی اور جب میں کافی پی رہا ہوتا، وینڈنگ مشین سے چاکلیٹ نکال لاتی۔چند ہی ہفتوں میں اسے پول میں اور مجھے پیار میں اتنی مہارت ہوگئی کہ گیم کے بعد ہمیں یاد ہی نہ رہتا کہ میں مشرق کا اور وہ مغرب کی ہے۔

☆

خیر آج تو ہم نے پول کھیلا ہی نہیں تھا۔میں سمسٹر کا آخری پیپر دے کر آیا اور یہ فلم دیکھنے بیٹھ گیا۔اینا کام سے واپس آئی اور جینی کو ساتھ لے کر سیدھی کارنر روم میں آ گئی۔جینی نے اپنی کتھا سنائی۔اس کا بوائے فرینڈ اسے چھوڑ کر اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ لاس اینجلس جا چکا تھا سو وہ شکستہ دل تھی۔ٹوٹے دل کبھی نہیں جڑنے پاتے۔پھر بھی دوستوں کا من

کرتا ہے کہ مداوا کریں۔ اینا نے کارنر روم کے فریج کا دروازہ کھولا۔ سامنے ریڈ وائن کی ایک بوتل پڑی تھی۔ اس نے مڑ کر مجھے آنکھ ماری اور بوتل نکال کر ٹیبل پر رکھ دی۔ پھر کیبن سے دو گلاس نکالے اور ان میں وائن اُنڈیل دی۔ کچھ سوگوارانہ توقف کے بعد اینا نے اپنا گلاس اٹھالیا اور جینی نے اپنا۔

کئی دنوں سے اینا میرے امتحان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ چھٹیاں آتے ہی ہاسٹل پر سکوت طاری ہو جائے گا اور مجھے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے وہ پرائیویسی میسر آئے گی جس کا تقاضا میں ہمیشہ کرتا تھا۔ ہاسٹل کے اصولوں کے مطابق لڑکوں کو لڑکیوں کے اور لڑکیوں کو لڑکوں کے کمروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سو سماجیاتی معاملات اور محبت سے ملاقات کارنر روم میں ہی ممکن تھی۔ مگر جب بھی ہم کارنر روم میں آتے یا تو وہاں پہلے سے کوئی بیٹھا ہوتا اور یا جب ہم میٹھی میٹھی باتوں کے سُر الاپنے لگتے تو سعودی بھائی خالد کو اپنا ہیڈ فون یاد آ جاتا، یا کسی چینی لڑکی کو کارنر روم سے اپنا چارجر بازیاب کرانا پڑ جاتا۔ یوں میں پاک چین دوستی کے نعرے لگانے لگتا۔ جب کہ اینا انگڑائیاں ، جمائیاں اور اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ سو وہ کسی ایسے دن کی منتظر تھی جب اس کے اور میرے بیچ محبت کے علاوہ اور جان دار شے کوئی نہ ہو۔ کولوراڈو یونی ورسٹی کی ان چھٹیوں کا بھرپور فائدہ لینے کے لیے اس نے اپنے اسٹور سے ایک ہفتے کے لیے چھٹی بھی لے لی تھی۔

آج اس کی چھٹیوں کی آٹھ میں سے پہلی رات تھی۔ جب جینی 'آئی ایم سوری' کہہ کر، اپنے گلاس میں ذرا سی وائن چھوڑ کر، اور ٹیڈی بیئر لے کر بالائی منزل پر اپنے کمرے کو چلی گئی تو اینا نے جھٹ سے ریموٹ اٹھایا اور ڈی وی ڈی کو بند کر دیا۔ ایل ای ڈی اسکرین سے پاکستان کے برفیلے پہاڑوں کا منظر ہٹا تو یک دم مجھے اینا کے جسم کی حرارت محسوس ہوئی۔ میں پہلے مسکرایا، پھر اینا کی طرف منہ کر کے صوفے پر آلتی پالتی مار کر نیلی آنکھوں کی کتاب کے صفحے اُلٹنے لگا۔ اینا کے صبر کا پیمانہ تھا کہ لب ریز ہوا جا رہا تھا۔

☆

علی اکبر عباس

ہائیکو

(۱)

صحرا کی آغوش میں
صبح کا پھول کِھلا
شام کو نہیں ملا

(۲)

صحرا کی آغوش میں
دوپہر کی دھوپ جب آئے
کئی سراب دکھائے

(۳)

صحرا کی آغوش میں
دھم سے شام گری
پل میں رات ہوئی

(۴)

صحرا کی آغوش میں
رات کی گہری خاموشی
گیدڑ نے توڑی

(۵)

صحرا کی آغوش میں
گائے ہوئے ڈھولے
ناچے کئی بگولے

(۶)

صحرا کی آغوش میں
سورج کی پھیلائی گرمی
چاند نے آن سمیٹی

(۷)

صحرا کی آغوش میں
سوئے لمبی تان کے
مارے ہوئے تکان کے

(۸)

صحرا کی آغوش میں
سورج نے کرنوں کو بھیجا
دیا نئے دن کا سندیسا

(۹)

صحرا کی آغوش میں
غول آیا چڑیوں کا
مہماں کچھ لمحوں کا

(۱۰)

صحرا کی آغوش میں
رفتہ رفتہ بجھا الاؤ
ہوا ہے ختم پڑاؤ

(۱۱)

پیلو رنگ برنگے
ان کے ہاتھ ہی لگتے ہیں
بھاگ ہیں جن کے چنگے

(۱۲)

پیلو چُننے آئے
وَن کی ٹھنڈی چھاؤں نیچے
دیکھو ہاتھ کیا آئے

(۱۳)

گرمی زیادہ ہے
وَن کی ٹھنڈی چھاؤں نیچے
ملن کا وعدہ ہے

(۱۴)

نظروں سے بچتے
وَن کی ٹھنڈی چھاؤں نیچے
پہنچے دو رستے

(۱۵)

بھیگی مسیں اور نئی جوانی
وَن کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے
شروع ہوئی اِک اور کہانی

(۱۶)

دھل گئے سبھی غبار
آج بہار کی بارش میں
نظر نصیب نکھار

(۱۷)

ہوئی ہے بوندا باندی
پھولوں پر سونا دمکے
اور پتوں پر چاندی

(۱۸)

آئے کوئی مہمان
ملن کی لذت اور بڑھائے
خاص بنا پکوان

☆☆☆

محمد اظہار الحق

کہ مستعار ستارے مری قبا پہ نہیں

[مبین مرزا کی شعری کائنات]

مبین مرزا سے جب بھی ملا ہوں، ایک ایسی ندی کا خیال آیا ہے جو ہم وار سطح پر چل رہی ہے، روانی کے ساتھ جس میں مستقل مزاجی ہے؛ یہاں ڈھلان ہے نہ آبشار یھنور ہیں نہ کناروں سے سر پٹختی موجیں! بس ندی رواں ہے۔ نرمی کے ساتھ، کسی تعطل کے بغیر!

میں ایک ایسے علاقے میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہوں جہاں قدم قدم پر پہاڑی ندیاں ہیں، ایسے تالاب ہیں جو پہاڑوں کے دامن میں ہیں، بے حد گہرے، مقامی زبان میں جنھیں ''ڈھن'' کہا جاتا ہے۔ پھر ان تالابوں سے ندیاں نکلتی ہیں۔ شور کرتی، کناروں پر ظلم ڈھاتی! بھری برسات کے دوران سفر کرتے تو ایسی ندیاں پار کرنے کے لیے پہروں انتظار کرنا پڑتا۔ خدا خدا کر کے پتھر نمودار ہوتے، جن پر پاؤں رکھ کر اور توازن برقرار کر کے، دوسرے کنارے پہنچتے۔

مبین مرزا کے مزاج میں جو ٹھہراؤ ہے، اُسے بیان کرنے کے لیے مجھے ندی کی مثال شاید اس لیے دینا پڑی کہ میرے لاشعور میں گھن گرج والی کوہستانی ندیاں رچی بسی ہیں۔ میں اگر خود اپنے بارے میں انھی پیرامیٹرز کے اندر لکھوں تو ایسی شور مچاتی، چیختی چلاتی ندی کا تذکرہ کروں گا جو کبھی سوکھ جاتی ہے اور کبھی مسافروں کو پار نہیں اُترنے دیتی!

اس بات کو اگر میں نچ مارک قرار دوں تو مبین مرزا کے حوالے سے ایسی ندی کا ذکر کیے بغیر چارہ نہیں جو چڑھتی نہیں، گرجتی نہیں مگر سوکھتی بھی کبھی نہیں۔ ایسی ندی جو مسلسل رواں ہے۔ مسافر اس کے آبِ شیریں سے پیاس بُجھاتے ہیں اور پھر پائنچے اوپر کیے، آرام سے، کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر، دوسرے کنارے تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔

میں مبین مرزا کی خاندانی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر ع: قیاس کُن زگلستانِ من بہار مرا'' کی رُو سے شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ وہاں بھی ہموار ندی جیسا ہی سہل، نرم اور آرام دہ ہوگا۔

ہمیشہ فرنگی پتلون اور شرٹ پہننے والے مبین مرزا کے اندر مجھے ایک درویش ملا ہے! اس عہد کے پیش منظر پر نام نہاد روحانیت جس طرح چھائی ہوئی ہے، اس کے پیشِ نظر کسی کو درویش کہنا خطرے سے خالی نہیں! ادب میں بھی ایسے درویشوں کی کمی نہیں روپے میں پانچ ملتے ہیں اور کبھی نائنٹی کی بیساکھی استعمال کرتے ہیں کبھی بابوں کا نردبان! مبین مرزا بھی ایسا ہی درویش ہوتا تو مجھ جیسا، ظاہری تقدس سے کوسوں دُور بھاگنے والا ازلی باغی شخص، اُس کے نزدیک بھی نہ جاتا ،اس لیے کہ اپنا معیار ہی اور ہے:

نہ ماتھے پر نشاں ، نئے ہاتھ میں تسبیح اظہار
یہ رنگِ عجز ہے، ہم اس کے بانی ہیں زمیں پر

ایک شخص نے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے یہاں تک کہ اس کا ذریعۂ روزگار بھی یہی ہے۔ اگر یہ درویش نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک ایسے شہر میں رہ کر، جہاں تجارتی بندرگاہ کے حوالے سے لاکھوں افراد کروڑوں کمار ہے ہیں، جہاں آسودہ حال ہونے کے لیے ہزاروں جائز کاروبار ہیں اور جہاں مبین مرزا جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے لیے کسی درھم و دینار میں کھیلتی کمپنی کی تشکیل کوئی مشکل کام نہیں، جی ہاں! ایک ایسے شہر میں اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کرنا مبین مرزا ہی کا کام ہے۔ ہر کہ ومہ ایسا نہیں کرسکتا۔ ادبی جریدہ نکالنا اور ادبی کتب کی اشاعت! ظالم نے اپنے آپ پر اور اپنے گھر والوں پر اتنا رحم بھی نہیں کیا کہ غیر ادبی کتابیں بھی ساتھ چھاپتا رہتا کہ اُن کی بکری زیادہ ہوتی ہے۔ اس ملک میں جہاں حقیقی خواندگی کی شرح بیس فی صد سے شاید ہی زیادہ ہو، بچہ بھی جانتا ہے کہ ادب کو ذریعۂ روزگار بنانا جان جوکھوں کا سفر ہے۔ مبین مرزا سب کُچھ جانتے بوجھتے ہوئے اس راستے پر چلا ہے، یہی درویشی ہے، یہی قناعت ہے اور یہی توکل ہے!

دوستی کے طویل سفر میں ایسے موڑ بھی آئے کہ مبین مرزا ناخوش ہوکر راستہ الگ کرسکتا تھا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا، وہ تو یوں پیش آتا ہے اور یوں نارمل رہتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں! درویشی اور فیاضی کا چولی دامن کا ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ مہمان نواز ہے، عربوں اور ازبکوں جیسا! میں نے اس کے دفتر بیٹھ کر پرانی کراچی کے بہترین روایتی پکوان کھائے اور ہر بار کھائے۔ کوئی مشکل آن پڑی تو اس نے دفتر بند کیا اور ساتھ چل پڑا، کبھی کبھی یوں لگتا ہے جنوب کے اس ساحلی شہر میں ایک نہیں دو سمندر ہیں! آغوش وا کیے! بے کنار! ایک طرف ریگِ ساحل کی نرمی اور دوسری طرف پانیوں کی افق سے افق تک ہمہ گیری!

شعری مجموعہ ملا تو تعجب ہوا۔ اسے میں نے ہمیشہ نثر نگار ہی سمجھا تھا۔ یہ تو معلوم تھا کہ شعر کہتا ہے اور نظم لکھتا ہے مگر باقاعدہ شاعر ہونے کا احساس اُس نے کبھی بھی نہیں دلایا تھا۔ مشاعرہ تو خیر اُس کی لغت کا لفظ ہی نہیں، مگر کبھی شاعروں کی طرح اس نے ''عرض کیا ہے''، دوستوں کی نجی محفل میں بھی شاید ہی کہا ہو!

''تابانی'' اس کے شعری مجموعے کا عنوان ہے۔ اس لفظ پر غور کیجیے! کیا اس میں وہی ٹھہراؤ اور ہموار پن نہیں ملتا جو مبین کی شخصیت کا خاصہ ہے؟ مختلف اور دھیما! تابندہ، تاباں، تابندگی جیسے مختلف مفردات چھوڑ کر، جن سے مرصع مرکبات بھی بن سکتے ہیں، اُس نے تابانی کا انتخاب کیا۔ مجھے اس عنوان میں بھرپور ہونے کا احساس نہیں ملتا جیسے ایک آنچ کی کمی رہ گئی ہو۔ اس عنوان سے جو امیجری میرے ذہن میں ابھرتی ہے، بیان کروں تو شاید عجیب لگے، جیسے چھت پر پلنگ بچھے ہیں، ان پر سفید چادریں ہیں! سفید ہی کڑھے ہوئے تکیے ہیں۔ سارے میں دودھیا چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ مبین ایک

پلنگ پر، تکیے سے ٹیک لگائے، نیم دراز لیٹا ہے۔ بس یہی تابانی ہے! نہ وہ خوابیدہ یا محوِ استراحت ہے، نہ اُٹھ کر بیٹھا ہوا ہے۔ نہ روشنی چاندنی سے زیادہ تیز ہے! مکان اور زمان، ماحول اور اشیا، سب اعتدال سے لبریز ہیں! وہی ندی! جو اچھلتی اور گرتی نہیں! ایک سی رہتی ہے۔

پہلی بار طائرانہ نظر ڈالنے سے جو تأثر مبین کی شاعری کا ملتا ہے وہ روایت سے وابستگی کا ہے۔ اس کے تلازموں میں اچھی خاصی تعداد اُن تلازموں کی ہے جو اساتذہ نے بھی استعمال کیے۔ تیشہ، دیوانے، شمع، کارواں، محمل، لیلیٰ، قیس، صحرا، بگولے، سرکار اور اس قبیل کی علامتیں مبین کے ہاں ضرور پائی جاتی ہیں۔ الفاظ کی بُنت اور مجموعی فضا بھی روایت سے قریب تر محسوس ہوتی ہے مگر ایک ایک غزل غور سے پڑھنے پر جو پرتیں کھلتی ہیں، جو تہیں نظر آتی ہیں اور ایک کے بعد دوسرے، تیسرے اور اس کے بعد کے مناظر پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، روایت سے وابستگی یہاں اُن معنوں میں نہیں جو Prosaic کے معنوں میں لی جاتی ہے۔ عام طور پر روایت پسندی کا مطلب، بے لطافتی، پیش پا افتادگی اور کسل مندی لیا جاتا ہے مگر اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ روایت پسندی اور جدت پسندی کے درمیان جو لکیر کھینچی جاتی ہے وہ نہ صرف مدھم ہے بلکہ بعض اوقات سامنے سے ہٹ بھی جاتی ہے، مومنؔ کے یہ دو شعر دیکھیے:

اُس کے کوچے سے چلا آئے ہے اُڑتا کاغذ
دیکھ کر پھینک دیا کیا مرے خط کا کاغذ

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا
جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کے کسی نوجوان کا کلام ہے، یہ درست ہے کہ مبین کی غزل زیر و بم سے بچتی ہوئی ایک نسبتاً سپاٹ لہجے میں چلی جاتی ہے مگر اس نے تغزل کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔ مصرع اُس کے ہاں چُست ہے اور خیالات میں تنوع اور بوقلمونی کے ساتھ ساتھ ندرت بھی ہے۔ خیالات کا نسبتاً تفصیلی احاطہ کرنے سے پہلے ہیئت کے حوالے سے ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہوگا وہ یہ کہ اُس نے ردیف چابک دستی سے چُنے ہیں جو کچھ غزلوں میں ذرا طویل بھی ہو گئے ہیں اور ان سے کلام کے حسن میں اضافہ ہوا ہے:

☆	نہ جائے گی	☆	کے لیے ہیں	☆	آہستہ آہستہ
☆	کہیں نہیں جاتا	☆	کہہ بھی نہیں سکتا	☆	مرے ساتھ ہے
☆	نہیں ہے کوئی	☆	بدل جاتے ہیں	☆	میں رہتا ہوں
☆	مرا دل ہے	☆	اٹھا کے لائے	☆	بناؤں کوئی

☆ دیکھا ہوا ہے

ان ردیفوں کو اس نے خوب نبھایا ہے جو قدرتِ کلام کی دلیل ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

جواب تک کر نہیں پایا خلش جاں سوز ہے اس کی
جو کر بیٹھا ہوں اب اس کی پشیمانی میں رہتا ہوں

☆

گھڑی بھر میں تو سارا حوصلہ دل نے نہیں ہارا
ہوا کارِ جہاں ، کارِ محال آہستہ آہستہ

☆

اُسے بھی دیکھیں گے فرصت میں ایسی عجلت کیا
حسابِ عمرِ گذشتہ کہیں نہیں جاتا

☆

زوال آمادگی کو آج ہنس کر دیکھنے والو
ابھی کل تک میں تھا کس اوج پر کہہ بھی نہیں سکتا

عزتِ نفس کہیے یا آباؤ اجداد کی عظمت کا احساس، مبین کے ہاں اس کی جھلکیاں خوب ملتی ہیں:

میں ایک ذرۂ ناچیز کائنات میں تھا
یہ کائنات سا کس نے بنا دیا ہے مجھے

☆

کھلا یہ خون کی وحشت ہے سو میں مر نہیں سکتا
مرے اندر سے لیکن خوئے سُلطانی نہ جائے گی

☆

اب یہاں اتنی فراغت ہے کسے، غور کرے
وقت نے بدلی ہے حالات کی صورت کیسی

☆

ورثے میں یوں تو دولت و شہرت بھی آئی تھی

اپنے لیے تو ہم یہی نخوت اُٹھا کے لائے

☆

وہ میرے بزرگوں کا قبیلہ ہی الگ تھا
پہنچی ہے جو مجھ تک سو، وراثت بھی سوا ہے

☆

تیشہ و کوہِ الم اجداد نے بخشا مجھے
ضامن اس میراث کا ہے عمر بھر رہنا مجھے

☆

یہی سبب ہے کہ رہ رہ کے یاد آتے ہیں
ہزار طرح کی نسبت ہے رفتگاں سے مجھے

مبین کی شعری دُنیا میں حیرتیں ہیں، عجائبات ہیں اور کہیں کہیں عبرتیں بھی! اس کی دُنیا میں عدالتیں فیصلے پہلے کر لیتی ہیں، سو گواہیاں نہیں مانی جاتیں۔ یہاں بے پناہ آسائشوں کے باوصف دلوں کا جہان ویران ہے! دوسری دُنیاؤں میں جسم فنا ہوتا ہے اور روح باقی رہتی ہے۔ مبین کی دُنیا میں سلسلے عجیب وغریب ہیں۔ یہاں روح برباد ہو گئی مگر جسم کا ڈھانچا چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دیومالائی کوہِ ندا سچ مچ کا کوہِ ندا ہے یوں کہ ماضی کی طرف مُڑ کر دیکھتے ہیں تو پتھر ہو جاتے ہیں۔ یہاں دُنیا انھیں نہیں ملتی جو اس کے پیچھے بھاگتے ہیں، یہاں دُنیا اپنے سے دُور بھاگنے والوں کے حضور خود حاضر ہوتی ہے۔ معرکے کا رُخ بدلنے کا عزم رکھنے والوں کو کمانیں شکستہ ملتی ہیں۔ یہاں اپنے شجرے پر ناز کرنے والے اس شجرے میں خود ہی نقب لگاتے ہیں۔ روشنی کے انتظار میں عمریں بیت جاتی ہیں مگر روشنی نہیں ملتی۔ یہاں ماہ ونجوم خاک میں مل جاتے ہیں سو انسان کی قدر و قیمت کیا! یہاں صیّاد ناخوش ہو تو آزاد کر دیتا ہے اور مہرباں ہو تو باندھ دیتا ہے۔ بے ثباتی کا یہ عالم کہ جسے کل تک سب سے مقدم رکھا جاتا تھا، اب اس کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ جن کے لیے انسان زندگی بھر دوسروں سے لڑتا ہے، وقت آنے پر وہ غیر جانب دار ثابت ہوتے ہیں۔ کل جو خوش لباسی میں یکتا تھا، اب عُریاں ہے۔ کل جو نادم تھا آج سب کچھ بھول کر خوش خوش پھرتا ہے۔ کارواں کے ساتھ بھی مسافر تنہا ہیں۔ جو غفلت میں نہیں وہی ہارتے ہیں اور پھر بارِ ندامت تلے دبے رہتے ہیں، جرم کے بغیر لائقِ تعزیز گردانا جاتا ہے۔

مبین کی یہ دُنیا اس لائق ہے کہ اس میں دل جمعی کے ساتھ چہل قدمی کی جائے۔ ایک ایک کوچے میں پھرا جائے۔ ایک ایک روش پر سبک خرامی کی جائے، ایک ایک پھول کی خوشبو سے سرشار ہوا جائے اور ایک ایک نہال کو چُھو کر

دیکھا جائے۔اس کی نظموں کا تذکرہ یہاں کیا ہی نہیں کہ غزلوں کے حصار سے نکلوں تو کوئی اور بات کروں! یوں بھی میرے پاس وہ اوزار نہیں جو ایک پیشہ ور نقاد کے کیسے میں رکھے ہوتے ہیں۔ میں نے تو مبین کی شاعری سے حظ اُٹھایا ہے۔ مجھے غرض لذتِ کام و دہن سے ہے Recipe سے نہیں، اس سے پہلے کہ آپ ''تابانی'' کا براہِ راست مطالعہ کریں، میرے انتخاب کی ایک جھلک دیکھ لیجیے:

مدت ہوئی ڈھونڈتے ہوئے اس جسم وجاں کے ڈھیر کو
اے زندگی پھرتا رہوں لے کر یہ ملبہ کب تلک

☆

اس سے آگے واپسی کا راستہ کوئی نہیں
جو یہاں سے لوٹنا چاہے اُسے روکا نہ جائے

☆

بکھرتی رُت سے نئی آرزو ہر آن ملی
یہ زندگی ہمیں دُکھ سُکھ کے درمیان ملی

☆

ہزار دُکھ ہیں مگر بوجھ تو انا پہ نہیں
کہ مستعار ستارے مری قبا پہ نہیں

وہ زخم کیا کہ جسے وقت مندمل کر دے
وہ شمع کیا جو فروزاں کفِ ہوا پہ نہیں

☆

اِک عمارت کہ اُٹھانی ہے سرِ دشتِ وجود
سو غمِ جاں تجھے بنیاد کیا ہے ہم نے

☆

اسے بھی دیکھیں گے فرصت میں ایسی عجلت کیا
حسابِ عمرِ گذشتہ کہیں نہیں جاتا

☆

یہی ہے اور یہی ہو گی تو زندگی پر خاک
جیے جو اس کی طلب میں اس آدمی پر خاک

☆

وہ شاہِ تمکنت و ناز ہے سو اس کی رضا
کہ مہرباں ہو پیادوں پہ یا وزیروں پر

☆

زندگی تُو نے ہمیں جو بھی دیا، جاتے ہوئے
کیوں نہ واپس تری دہلیز پہ رکھتے جائیں

☆

یہاں اِک باغ تھا جس میں چہکتے تھے پرندے
یہیں اس قریۂ جاں کی بیابانی سے پہلے

☆

کوفۂ وقت کی تاریخ بدلنے کے لیے
آؤ ہجرت نہیں، اس بار بغاوت کی جائے

☆

اب ہجر کا موسم آ پہنچا، ہم جان گئے تھے جب دل میں
اِک درد نے ڈیرہ ڈال لیا، اِک دُکھ نے بیاں امکان کیا

☆

کوئی دھیرے سے یہ کہتا ہے محبت سے نکل
ڈھل گئی عمر اب اس کارِ اذیت سے نکل

☆

آب دیدہ ہیں یہاں جو لوگ اپنے دُکھ سے ہیں
اور فضا میں بھی جو ٹھہرا ہے دھواں مجھ سے نہیں

مبین کی شاعری میں ایک عجیب طمطراق ہے، سادگی اور وضع داری سے لبریز! فرنگی ملبوسات کے اس زمانے میں اس کی شاعری خوب صورت انگرکھا اور صدری زیبِ تن کیے، سلیم شاہی جوتا پہنے دھیمے انداز میں متانت کے ساتھ چل رہی ہے۔ مجسم شرافت! روایتی خودداری اور جذبات کو توازن میں رکھے ہوئے!!

☆

محمد حمید شاہد

آزادی کے بعد اُردو فکشن اور ہمارا معاشرہ

مجھے جس موضوع پر گفتگو کرنی ہے اس میں تین لفظ بہت اہم ہو جاتے ہیں:

۱۔ آزادی ۲۔ اردو فکشن ۳۔ ہمارا معاشرہ

آزادی کی بات کو ہم تب تک ڈھنگ سے دیکھ نہ پائیں گے جب تک اسے غلامی کے عقب میں جا کر دیکھ پرکھ نہ لیں۔ اس مقصد کے لیے میں آپ کو کچھ پیچھے، یعنی مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں لے چلنا چاہوں گا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نفسیات کو نشان زد کرنا چاہتا ہوں کہ جس نے بعد ازاں دو قومی نظریے کو متشکل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک مسلمان یہاں حکمرانی کرتے رہے۔ تب تک دو قومی نظریہ ایک مسئلہ کی صورت کہیں وجود نہ رکھتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد مسلمانوں کی حکمرانی زوال کا شکار ہوتی چلی گئی اور پھر لگ بھگ سو برس بعد یہ انجام ہوا کہ، کہا جانے لگا: ''حکومت شاہ عالم، از لال قلعہ تا پالم'' یاد رہے پالم دلی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تاریخ کا بتانا کچھ یوں ہے کہ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت یہاں آ چکا تھا اور مسلمان کمزور ہو چکے تھے مگر اس سارے عرصے میں یہ ہوا کہ مسلمانوں غلام نہ تھے، غلامی کا احساس اگر کہیں تھا تو وہ ہندوؤں اور دوسری اقوام کے ہاں تھا، انہیں اقتدار کے قریب تر ہونے کے لیے بہت کچھ چھوڑنا پڑ رہا تھا اور انہوں نے چھوڑا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔ ہندوستان تاج برطانیہ کے تحت تھا۔ اب مسلم، غیر مسلم سب غلام تھے۔ غیر مسلم تو پہلے سے غلام تھے، ایک غلامی سے نکلے اور دوسری میں چلے گئے مگر مسلمان کے ہاں شدید نفسیاتی اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی۔ کہیں صدمے کی کیفیت، کہیں رنج اور کہیں بغاوت۔ ''شہید بن'' جیسی تحریکیں جو شمالی ہند سے چلیں اور بالاکوٹ پر ختم ہوئی، اسی ردعمل کا شاخسانہ تھیں۔ سندھ میں حروں کا ردعمل بھی اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ اس نفسیاتی ردعمل کا ایک اور مظاہرہ یوں ہوا کہ ہندو جو پہلے، یعنی مسلمانوں کی حکمرانی کے زمانے میں اپنی زبان چھوڑ کر فارسی زبان سیکھتا تھا کہ وہی دربار سرکار کی زبان تھی، انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی سیکھنے لگا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاں کوئی نفسیاتی رکاوٹ نہ تھی، جب کہ مسلمان انگریزی اور جدید علوم کی طرف متوجہ ہونے میں یہی نفسیاتی دیوار حائل تھی کہ وہ غلامی کے احساس سے دو چار ہوتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ ردعمل، انگریزوں کی جانب سے کی جانے والے تہذیبی اور ثقافتی انقلاب کی کوششوں کے مقابل شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ہندو اور دوسری اقوام اگر لارڈ میکالے کی تعلیمی اصلاحات کا خیر مقدم کر رہی تھیں تو مسلمان کہیں تو ٹھٹھک کر الگ کھڑا تھا اور کہیں مزاحم ہو رہا تھا۔ یہ وہ وجوہات تھیں کہ مسلمان معاشی اور معاشرتی طور پر بدحال ہوتا چلا گیا

اور ہندو سماجی مرتبے میں توقیر پانے لگا تھا۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ اگر یہی صورت حال رہی تو مسلمان یا تو منڈیوں میں مزدور ہوں گے یا سرکاری دفتروں میں چپڑاسی۔

اب آیئے مسلمان علماء اور رہنماؤں کے ردعمل کی طرف۔ تو ایسا ہے کہ یہاں دو طرح سے ردعمل ہوا ایک وہ تھے جو مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف ردعمل پر ابھارتے ہوئے انہیں انگریزی زبان اور جدید علوم کے سیکھنے سے بھی روک رہے تھے اور دوسری قسم کے رہنماؤں میں سرسید احمد خاں تھے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب لکھتے ہوئے اگر ایک طرف انگریزوں کو یہ باور کرانے کے جتن کر رہے تھے کہ مسلمان باغی نہیں ہیں، یہ ایک ردعمل تھا جو انگریز کے فیصلوں میں ان کے شریک نہ کیے جانے کی وجہ سے ہوا، تو دوسری طرف وہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف آنے پر مائل کر رہے تھے۔ ہندوستان میں انڈین کانگریس ۱۸۸۵ء میں جب کہ آل انڈیا مسلم لیگ اکیس سال بعد ۱۹۰۶ میں بنی اور اس سیاسی ڈیویلپ منٹ کے پیچھے، صرف یہی احساس کام نہیں کر رہا تھا کہ بعد میں مسلمانوں کے تحفظات بلکہ کئی طرح کے خوف بڑھتے چلے گئے ان میں ایک خوف تو یہ تھا کہ انگریز اور ہندو بہت سارے معاملات میں ایک ہو جایا کرتے تھے۔ بعد میں جب انگریزوں کے برصغیر سے چلے جانے کے آثار نظر آنے لگے تو مسلمانوں کو خوف تھا، کہ وہ اقلیت میں ہیں لہذا ہندو کے رحم و کرم پر ہوں گے اور ہندو اپنی غلامی کے زمانے کا خوب خوب بدلہ لے گا۔ اب ذرا اقبال کا ذکر، جو ایک زمانے میں کہتے تھے، ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستان ہمارا''۔ مگر جو بعد میں انگلستان اور جرمنی سے ہو کر آئے تو کہنے لگے ''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے''۔ وہ اور طرح سوچنے لگے تھے اور وطنی قومیت کو رد کر رہے تھے۔ ''ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے، جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے'' یہی وہ فضا تھی جس میں دو قومی نظریے کی تشکیل ہوئی اور اسی میں فضا میں ہم محض آزاد نہیں ہوئے الگ الگ ملکوں میں تقسیم ہو گئے۔

میں نے اپنے موضوع سے جو تین اہم الفاظ الگ کر کے ایک ترتیب میں لکھ دیے تھے اب ان کی ترتیب ایک طرف رکھ کر پہلے دوسرے کی بہ جائے تیسرے لفظ ''معاشرہ'' پر ایک آدھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ہمارا معاشرہ ایسے زمانے میں جاگ رہا ہے جسے معنی کی تالیف اور تجسیم کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تو تہذیب کے بکھرنے اور معاشرتی روایات کے وجود کے ادھڑنے کا زمانہ ہے۔ تقسیم، ہجرت، فسادات، جنگ، پھر تقسیم اور مسلط کی گئی طویل جنگ کے چرکے سہتا یہ معاشرہ، اور پھر ایسا زمانہ آ لگا ہے کہ تخلیق کے نسب نامہ سے اس کے محرک اور مصنف کے تخلیقی شعور اور لاشعور کو کاٹ پھینکنے کے جتن ہونے لگے ہیں۔ وہ اکھاڑ پچھاڑ جو ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے عنوان سے از سر نو تشکیل دی جانے والے دنیا کے منصوبے کے تحت ہمارے معاشرے کا حصہ ہوئی ہے، وہ اپنے ساتھ دہشت کی تہذیب بھی لے کر آئی ہے۔ ہم ایسے معاشرے میں زندہ رہنے یا مر جانے پر مجبور کر دیے گئے ہیں جس میں خوف اوپر سے برستا ہے، یوں جیسے ڈورون

نے نشانے باندھ کر بارود پھینکا ہو یا ہمارے بیچ میں پھٹ پڑتا ہے، کچھ اس طرح کہ جیسے کسی نے کمر بندھی جیکٹ سے خود کو اڑا لیا ہو، تو اس دہشت میں جو زبان ترتیب پاتی ہے وہ ہماری زبان ہوگئی ہے، معنویت کے انتشار کی زبان۔ مفہوم کی fragmentation اور disintegration میں شہادت جیسے مذہبی تہذیب والے لفظ کی معنیاتی روح خطا ہوگئی ہے۔ عجب معنوی انارکی کا زمانہ ہے کہ دہشت مارے وجودوں میں اندر تک اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔ ہماری وہ زبان جس میں ہماری صدیوں کی تہذیب بولنے لگی تھی، اور جو ہماری معاشرت کو سنوارتی تھی، وہ اپنے مثبت اظہار کے منصب سے دستبردار ہوگئی ہے۔ ایسے میں نئی تنقید بتا رہی ہے کہ ایسا ہوتا، ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے مسلسل مشورہ رہا کہ ان معنی کو چھوڑو جو لفظ کے اندر ہمکتے ہیں اور معنی کے ان امکانات کو بھی چھوڑ دو جو گزرتے وقت کا تجربہ نمو کی صورت اس سے وابستہ کر دیتا ہے۔ کہ اس مابعد زمانے میں معنویت صرف نفی اور افتراک کی دین ہے۔ سو ایسے زمانے میں کہ معاشرے کی گہرائیوں میں جھانکنے کا دستور فرسودہ ہو چکا ہے، ثقافتی لہریں ہمیں چھو کر گزرتی ہیں تو بدن میں کوئی جھرجھری نہیں ہوتی۔ وجود اور جوہر کے درمیان اگر کوئی تعلق تھا تو وہ کچے دھاگے کی طرح یا تو ٹوٹ گیا ہے یا ٹوٹا ہوا لگتا ہے۔ موت کی دہشت ہمارے وجودوں میں اُتری ہوئی تھی۔ یہ دہشت اکیلی نہیں ہے اس کے ساتھ بے پناہ مایوسی اور بوریت کی اطالت بھی ہے۔ عین ایسے زمانے میں ہم اردو فکشن اور معاشرے کے درمیان تعلق دریافت کر رہے ہیں تو میں اسے خوش آئند بات سمجھتا ہوں۔

اب میں آتا ہوں اردو فکشن کی جانب مگر مجھے اس باب میں سب سے پہلے یہ اعلان کرنا ہے کہ میں افسانے اور ناول دونوں کو فکشن سمجھتا ہوں۔ جی میں ایسا اس کے باوجود کہہ رہا ہوں کہ سکندر احمد نے اپنے ایک مضمون میں فرما رکھا ہے:

''Edgar Allen Poe نے اَفسانے کو فکشن تسلیم نہ کیا تھا اگر کیا ہوتا تو اپنے شہرہ آفاق مضمون ''Art of Fiction'' میں Short Story کا تذکرہ ضرور کرتا۔''

(اَفسانے کے قواعد۔ شب خون: ۲۸۸)

میرا اس باب میں یہ استدلال رہا ہے کہ اگر Poe نے اَفسانے کا ذکر اپنے مضمون میں نہیں کیا تو یہ کیوں کر ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ اَفسانے کو فکشن ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اردو افسانے کو فکشن کی ذیل میں میں ہی نہیں رکھ رہا وارث علوی نے بھی اَفسانے کی تنقید لکھتے ہوئے اسے فکشن کی تنقید قرار دیا تھا۔ خود شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاں بھی اَفسانے اور کہانی' دونوں کو مختلف مقامات پر فکشن کے مترادف کے طور پر لیا گیا ہے۔ کسی مضمون میں اَفسانہ' فکشن ہے اور کسی میں کہانی' فکشن ہوگئی ہے۔ فاروقی صاحب کے اَپنے الفاظ میں:

''آسانی کے لیے ''اَفسانہ'' کو Fiction کے معنی میں رکھیے' کیوں کہ ناول اور اَفسانہ تخلیقی اور اظہاری اعتبار

سے ایک ہی صنف ہیں اور اگر فکشن کی تعریف یا حد بندی ہو سکے تو ہم اسے ناول اور اَفسانہ دونوں کے لیے کام میں لاسکیں گے۔'' (اَفسانے میں کہانی پن کا مسئلہ / اَفسانے کی حمایت میں)

میں محض اپنی آسانی یا کوئی نادر نکتہ سجھانے سمجھانے کے لیے افسانے کو فکشن کی ذیل میں نہیں رکھتا، واقعہ یہ ہے کہ اردو میں فکشن کا تصور افسانے کے بغیر بنتا ہی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں short story کا ترجمہ کرتے ہوئے ''مختصر اَفسانہ'' لکھا جانے لگا اور short fiction کا ترجمہ کرنے والے یہ سمجھانے میں جت گئے کہ اَفسانہ گویا منی ایچر ناول ہے۔ یہی خرابی کی بنیاد بنا حالاں کہ شارٹ اسٹوری کا اُردو میں متبادل لفظ ''اَفسانہ'' اردو میں پہلے سے موجود تھا۔ جی ''افسانہ''، ''مختصر اَفسانہ'' نہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا ضروری ہے کہ ہمارے ہاں کا اَفسانہ ناول کی قطعاً تصغیری صورت نہیں رہی۔ خیر، یہ ایک ضمنی بات تھی، کہنا مجھے یہ ہے کہ اردو فکشن میں افسانہ اور ناول دونوں ہمارے پیش نظر رہیں گے اور یہاں یہ بھی کہنا ہے کہ پاکستان میں جیسے بھی حالات رہے فکشن نگار نے قلم تھامے رکھا اور اپنے بیانیے میں ایسی بھیدبھنور ڈالے کہ سب کچھ اس کا حصہ ہوتا چلا گیا۔

آزادی کے فوراً بعد یہ سوال لکھنے والوں کے سامنے اُٹھایا جانے لگا تھا کہ کیا پاکستان کا ادب اپنے مزاج کے اعتبار سے تقسیم سے پہلے والے ادب سے مختلف ہونا چاہیے؟ اور کیا ادب کو قومی شناخت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے؟ قومی شناخت سے پہلے مشکل یہ تھی کہ ہم ایک قوم بن نہیں پا رہے تھے یہاں قومیتیں جاگ اٹھی تھی۔ یاد رہے کہ وہ ادیب ہندوستان کی تقسیم کے حامی نہ تھے اور انسان اور انسانیت کے ساتھ بہت سختی سے وابستگی کا دعویٰ رکھتے تھے، ایک وقت ایسا آیا تھا کہ ان میں سے کئی ایک ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ 'منٹو کی کہانی ''کھول دو'' کو کچھ لوگ کسی اور نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر مجھے تو یہ بھی اُس کے پاکستانی ہو جانے کی روداد سناتی ہے۔ پاکستان آنے کے بعد منٹو نے جو دو پہلی کہانیاں لکھیں اُن میں ''کھول دو'' شامل ہے۔ تاہم یہی منٹو کی پہلی پاکستانی کہانی بنتی ہے۔ اس افسانے میں جہاں فسادیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف نفرت اُبھاری گئی ہے وہیں ہماری ملاقات ایک حساس پاکستانی سے بھی ہوتی ہے۔ ایسا پاکستانی جو فسادات اور قتل و غارت گری کو نفرت اور دُکھ سے دیکھتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے خوابوں کی سرزمین کی طرف دیکھنے والوں کے ساتھ ایسا ہوتا۔ ''کھول دو'' کو سمجھنے کے لیے قیام پاکستان کے بعد کے بدلے ہوئے منٹو کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ میں اُس تبدیلی کی بات کر رہا ہوں جسے ناقدین نے باقاعدہ نشان زد کیا ہے۔ منٹو نے خود بھی لکھا تھا کہ پاکستان آنے کے بعد یہ الجھن پیدا کرنے والا سوال اس کے ذہن میں گونجتا رہا ہے کہ کیا پاکستان کا ادب علیحدا ہوگا؟ اگر ہوگا تو کیسے؟ اور یہ کہ اسٹیٹ کے تو ہم ہر حالت میں وفادار رہیں گے، مگر کیا حکومت پر نکتہ چینی کی اجازت ہوگی؟ اور آزاد ہو کر کیا یہاں کے حالات فرنگی عہد حکومت کے حالات سے مختلف ہوں گے؟ یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جو یہاں ادب کا مزاج متعین کر رہے تھے۔ میں نے کہا نا، وہ ادیب بھی جو پاکستان

کے قیام سے پہلے تقسیم کے مخالف تھے یا اس سارے تاریخی عمل سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئے تھے، پاکستان بننے کے بعد پاکستانی ہو کر سوچنے لگے تھے۔ منٹو صاحب پاکستان آئے، اسے اپنا وطن بنایا، اسٹیٹ کے وفادار ہوئے اور اس نظام کے ناقد ہو گئے جو فرنگی عہد سے مختلف نہیں ہو رہا تھا۔ جہاں جہاں انہیں ٹیڑھ نظر آیا وہاں وہاں انہوں نے بھرپور چوٹ لگائی۔ اَفسانہ ''کھول دو'' بھی ایسی ہی شدید چوٹ ہے۔ ایک سچے پاکستانی کی اُس معاشرتی روّیے پر بے رحم چوٹ جس نے ہمارے سنہرے خوابوں کو گدلا دیا تھا۔

برصغیر کی تقسیم کا واقعہ جہاں آزادی کے دِل خوش کن خواب سے جڑا ہوا ہے وہیں نقل مکانی کے المیے سے بھی وابستہ ہے۔ وہ علاقے جن سے ماضی کی ساری یادیں وابستہ تھیں اور وہ خیال میں بہت گہرائی میں پیوست تھے، ادیب کا رشتہ اس خیال سے مستحکم ہو کر سامنے آیا۔ اس نئی زمین کے لیے جس طرح کے خواب دیکھے گئے تھے اس کی عملی تعبیر میں سو طرح کے رخنے تھے۔ یہی سبب ہے کہ فیض احمد فیض کی جانب سے داغ داغ اُجالا کی بات ہونے لگی تھی ایسے میں ماضی کی زمینوں کو دیکھنا اور وہاں کے دُکھ سکھ کا نئی صورت حال سے موازنہ کرنا اُردو ادب کا باقاعدہ موضوع بن گیا۔ سینتالیس سے ساٹھ تک کے زمانے کے ادب میں اسی ماضی کی گونج صاف طور پر سنی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ انتظار حسین پر تو اسی ناسٹلجیا کا شکار ہونے کی پھبتی بھی کسی جاتی رہی۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ انتظار حسین جیسے ادیب محض ماضی قریب سے وابستہ نہیں ہوئے تھے وہ ہند اسلامی تہذیب سے وابستہ ہو کر کچھ خواب دیکھ رہے تھے، چاہے یہ خواب ''آخری آدمی'' کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوں۔

ساٹھ اور ستر کی دہائی تک آتے آتے بہت کچھ تبدیل ہوا۔ ترقی پسندوں کا نعرے لگانے والا رجحان مات کھانے لگا اور ادب انسان کے باطن میں موجزن احساس سے جڑنے لگا۔ اسی داخلیت نے دروں بینی کے چلن کو عام کیا تو لسانی تشکیلات کا تجربہ سامنے آیا۔ فکشن لکھنے والے علامت و تجرید کی طرف مائل ہوئے۔ ہئیت اور تیکنیک کے تجربات ہوئے۔ اس سے ایک اسلوب بنا۔ یوں مجموعی سطح پر دیکھا جائے تو ادب ایک نئے تصور سے جڑا اور زبان کے اندر اظہار کی بے پناہ قوت پیدا ہوئی۔ تخلیقی زبان لکھنے کی اس لگن کے زمانے میں جہاں نظم مختلف ہو گئی تھی وہاں ہمارے فکشن نے بھی اس سے اثر قبول کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہمارے ہاں سب کچھ ''نیا'' ہو گیا تھا۔ نیا افسانہ، نئی نظم، نیا ادب حتیٰ کہ غزل بھی نئی۔ ان دنوں ادھر سرحد کے پار بلراج مین را نے ''ماچس'' لکھا تھا اور سریندر پرکاش نے ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' تو ادھر پاکستان میں انور سجاد نے ''ماں اور بیٹا''، رشید امجد نے ''گملے میں اُگا ہوشہر'' لکھے تھے، احمد ہمیش نے ''کہانی مجھے لکھتی ہے'' لکھی حتیٰ کہ کہانی کی روایت سے جڑے ہوئے منشا یاد جیسے افسانہ نگاروں نے نئے بھی اس چلن میں لکھنا قبول کر لیا تھا، کہ اس زمانے میں اس میدان میں قدم گاڑھے بغیر توجہ پانا ممکن ہی نہ تھا۔ تاہم جب اس نئی لہر سے یکسانیت کی بو آنے لگی، اور یہ تحریک فیشن زدگی کا شکار ہو گئی تو قاری اور ادیب میں مغائرت در آئی۔

ایک بات یہاں دہرانے کے لائق ہے کہ سن سینتالیس میں ہجرت کرنے والے جب انسانیت کے دشمن درندوں کے نرغے میں تھے تو بھی ہمارا افسانہ چوکنّا تھا۔منٹو نے 'کھول دو' لکھا یوں کہ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ قیدی اثاثوں کی طرح تقسیم ہوئے تو اسی کے باکمال قلم نے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' لکھا۔ احمد ندیم قاسمی کا 'پرمیشر سنگھ' قافلے سے بچھڑ جانے والے کا صرف سانحہ ہی نہیں وقت کے مخصوص پارچے پر کہانی کی مہر بھی ہے۔ یہ روّیہ اب تک چلا آتا ہے۔ کچھ دن گزرتے ہیں منشایاد نے اَفسانہ لکھا تھا 'کہانی کی رات' اور مجھے افسانہ لکھنا پڑا تھا ''سورگ میں سور'' یا پھر ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے''۔ سچ پوچھیں تو ہمارے ادب میں ہماری قوم سانس لے رہی ہے وہ قوم جسے تاریخ کا سفاک جبر کاٹ کاٹ کر مردہ بنا رہا ہے۔ عام آدمی کی خوشیاں ان کے غم سب اس میں جھلکتے ہیں۔ یہ اندازِ نظر اور تاریخ نویسی کا یہ ڈھنگ ہمارے ادب کا شعار رہا ہے۔

ستر کی دہائی کے عین آغاز میں ہم دولخت ہو گئے تھے۔انتظار حسین، مسعود مفتی اور مسعود اشعر کے علاوہ وہ تخلیق کار جو براہ راست اس سانحے سے گزرے۔ وہ وہیں بس گئے یا وہ جو یہاں آ گئے تھے، لکھنے بیٹھے تو لہورُلا گئے۔غلام محمد، محمود واجد، امِّ عمارہ، شہزاد منظر، نورالہدیٰ سید، علی حیدر ملک، احمد زین الدین، شاہد کامرانی اور شام بارکپوری کے لکھے ہوئے افسانے اس قومی سانحے کی سچی تصویر بناتے ہیں۔ میں جب بھی اس قومی سانحے کی بابت سوچتا ہوں تو مجھے ریاض مجید کی غزلوں کا مجموعہ 'ڈوبتے بدن کا ہاتھ' یاد آ جاتا ہے۔

ضیاالحق والے اسلامی مارشل لا کہ جسے امریکی حمایت نے گیارہ سال تک پھیلا دیا تھا، بھٹو کی پھانسی، افغانستان میں امریکی مفادات کے تحفظ کو جہاد قرار دینا، روس کا ٹوٹنا اور ہماری تہذیبی حمیت کا پارہ پارہ ہونا ایسے سانحات کو لیے ہوئے تھا جو اس زمانے کے ادب کا مزاج بدلتے رہے۔ پہلے امریکی جہاد اور پھر دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک حربے کے طور پر استعمال کی جانے لگی تو عالمی سامراج کو ہم نوا بھی مل گئے۔ یہی وہ فکری انارکی کا زمانہ ہے کہ ملکوں ملکوں دہشت گردی پھیلانے اور دہشت زدہ کر کے عالمی وسائل پر قبضہ کرنے کی مہم چلی اور سوچنے سمجھنے والے چکرا کر رہ گئے۔اسی زمانے میں میڈیا کے ذریعے کامیاب ذہن سازی کے تجربات ہوئے اور قومی سطح پر بیانیہ تشکیل دینے کی باتیں ہونے لگی۔ایسے میں ہمارے ادیب الگ تھلگ ہو کر کیسے بیٹھ سکتا تھا، اس نے اپنے قلم کا حق ادا کیا اور جم کر لکھا۔ لکھتے ہوئے، اس کی ہمیشہ کوشش رہی کہ وہ کمزور کا ساتھ دے۔ کیوں ہمارا ادیب سمجھتا ہے کہ طاقتور کی حمایت ادب کا منصب نہیں ہے۔ خالدہ حسین کا افسانہ ''ابن آدم'' پڑھ لیجئے اس میں آپ کو دہشت زدہ انسان کا چہرہ اور امریکی فوجیوں کے ہتھے چڑھ کر جنسی تشدد کا شکار ہونے والی عراقی عورت کا چہرہ دونوں نظر آ جائیں گے۔ دونوں کے چہرے نفرت نے اور کرب واذیت نے بدل کر رکھ دیے ہیں۔ ہمارا ادب خود کو اس عراقی عورت کے ساتھ پاتا رہا ہے۔جس پر تشدد روا رکھا گیا تھا۔ دہشت کا اگلا موسم

ہماری زمین پر اترا تو سب کچھ خزاں رسیدہ نظر آنے لگا، مسجدوں، امام بارگاہوں، مزاروں پر دھماکے، ڈرون اور خودکش حملے ہماری نفسیات کو تلپٹ کرنے لگے تھے۔ جہاں جہاں دہشت کی آگ برس رہی تھی وہاں وہاں سب کچھ حتی کہ انسانیت اور اس کی مسلمہ اقدار بھی راکھ ہوتی جارہی تھیں۔ ابھی اپنے پیاروں کو دفنا کر لوٹے بھی نہ ہوتے کہ کچھ اور جنازے تیار ملتے، کہیں کہیں تو جنازہ پڑھنے والے بھی دہشت گردوں کا نشانہ ہو جاتے تھے۔ ایسے میں انسانیت پر ایمان متزلزل ہونے لگا تھا، کہانیاں اور شاعری ایسے میں ان موضوعات سے وابستہ کیسے رہتیں جو اسے تہذیبی امی جمی والے زمانے میں مرغوب تھے، یہ اپنے مزاج کے اعتبار سے برہم ہوئیں کہ برہم ہونا بنتا تھا۔

عین آغاز میں فکشن کا منظر نامہ جن ناموں سے بنتا تھا ان میں میرزا ادیب، احمد علی، سجاد ظہیر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد اور انتظار حسین تک، سب اپنا اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ اس میں کچھ اور رنگ بھرنے کو انور سجاد، منشا یاد، خالدہ حسین، رشید امجد، حسن منظر، اسد محمد خاں، مرزا حامد بیگ، جیسے لوگ آ گئے۔ اسلم سراج الدین، خالد طور، سید راشد اشرف، نیلوفر اقبال، آصف فرخی، مبین مرزا، نیلم احمد بشیر، اے خیام، یعقوب شاہ غرشین، اخلاق احمد، آمنہ مفتی، عرفان جاوید، زین سالک سے لے کر اس خاکسار تک اور اس کے بعد بھی ایک زرخیز نسل میدان میں اتر چکی ہے اور سب کی ایک ہی دھن ہے کہ فکشن لکھنا ہے اور مختلف ہو کر لکھنا ہے۔ زندگی ایک دام ہے، ایک پھندا، مگر فکشن کو اس جسم میں قید آدمی کے امکانات کو جو جسم سے باہر بھی بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، انہیں تلاش کرتا ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ فکشن لکھنا، واقعہ لکھنا یا چند واقعات کی تجمیع کا نام نہیں ہے یہ تو نادر یافت کی دریافت ہے۔ اُس کا تعاقب ہے جس کی شناخت کسی بیان سے ممکن نہیں ہے۔ سو، لکھنے والے اس عرصے میں فکشن کا اپنا تخلیقی بیانیہ مرتب کرتے رہے۔ ستر برس کے تجربات سے آج کے تخلیق کار نے سیکھا کہ متن میں یہاں وہاں علامت کے پیوند لگانے کی بجائے، پورے افسانے کو اس میں موجود کہانی سمیت، اس کی نامیاتی وحدت کے ساتھ علامت بنا رہے ہیں۔ یہاں نیا بیانیہ متشکل کرنے کے لیے کچھ زیادہ جرات کے مظاہر دیکھنے میں آئے ہیں مثلاً دیکھئے کہ آزادی کے بعد اگر عزیز احمد نے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' جیسا اہم ناول دیا۔ تو شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس''۔ نثار عزیز بٹ کے ''نگری نگری پھرا مسافر'' اور ''کاروان وجود'' سے لے کر ممتاز مفتی کے ''علی پور کا ایلی'' جمیلہ ہاشمی کے ''تلاش بہاراں''، الطاف فاطمہ کے ''دستک نہ دو''، امراؤ طارق کے ''معتوب'' خدیجہ مستور کے ''آنگن''، انور سجاد کے ''خوشیوں کا باغ'' اور فہیم اعظمی کے جنم کنڈلی تک چلے آئیں ہمیں فکشن کی دنیا بھیدوں بھری لگے گی۔ عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' کو اس کے بے ساختہ مکالموں کی وجہ سے پاکستانی بیانیے کا پہلا ناول قرار دیا گیا۔ انتظار حسین کے ''بستی'' کو بکر انعام کے لیے شارٹ لسٹ ہوا تو سب نے ان کے دوسرے ناولوں ''چاند گہن'' اور ''آگے سمندر ہے'' کی

جانب بھی متوجہ ہوئے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول میں اپنے تخلیقی جوہر کی دھاک بٹھائی۔ ''بہاؤ'' اور ''راکھ'' جیسے ناولوں پر مصنف بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ اکرام اللہ کا ''گرگ شب''، بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، طارق محمود کا ''اللہ میگھ دے''، مظفر اقبال کا ''انخلاع'' اور انقطاع'' کا ذکر اوپر ہونا چاہیئے تھا۔ عاصم بٹ کے ''دائرہ''۔ آمنہ مفتی کے ''آخری زمانہ''، نجم الدین کے ''کھوج'' اور اختر رضا سلیمی کے ''جاگے ہیں خواب میں'' اور ''جندر'' تک چلے آئیں تو اس صنف میں لکھنے والوں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے پاپولر ناول لکھنے والوں پر الگ سے بات ہونی چاہیے کہ ان کا ذکر چھڑ گیا تو بات پھیلتی چلی جائے گی۔ سو ہم اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ ان ستر برسوں میں اس صنف میں بھی ہمارا دامن مالا مال ہوا ہے۔

آزادی سے لے کر ٹوٹنے تک اور اس انار کی کے زمانے تک کے پر آشوب زمانے کے آتے آتے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے دنیا یکدم سکڑ گئی ہے۔ ساری لکیریں مٹ گئی ہیں' ساری شناختیں معدوم ہو گئی ہیں۔ گلوبل ویلیج بنتی اس دنیا میں اب اندر کے دُکھوں سے کہیں بڑے دکھ باہر سے آ رہے ہیں۔ مارکیٹ اکانومی نے کنزومرازم کی جو ہوا باندھ رکھی ہے عالمی سامراج کا اس سے بھی مفاد وابستہ ہے اور اس نے بھی ہمارے ادب میں ایک مزاحمت کا رویّہ پیدا کر دیا ہے۔ پھر اس دباؤ کے زمانے میں ہماری معاشرت کے اندر کے تضادات، فرقہ ورانہ تعصّبات، جہالت اور اندر دبی غلاظتیں باہر پھوٹ بہی ہیں۔ ہم علم' تہذیب اور تربیت سے انفارمیشن ٹیکنالوجی کو غچہ دے کر آگے بڑھ سکتے تھے مگر اس کے ذریعے ریاستی قوت کو سامراج اور سرمائے نے ہتھیا کر سارے راستے مسدود کر دیے ہیں۔ کئی کئی چینلز بظاہر کھلی آزادی کے ساتھ موجود ہیں مگر فی الاصل ایسا نہیں ہے۔ پھر یوں بھی ہے کہ ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول ہر ایک کے ہاتھ میں یوں آ گیا ہے جیسے بندر کے ہاتھ استرا۔ سب کچھ کٹ رہا ہے۔ مناظر بدل رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ثقافتی چولیں بھی ڈھیلی پڑنے لگی ہیں۔ کمپیوٹر کے ہر آئی کان کے پیچھے سے انفارمیشن کا جو سیلاب امنڈا پڑتا ہے اس کی کوئی تہذیب نہیں ہے لہٰذا بچی کھچی مثبت روایات بھی اسی ریلے میں غوطے پر غوطہ کھا رہی ہیں۔ ساری انسانیت، بازاری نفسیات اور قبضہ گیروں کی زد پر ہے۔ بجا کہ جارحیت کرنے والے کو دنیا بھر کے سارے وسائل پر دسترس چاہیے اور یہ بھی درست کہ جنگ اور دہشت اسی کا پروڈیکٹ ہے، مگر اس کا احساس بھی تو ہونا چاہیے کہ ہم ادبا کر اپنے تضادات کا خود شکار ہو رہے ہیں بنیاد پرستی سے لے کر دہشت گردی تک ہمارا اپنا چہرہ مکروہ ہو کر سامنے آتا رہا ہے اور آ رہا ہے۔ تاہم یہ امر لائق امتنان ہے کہ دہشت کے اس زمانے میں ہماری شاعری اور ہمارا ادب اس دیوزاد کو نشان زد کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے جو ہماری کہانیوں میں کبھی ''آدم بو' آدم بو'' پکارتے آیا کرتا تھا اور ان تضادات کو بھی جو ہمارے اندر سے بدبودار گٹر کی طرح اُبل پڑے ہیں۔

(پانچ روزہ ''دسویں عالمی اردو کانفرنس''، کراچی پاکستان، منعقدہ ۲۱ تا ۲۵ دسمبر ۲۰۱۷ء میں پڑھا گیا)

صابر

استعارے کی موت

اظہار کے بالواسطہ پیرایوں میں استعارے کا جب بھی ذکر نکلتا ہے تو چند گھسی پٹی تعریفوں، چند پٹے پٹائے اصولوں اور دو چار جذباتیت زدہ فقروں تک پہنچ کر سیرابی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ استعارہ اور ہے بھی کیا؟ ایک لفظ جو لسانی سیاق وسباق کے لحاظ سے اپنے لغوی معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ حقیقت کا بالواسطہ اظہار یعنی مجازِ لغوی۔ مزید سجاوٹ کے لیے یہ بھی کہہ دیجیے کہ لفظ ''استعارہ'' بذات خود ایک استعارہ ہے کیونکہ اُدھار لینے دینے کے رواجِ انسانی کو مجازاً ایک لفظ میں فرض کر لیا گیا ہے۔ درج ذیل تین متون پر نظر ڈالیے۔

۱) زندگی خواب جیسی ہے۔

۲) زندگی ایک خواب ہے۔

۳) شعر: حقیقت مان کر چلنا پڑے گا
ابھی ہم خواب سے جاگے کہاں ہیں

دونوں فقروں میں زندگی کو خواب سے تشبیہ دی گئی ہے اور شعر میں خواب، زندگی کا استعارہ ہے۔ جی ہاں! علمِ بیان کی درسی کتابیں ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ تشبیہ میں مشبہ (جس کو تشبیہ دی جائے، یہاں زندگی) اور مشبہ بہ (جس سے کسی چیز کو تشبیہ دیں، یہاں خواب) دونوں موجود ہوتے ہیں اور استعارے میں مشبہ (مستعار لہ) کا ذکر نہیں ہوتا۔ مغرب میں دوسرا فقرہ بھی بجا طور پر استعارے (Metaphor) کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ تو ہیں لیکن اَداتِ تشبیہ (حرف تشبیہ یا لفظِ تشبیہ مثلاً پہلے فقرے میں لفظ ''جیسی'') موجود نہیں ہے۔ مشرق میں عموماً اِسے ''تشبیہ مؤکد'' (تشبیہ مضمر الادات یا تشبیہ محذوف الادات) کہتے ہیں۔ میری دانست میں اسے استعارہ ہی کہنا چاہیے کیونکہ استعارے میں مشبہ کو بعینہٖ مشبہ بہ ٹھہرا لیتے ہیں اور یہ صورت اداتِ تشبیہ کو حذف کرنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ علامہ زمخشریؒ نے، جن کی تفسیر کشاف کو عربی علومِ ادب میں سند کی حیثیت حاصل ہے، کئی آیتوں کی تفسیر میں تشبیہ مؤکد کو استعارہ بتایا ہے۔ بطور خاص سورہ بقرہ کی 18ویں آیت صم بکم عم فہم لا یرجعون کی تفسیر میں اسی نکتے پر مفصل بحث کی ہے جو کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ وزیر آغا بھی اسے استعارہ مانتے ہیں، رقمطراز ہیں:

> ''تشبیہ دو چیزوں کی مشابہت کو کھول کر بیان کرتی ہے۔ استعارہ اس مشابہت کو اشارتاً یا کنایتاً پیش کرتا ہے۔ مثلاً اگر محبوب کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ایسے لگتی ہیں جیسے کوئی سمندر ہو تو یہ تشبیہ ہے لیکن 'آنکھ سمندر' کہہ دیا جائے تو یہ استعارہ ہے۔''[1]

شمس الرحمٰن فاروقی تشبیہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں، ''زید شیر کی طرح بہادر ہے۔ اس میں زید مشبہ ہے، شیر مشبہ بہ، اور بہادری وجہ شبہ یا ربط تشبیہی۔''[2] اس فقرے میں حرفِ تشبیہ ''کی طرح'' بھی موجود ہے۔ اسی مضمون میں فاروقی نے استعارے کی دو بنیادی شرائط بھی بیان کی ہیں، ''استعارہ دو مختلف اشیا میں مشابہت یا نقطۂ اشتراک کی دریافت کا نام ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وجہِ اشتراک کو واضح نہ کیا جائے۔۔۔۔ دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ مستعار لہ یا مستعار منہ میں سے ایک مذکور ہو اور ایک مقدر، یعنی ایک کا ذکر ہو اور ایک کا نہ ہو، اور استعارے کے لیے استعمال کیے گئے لفظ کے دونوں معنوں (یعنی حقیقی اور مجازی) میں ربط تشبیہی ہو، لیکن ربط تشبیہی مقدر ہو۔''[3] لیکن ایک دوسرے مضمون میں جب وہ استعارے کی مثال میں فقرہ ''زید شیر ہے'' نقل کرتے ہیں۔[4] تو گمان گزرتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی بھی تشبیہ مؤکد کو استعارہ مانتے ہیں۔

تشبیہ اور استعارے میں پائے جانے والے تکنیکی قرب و بعد کے علاوہ ان کے مابین پائی جانے والی معنوی مسابقت پر بھی نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ گوپی چند نارنگ تشبیہ کو استعارے کے مقابلے میں کم تر درجے کی چیز کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''زبان کے تخیلی استعمال کے سلسلے میں استعارے کے مقابلے میں تشبیہ کم تر درجے کی چیز ہے۔ تشبیہ بے شک شعری لوازم میں سے ہے لیکن اول تو اس کی معنوی فضا محدود ہوتی ہے اور استعارے کی لامحدود۔ دوسرے یہ کہ تشبیہ مشبہ بہ کے ساتھ آتی ہے اور اکثر و بیشتر اس کے ساتھ وجہِ تشبیہ اور حرفِ تشبیہ کا دُم چھلّا بھی لگا ہوا ہوتا ہے، جس سے نہ صرف طوالت اور لفاظی پیدا ہوتی ہے بلکہ اشاریت بھی مجروح ہوتی ہے۔''[5]

نارنگ کی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تشبیہ استعارے کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چیز ہے۔ یہ بھی قبول کہ وجہِ تشبیہ اور حرفِ تشبیہ اشاریت کو کمزور کرتے ہیں لیکن بقیہ دو وجوہات قابلِ غور ہیں۔

۱) تشبیہ کی معنوی فضا محدود اور استعارے کی لامحدود ہوتی ہے۔

۲) تشبیہ مشبہ بہ کے ساتھ آتی ہے یعنی استعارے میں مشبہ بہ نہیں ہوتا۔

پہلا بیان علامت کے لیے درست ہو سکتا ہے لیکن استعارے کے لیے نہیں کیونکہ استعارے کی معنوی فضا بھی محدود ہوتی ہے، توسیعی استعارہ (Extended Metaphor) ہو تب بھی۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ استعارہ، تشبیہ کے مقابلے میں زیادہ معنی خیز ہوتا ہے۔ ''زندگی خواب جیسی ہے'' اور ''زندگی ایک خواب ہے'' دونوں کی معنوی فضا محدود ہے لیکن ''خواب جیسی'' کہنے والا ذرا محتاط ہے اور اُس کا ذہن زندگی کو مجازاً بھی فی نفسہ خواب قرار دینے کے لیے تیار نہیں جبکہ

''خواب ہے'' کہنے والے کا انداز نسبتاً پُر اعتماد ہے۔ بالفاظ دیگر تشبیہ میں مجاز کو مجاز تسلیم کرنے کی کیفیت استعارے کے مقابلے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

دوسرے بیان میں شاید سہو کاتب ہوا ہے۔ مشبہ بہ (مستعار منہ) تو اکثر و بیشتر استعارے میں ہوتا ہے جسے ہم استعارہ بالتصریح کہتے ہیں۔ فقرہ ''زندگی خواب ہے'' اور مصرع ''ابھی ہم خواب سے جاگے کہاں ہیں'' دونوں مثالوں میں 'خواب' مشبہ بہ (مستعار منہ) موجود ہے۔ استعارے کی وہ قسم جسے ''استعارہ بالکنایہ'' کہا جاتا ہے اور جس میں مشبہ بہ (مستعار منہ) کا ذکر نہیں ہوتا، بلاشبہ استعارہ بالتصریح سے زیادہ زود اثر اور زیادہ معنی خیز ہوتا ہے لیکن یہاں بھی معنوی فضا محدود ہی ہوتی ہے۔ استعارہ بالکنایہ کی مثال دیکھیے:

لپٹ کے مجھ سے رو رہی ہیں حیرتیں
ملال تھا کہ رائگاں سفر گیا (امیر حمزہ ثاقبؔ)

حیرت (مشبہ/مستعار لہ) کو ایک ذی روح و ذی خرد شخص (مشبہ بہ/مستعار منہ) سے تشبیہ دی ہے اور مشبہ بہ کا ذکر محذوف ہے۔ گوپی چند نارنگ کے بیان پر وارث علوی نے خامہ فرسائی کی ہے۔ علوی لکھتے ہیں:

> ''میں اُن (نارنگ) سے پوچھنا چاہوں گا اور اپنی بات شاعری تک ہی محدود رکھوں گا کہ عظیم شاعری کی جو مثالیں ہمارے سامنے ہیں، آیا اُن میں صرف استعاروں سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہات سے بالکل سروکار نہیں رکھا گیا؟ اگر تشبیہ استعارے سے کم تر ہے تو کون سا بے وقوف شاعر ہوگا جو بہتر وسیلے کو چھوڑ کر کم تر وسیلے پر اعتبار کرے گا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر استعارے کے پہلو بہ پہلو تشبیہات کا استعمال بھی کرتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سخن رانی میں اکثر ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں تشبیہ جو کام دیتی ہے، وہ استعارہ نہیں کر سکتا۔ شاید اس کی وجہ وہی ہو جو نارنگ کے ذہن میں تشبیہ کی کمزوری کی شکل اختیار کرتی ہے کہ تشبیہ کی معنوی فضا محدود ہوتی ہے اور استعارے کی لامحدود۔ نظم میں بہر حال ایسے مواقع آتے ہوں گے جہاں شاعر محدود معنوی فضا سے کام لینا چاہتا ہوگا اور استعارے سے گریز کرنا چاہتا ہوگا کہ مبادا نظم استعارے کی لامحدود معنوی فضا میں تحلیل ہو کر مہین اور موہوم نہ بن جائے۔ استعارے کے استعمال میں بہت سے خدشات بھی پنہاں ہیں۔ مثلاً استعارہ بہت آسانی سے استعارہ در استعارہ کے پُر فریب جال میں شاعر کو پھنسا لیتا ہے۔ شاعر استعاروں کے پیچوں میں اُلجھتا رہتا ہے لیکن معنی کے گوہر تک نہیں پہنچ پاتا۔ پھر استعارے متحجر ہو جاتے ہیں جیسے ہمارے یہاں رات اور سحر کا استعارہ۔ استعارہ موہوم شاعری کے لیے فاحشہ کی آغوش کی مانند کھلی دعوت ہے۔ بے شک استعارہ روحِ شاعری ہے لیکن

شاعری کی بدکاری میں روح اُس کے جسم کی ساجھے دار بنتی ہے۔''[6]

حسبِ معمول وارث علوی کی بحث برائے بحث ہے۔ بے سود و بے ضرر۔ ایک نکتہ بھی ایسا نہیں جسے سنجیدگی سے لیا جائے۔ یہ شاید افسانے اور شاعری کے تخلیقی مراحل کو ایک پیمانے سے تولنے کا نتیجہ ہے یا شاید شعر کے تخلیقی عمل میں تفحّصِ الفاظ کے سلسلے میں حالؔی کے ہم خیال ہونے کا۔[7] یہ تو طفلانِ مکتب بھی جانتے ہیں کہ شعر کی تخلیق کوئی ایسا مشینی یا میکانکی عمل نہیں ہے کہ اپنے ہر خیال کو شعر بنانے سے قبل شاعر اس مسئلے میں سر کھپائے کہ اس خیال کی ترسیل کے لیے تشبیہ کارگر ہوگی یا استعارہ۔ عروض و آہنگ کی کفالت اور شاعر کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے خیال اور الفاظ عموماً ساتھ ساتھ نازل ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی ترسیل کے بعد بعض اوقات معمولی ترمیم کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

استعارے کے لغوی معنی پر مجازی معنی غالب آجانے سے ہی اس میں چمک پیدا ہوتی ہے لیکن بعض اوقات استعارہ اپنے لغوی معنی ہی میں لطف دیتا ہے۔ مثلاً

فلک یہ تو ہی بتا دے کہ حسن و خوبی میں
زیادہ تر ہے ترا چاند یا ہمارا چاند

''دوسرا چاند'' محبوب کا استعارہ ہے۔ اس کے حقیقی معنی ہی شعر میں لطف پیدا کرتے ہیں۔ امام جرجانیؒ نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''اسرار البلاغت'' میں اس کی مثال میں ابن العمید کے یہ شعر نقل کیے ہیں۔

قَامَت تُظَلِّلُنِی مِنَ الشَّمسِ
نَفسٌ أعَزُّ عَلَيَّ مِن نَفسِی
قَامَت تُظَلِّلُنِی ومِن عَجَبٍ
شَمسٌ تُظَلِّلُنِی مِنَ الشَّمسِ [8]

وہ مجھ پر سورج سے سایہ کیے کھڑی ہے
وہ جو مجھے عزیز ہے خود سے زیادہ
وہ سایہ کیے کھڑی ہے اور یہ عجیب بات ہے
سورج مجھ پر سورج سے سایہ کیے کھڑا ہے

آخری مصرعے میں ''پہلا سورج'' محبوب کا استعارہ ہے اور حقیقی معنی ہی شعر کو پر لطف بناتے ہیں اگرچہ استعارے کی وجہِ جامع قاری کے ذہن میں ایک موج کی طرح لہرا کر نکل جاتی ہے۔

علامتی یا تجریدی استعارے کے مخالفین تو خیر آج کل ہر گلی کوچے میں پائے جاتے ہیں لیکن نام نہاد اہلِ دانش کا ایک مکتبِ فکر ایسا بھی موجود ہے جو ہر قسم کے استعارے کے خلاف ہے۔ بلاشبہ یہ حضرات لائقِ اعتنا نہیں لیکن ایک قابلِ لحاظ تعداد اُن حضرات کی بھی ہے جو ادب میں (بالخصوص شاعری میں) مانوس و معروف استعاروں کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن نئے استعاروں کی ''دریافت'' کے خلاف ہیں۔ اُن کی دلیل ہے کہ زبان جو محض جذبات اور احساسات کی ترسیل کا ذریعہ ہے، علامتوں کی کوڈنگ اور ڈی کوڈنگ سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا کوڈنگ جتنی سہل ہوگی، ڈی کوڈنگ اُتنی ہی سرعت سے ہوگی۔ یہ معصوم ذہنیت دراصل ''عام قاری'' کی واپسی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہے اور عوامی زبان اور ادبی زبان کے درمیاں حائل گہری خلیج کو پاٹنے کا کارِ خیر انجام دینا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نیا استعارہ قاری سے ذہنی ورزش کا متقاضی ہوتا ہے کیونکہ کسی متن میں استعارے کی آمد کے ساتھ ہی قاری کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ استعارے کو پہچان لے، اُس کے لغوی معنی کو سامنے رکھے، پھر مجازی معنی کے تسلط و توفق کو قبول کرے، پھر طرفین کے باہمی ربط کو سمجھتے ہوئے لغوی معنی سے دستبردار ہو جائے۔ جواب یہی آئے گا کہ ''ہمیں امتحان نہیں دینا۔'' مگر امتحان دینے کا سوال تو تب آئے گا جب یہ سب سیکھنے سکھانے کی چیزیں ہوں۔ جوسیف روکس کا مشہور قول ہے، ''سائنس اُن کے لیے ہے جو سیکھتے ہیں اور شاعری اُن کے لیے ہے جو جانتے ہیں''۔[9]

بعض جذباتی قسم کے مذہبی حضرات کہتے ہیں کہ استعارہ کِذب کی ایک قسم ہے۔ ایسے مدعی تشبیہ کو گوارا کرتے ہیں کہ اس میں مغالطے کا امکان نہیں ہوتا۔ مثلاً ''زمین گیند جیسی ہے'' کو وہ صِدق مانتا ہے لیکن ''زمین گیند ہے'' کو کذب۔ حکیم مجمی رامپوری لکھتے ہیں:

> ''استعارہ اور کذب میں یہ فرق ہے کہ استعارے کی بِنا تاویل پر ہے یعنی مشبہ کے مشبہ بہ کی جنس سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس میں اس بات کا قرینہ قائم ہوتا ہے کہ یہاں معنی موضوع لہ مراد نہیں ہیں اور کذب میں تاویل و قرینہ نہیں ہوتا بلکہ جھوٹا آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے ظاہر قول کی صحت سامع کے نزدیک ثابت کرے بہ خلاف استعارے کے کہ اس میں اس بات پر قرینہ قائم کیا جاتا ہے کہ یہاں ظاہر کے خلاف مراد ہے۔''[10]

استعارے پر اس تہمت کی بنیاد مشاہدے پر کم اور قیاس پر زیادہ ہے اس لیے کئی مسائل کو جنم دیتی ہے۔ جب استعارے کو کذب مانا جائے گا اور آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ کلام اللہ میں کذب کے لیے گنجائش نہیں تو آپ اپنے ایمان کی خیر منائیں کیونکہ استعارے کی تکذیب قران کی سینکڑوں آیتوں کی تفہیم میں مانع ہو جاتی ہے۔ من کان فی ہذہ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی ''جو یہاں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔''[سورہ بنی اسرائیل۔

آیت 72]؛اس آیت میں اگر اعمیٰ کو کافر کا استعارہ نہ مان کر حقیقی معنی میں قبول کر لیں تو یہ مفہوم نکلے گا کہ تمام بصارت سے محروم نابینا افراد بشمول صحابی رسول ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالی عنہ آخرت میں بھی بصارت سے محروم رہیں گے (معاذ اللہ)۔ قرآن مجید کے جملہ شارحین ومفسرین نے اعمیٰ کو مجازی معنی ہی میں بیان کیا ہے۔خلاصہ یہ کہ موحد کے لیے استعارے سے فرار ممکن نہیں۔حالؔی لکھتے ہیں:

''بعض مضامین فی نفسہ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ اُن کو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو ادا کرتے وقت رو دیتی ہے اور معمولی اُسلوب اُن میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل وغیرہ سے مدد نہ لی جائے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی بات چیت ہو جاتی ہے۔''[11]

اس مفروضے کے بعد حالؔی نے استعارہ وتشبیہ کی تحسین میں داغؔ، غالبؔ اور میرؔ کے متعدد اشعار مع تشریح نقل کیے ہیں لیکن کوئی مثال ایسی پیش نہیں کی ہے جس میں کوئی دلچسپ اور دلکش مضمون ''محض صفائی اور سادگی'' سے (یعنی استعارہ، کنایہ، تمثیل، تشبیہ وغیرہ کی مدد لیے بغیر) بیان کیا گیا ہو۔حالؔی کے اس بیان سے کئی اشکالات جنم لیتے ہیں۔کیا کسی مضمون کو صفائی اور سادگی سے بیان کرنے والی زبان ''معمولی زبان'' اور اسلوب ''معمولی اُسلوب'' مان لیا جائے؟ کیا وہی مضامین ''فی نفسہ دلچسپ اور دلکش'' ہیں جنھیں کسی استعارہ، کنایہ، تشبیہ، تمثیل وغیرہ کی مدد لیے بغیر بیان کیا جا سکتا ہے؟ جن مضامین کو ''محض صفائی اور سادگی'' سے بیان کر دینا کافی (یا ممکن) ہو، کیا وہاں استعارہ، کنایہ یا تمثیل کے استعمال سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے؟ غالبؔ کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

اسی غزل کے یہ دو شعر بھی ملاحظہ ہوں:

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

میں نے یہ اشعار حالؔی کے بیان پر قائم کردہ سوالات کا حل ڈھونڈنے کے لیے پیش نہیں کیے ہیں اور نہ ہی مجھے یہ سوال کھڑا کرنا ہے کہ شعر کی کونسی قسم افضل و اعلیٰ ہے بلکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ شاعر کسی مضمون کو برتتے وقت یہ طے نہیں کرتا کہ اس کے لیے ''معمولی زبان و اسلوب'' کافی ہوں گے یا ''غیر معمولی زبان و اسلوب'' سے مدد لینی ہوگی۔ کھلے لفظوں میں کہوں تو استعارہ، کنایہ یا تمثیل شعر میں اپنی جگہ آپ تلاش لیتے ہیں اور جہاں اُن کے لیے گنجائش نہیں ہوتی وہاں اُنھیں جبراً ٹھونسا نہیں جاسکتا۔ جس کسی کو اس بات سے اختلاف ہو وہ غالبؔ کے اول الذکر دو اشعار میں اس کا تجربہ کامیاب کر دکھائے۔ انیس اشفاق کے نزدیک علامت کے مقابلے میں استعارہ نسبتاً شعوری کاوش ہے۔ رقمطراز ہیں:

> ''استعارے کی غیر شعوری تخلیق اس لیے بھی محال ہے کہ اس میں معروف مشاہدہ پہلے سے موجود رہتا ہے اور چونکہ اس کا اطلاق غیر معروف پر ہوتا ہے اور ہم دونوں میں کسی صفت کی مشابہت تلاش کرتے ہیں اور چونکہ معروف کے لیے ہی استعارہ وجود میں آتا ہے اس لیے وہ چیز جو پہلے سے مشاہدے میں موجود ہو غیر شعوری نہیں ہوسکتی۔''[12]

انیس اشفاق نے شعوری اور غیر شعوری تخلیق کے لیے جو شرط بیان کی ہے اگر اُس کی تصدیق کریں تو ہر ادبی اظہار میں استعارہ ہی نہیں بلکہ ہر لفظ کا غیر شعوری استعمال محال ہوگا کیونکہ شاعر یا نثّار کا ہر خیال ماضی کے کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے ہی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں بھی یہی مشاہدات محرک ہوتے ہیں، جو ضروری نہیں کہ اُسے یاد ہوں بلکہ وہ اُس کے تحت الشعور یا لاشعور کا حصہ بھی ہوسکتے ہیں۔ عام طور سے شعوری اور غیر شعوری تخلیق یا تصرف کی بنیاد ذہنی مشقت کی کمی و بیشی پر رکھی جاتی ہے حالانکہ جب تک خود شاعر یا ادیب یہ ظاہر نہ کردے کہ کس استعارے یا لفظ کے انتخاب میں اُس نے کتنی محنت کی تھی، شعوری و غیر شعوری تصرف کا بالیقین دعویٰ ممکن نہیں۔ زبان کے تخلیقی عناصر اور صنائع و بدائع کے تعلق سے ایک اضافی بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ان کی تخلیق اور تصرف شعوری ہونے کے سبب فن پارہ آورد ٹھہرتا ہے۔ میری دانست میں شعر میں استعارہ، تشبیہ یا صنائع و بدائع کے برتنے میں شعوری اور غیر شعوری کی بحث فضول ہے البتہ ہنرمندی اور تصنع پر بات ہوسکتی ہے (اگرچہ وہ بھی شعر کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے)۔ واضح ہو کہ میرے اس بیان میں ''شعوری اور غیر شعوری'' کا تعلق شاعر کے تخلیقی عمل سے ہے اور ''ہنرمندی اور تصنع'' کا تعلق قاری کے ردعمل سے۔ اگر شعر کی قرات پر قاری کا ذہن صنعت پر پہلے اور معنی پر بعد میں جاتا ہے تو یہ تصنع ہوا اور اگر معکوس ردِعمل ہو تو ہنرمندی۔ اب یہاں قاری کی قسمیات (Typology) میں اُلجھنے کا موقع نہیں ہے۔ اس قحط الرجال میں جب میں شعر کا قاری کہہ رہا ہوں تو میری مراد مشاعرے کا سامع نہیں ہوسکتا۔ عین ممکن ہے کہ کسی کلام میں کوئی صنعت حسنِ اتفاق سے، غیر شعوری طور پر، بے تکلفانہ واقع ہوئی ہو لیکن قاری تصنع محسوس کرے اور امرِ واقعہ اس کے برعکس ہونا بھی بعید از قیاس

نہیں۔خصوصاً آج کوئی اردو شاعر صنائع اور بدائع کے انبار سے فال نکال نکال کر شعر نہیں کہتا۔ ہاں اگر کوئی واقعی اس کا اقراری مجرم ہو تو اور بات ہے۔ پھر کئی صنعتیں فی نفسہ ہوتی ہی ایسی ہیں کہ انھیں شاعر ہمیشہ شعوری طور پر برتتا ہے مثلاً صنعت منقوطہ، صنعت غیر منقوطہ، صنعت توشیح وغیرہ البتہ جس زمانے میں رعایتِ لفظی کی صنعتیں معراجِ شاعری سمجھی جاتی تھیں تب بھی صف اول کے شعرا انھیں اس کمال ہنرمندی سے برتتے تھے کہ تصنع کا گمان نہ گزرتا تھا۔ صنعتیں ہوں یا مجملہ تخلیقی عناصر، ان کے شعوری تصرف کے لیے بھی حسنِ سلیقہ درکار ہوتا ہے۔ رعایت لفظی کی تقریباً تمام اہم صنعتیں میر انیسؔ نے اپنی شاعری میں جا بجا برتی ہیں تو کیا ہم انیسؔ کے اشعار کو آورد کہہ کر ٹھکرا سکتے ہیں۔ یہ تاویل بھی نہ کیجیے کہ انیسؔ کے یہاں یہ غیر شعوری طور پر در آئی ہیں۔ ماہر انیسیات سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''انیسؔ کے زمانے میں رعایت لفظی کے استعمال کا وہ زور تھا کہ لوگ اسی کو اصل شاعری سمجھنے لگے تھے۔ اپنے ماحول سے بالکل متاثر نہ ہونا تو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انیسؔ نے بھی اس صنعت کو خوب استعمال کیا لیکن اُن کے صحیح مذاق نے وہ اعتدال قائم رکھا کہ اُن کے کلام میں امانتؔ کا رنگ نہیں آنے پایا۔ ابتدائی کلام میں کہیں کہیں یہ رعایت حد مناسب سے کسی قدر تجاوز بھی کر گئی ہے۔''[13]

شبلی نعمانی نے بھی میر انیسؔ کے زمانے کی ''فتح خوانی'' کی ہے اور ایک دلچسپ روایت اس دعوے کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ وہ مستند اور صحیح ہے:

''میرے ایک معزز دوست نے خود میر انیسؔ سے پوچھا کہ کیا آپ لفظی رعایتوں اور صنائع بدائع کو پسند کرتے ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ نہیں لیکن آخر لکھنو میں رہنا ہے۔''[14]

استعارے کا تصرف شعوری ہو یا غیر شعوری، اس میں زبان کی تہذیب کام کرتی ہے۔ کوئی بھی استعارہ کہیں بھی کھپ جائے ایسا ممکن نہیں۔ فیض آزادی کے لیے رات کا نہیں بلکہ سحر کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ لفظ سحر مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اب سحر کے سارے انسلاکات آزادی کے ساتھ جوڑ دیے جائیں گے۔ محض اُجالے کی مناسبت مقصود نہیں کیونکہ اُجالے کی فراوانی وقتِ سحر کی بہ نسبت دوپہر میں ہوتی ہے۔ آزادی کے لیے استعارہ بننے سے قبل بھی سحر اندھیرے کے خاتمے پر دال ہے۔ سحر اجالا ہے، فرحت بخش اجالا ہے، سحر تازگی کا احساس ہے، سحر نئے سفر کا آغاز ہے، اُوس کی ٹھنڈک ہے، کونپل کی انگڑائی ہے، کلی کا تبسم ہے۔ ایک سحر کے استعارے کے اطراف کئی غیر ملفوظی استعاروں کی کہکشاں جگمگا اُٹھتی ہے۔ ہربرٹ ریڈ کا مشہور قول ہے:

''استعارہ مشاہدے کی متعدد اکائیوں کو واحد باوقار پیکر میں سمونے کا نام ہے؛ کسی پیچیدہ خیال کا ایسا اظہار جو کسی تجزیے یا تصریح کے بغیر طرفین کے باہمی (مماثلتی) ربط کے فی الفور ادراک سے حاصل ہوتا

ہے''۔[15]

استعارہ صرف ''اسم'' ہی نہیں ہوتا بلکہ ''فعل یا صفت'' بھی ہوسکتا ہے۔فعل کی مثال میں محاورے پیش کیے جاسکتے ہیں۔حالؔی فرماتے ہیں:

''اُردو میں شعرا نے استعارے کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کر کے دیکھا جائے تو استعارے پر ہوتی ہے مثلاً جی اُچٹنا؛ اس میں جی کو اُن چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اُچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر، پتھر، گیند وغیرہ۔۔۔ ہزارہا محاورے استعارے پر مبنی ہیں اور یہ وہ استعارے ہیں جن میں شعرا کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ نیچرل طور پر بغیر فکر اور تصنع کے اہل زبان کے منہ سے وقتاً فوقتاً نکل کر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔''[16]

اُردو محاورے پر بات کرنے سے پہلے موحدین کی تشفی قلب کے لیے ایک مثال قرآن کریم سے بھی لیتے ہیں: ولا تحزن علیہم و اخفض جناحک للمومنین ''اور (اے نبیؐ) اُن (مشرکین) کا غم نہ کھا اور مومنین کے لیے اپنے بازو جھکائے رکھ۔''[سورہ حجر۔آیت 88]

''اِس محاورے (بازو جھکائے رہنا) کی اصل یہ ہے کہ جب پرندہ اپنے بچوں کو اپنے سایہ شفقت میں لیتا ہے تو اُن کو اپنے بازوؤں یعنی پروں میں لے لیتا ہے۔''[17]

''جَناح بمعنی پرندے کا پر یا بازو۔۔۔ انسان کے دونوں بازوؤں پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔۔۔ کندھے سے کہنی تک عَضُد، کہنی سے درمیانی اُنگلی کے آخری سرے تک ذِراع اور ان دونوں کا مجموعہ یعنی کندھے سے اُنگلی کے سرے تک جَناح ہے۔''[18]

محاورہ چاہے کسی زبان کا ہو، اُس کے مجازی معنی ہی اُس کی تفہیم کے ضامن ہوتے ہیں۔محاورے کی استعاراتی حیثیت اُسے لطف انگیز بناتی ہے ورنہ حقیقی معنی کی پابندی تو اُسے لطیفہ بنادے گی۔

جھوٹ موٹ بھی ہونٹ کھلے تو دل نے جانا، امرت پایا
ایک اک میٹھے بول پہ مورکھ دو دو ہاتھ اچھل جاتا ہے (میراجؔی)

میراجؔی کا دل تو محض دو دو ہاتھ اُچھل رہا ہے ورنہ اُردو والے تو ایک محاورہ ''دل بلیوں اُچھلنا'' بھی رکھتے ہیں۔صفت کی مثال لیجیے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا (ولؔی)

ولی کے دوسرے مصرعے میں ''جادو'' بمعنی ''سحر'' کے بجائے بمعنی ''سحر انگیز'' مستعمل ہے اور یہ سحر انگیزی حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔ اس غزل کے اشعار میں لوگ تشبیہات کی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً اس شعر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہاں محبوب کے لب کو لعل بدخشاں اور نین کو چشمِ غزالاں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ مغالطہ ''سوں'' کے معنی ''مانند'' فرض کر لینے سے پیدا ہوتا ہے جبکہ یہاں ''سوں'' بہ معنی ''سے۔کو'' (to) مستعمل ہے۔ تشبیہ کی ایک شرط یہ ہے کہ مشبہ بہ اُس صفت میں زیادہ ہو جس کی وجہ سے تشبیہ دی جائے۔ اسی لیے مومن کہتے ہیں:

ناکامیوں میں تم نے جو تشبیہ مجھ سے دی
شیریں کو دردِ تلخیِ فرہاد آ گیا

ولی کے اشعار میں عاشق کا عندیہ یہ ہے کہ محبوب کی خوبیاں گِنا کر دوسروں کو رشک زدہ کیا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ جس صفت پر تمھیں ناز ہے، وہ میرے محبوب میں تم سے زیادہ ہے (حالانکہ واقعہ پھر بھی برعکس ہے)۔ اس غزل کے دوسرے شعر ملاحظہ ہوں:

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی
یو کشور ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا
تعریف ترے قد کی الف وار سری جن
جا سرو گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا
جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن
یہ سوز ترا مشعلِ سوزاں سوں کہوں گا
یک نقطہ ترے صفحۂ رُخ پر نئیں بے جا
اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا
قربان پری مکھ پہ ہوئی چوب سی جل کر
یہ بات عجائب مہ تاباں سوں کہوں گا

بعض تلمیحات بھی استعارے کی صورت میں استعمال ہوتی ہیں۔

الٰہی! کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی (اصغر گونڈوی)

اصغر گونڈوی کے اس شعر میں ''مشتِ خاک'' نوعِ انسانی کا استعارہ ہے اور تلمیح بھی ہے آدم کی تخلیق سے۔ الیکشن کے

زمانے میں ہمیں ایسی سرخیاں اکثر اخباروں میں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ فلاں حلقے سے کئی رتھی، مہارتھی میدان میں ہیں۔ رتھی، مہارتھی بھی اساطیری استعارے ہیں۔ یہ ہندو مذہب کی رزمیہ داستان مہابھارت میں جنگجوؤں کی اقسام ہیں۔ مہابھارت کے اُدیوگ پرب میں پتامہا بھِشم ایک مقام پر دُریودھن کے سامنے پانڈوؤں کے لشکر میں شامل رَتھی، اَتی رتھی اور مہارتھی جنگجوؤں کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔[19] رَتھی یعنی ایسا جنگجو جو پانچ ہزار عام لڑاکوں پر غالب آ سکتا ہے، اَتی رتھی یعنی ایسا جنگجو جو بارہ رتھی جنگجوؤں یا ساٹھ ہزار عام لڑاکوں پر غالب آ سکتا ہے اور مہارتھی یعنی ایسا جنگجو جو بارہ اَتی رتھی جنگجوؤں یا سات لاکھ بیس ہزار عام لڑاکوں پر غالب آ سکتا ہے۔

یہ نکتہ موضوع سے خارج ہے کہ استعارے کا برتاؤ قدرتِ کلام کا مظہر ہے یا عجز کا اور نہ ہی یہاں کسی طرح کی تحذیر یا ترغیب مقصود ہے۔ چلیے، اصل موضوع سے معاملہ کرتے ہیں یعنی استعارے کی موت سے۔ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> ''ہم زبان سے جو فقرہ بھی کہیں، اُس میں بھولا ہوا یا زبردستی بھلایا ہوا تجربہ اور پوری عمر کا تجربہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یعنی ہمارا ایک ایک فقرہ استعارہ ہوتا ہے۔ استعارے سے الگ اصل زبان کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ زبان خود استعارہ ہے۔ چونکہ زبان اندرونی تجربے کا قائم مقام بنانے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ہر لفظ ہی ایک مردہ استعارہ ہے۔ اصل زبان یہی ہے۔ یہاں آپ اعتراض کریں گے کہ اگر ہر لفظ استعارہ ہے تو پھر الگ سے استعارے کی بحث ہی بے کار ہے یا یہ کہیں گے کہ جن استعاروں کا مطلب صرف ماہرِ نفسیات سمجھ سکیں اُن سے ادب کے طالب علموں کو کیا سروکار۔ ہمیں تو اُن استعاروں سے غرض ہے جنھیں ہم بھی استعارہ سمجھیں۔ یعنی وہ استعارہ جنھیں شاعر یا نثر نگار انفرادی طور سے تخلیق کرتا ہے۔ چلیے عام الفاظ سے امتیاز کرنے کے لیے انھیں زندہ استعارہ کہہ لیجیے۔ لیکن زندہ اور مردہ دونوں قسم کے استعارے آخر ایک ہی عمل کے ذریعے اور ایک ہی اُصول کے مطابق تخلیق ہوتے ہیں۔''[20]

مذکورہ بالا سطور محمد حسن عسکری کے مضمون ''استعارے کا خوف'' سے مقتبَس ہیں جس میں عسکری یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حالؔی ''جیسے نقادوں کی تنگ نظرانہ عقل پرستی اور احتیاط پسندی نے اُردو والوں کے دل میں استعارے کا خوف پیدا کر دیا''۔ محمد حسن عسکری کے الزام کو اگر حقائق کی روشنی میں پرکھا جائے تو اس کا بے بنیاد ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ حالؔی کی تنقیدی نکتہ پردازی سے آج کوئی متاثر نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حالؔی نے کبھی نہ استعارے کی مخالفت کی اور نہ ہی استعارے کا خوف پیدا کیا۔ ''استعارہ بلاغت کا ایک رُکن اعظم ہے اور شاعری کو اُس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔'' ایسا کہنے والے حالؔی بھلا استعارے کے مخالف یا استعارے سے خائف کیونکر ہو سکتے ہیں۔ دیوان میں اُن کی ''جدید'' غزلوں پر سرسری نظر دوڑائیں تو جگہ جگہ استعاروں کا برمحل استعمال دکھائی دیتا ہے۔ البتہ امداد

امام آثر تشبیہ یا استعارے کو شعر کے خارجی عوامل میں شمار کرتے ہیں اور ان کے استعمال کو زبان کی سادگی (کذا؟) کے منافی گردانتے ہیں اس لیے جب ''کاشف الحقائق'' میں غزل گوئی کے لیے ہدایات نامہ مرتب کرتے ہیں تو شعرا کو تشبیہ اور استعارے سے حتی الامکان بچنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر شعر کی فطری خوبیوں میں مخل نہ ہوں تو تشبیہ، استعارہ یا مبالغہ سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔[21]

یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ لوٹتے ہیں ''نظریۂ مرگِ استعارہ'' کی طرف۔ کیا استعارے مرتے ہیں؟ اگر مرتے ہیں تو کیا جیتے بھی ہیں؟ جی ہاں! زندگی کا فسانہ چھڑے گا تو دونوں صورتیں پائی جائیں گی؛ زندہ استعارہ (Alive Metaphor) اور مردہ استعارہ (Dead Metaphor)۔ محمد حسن عسکری کا یہ بیان کہ ہر لفظ ہی ایک مردہ استعارہ ہے، نظریۂ مرگِ استعارہ کی رو سے درست مانا جائے گا۔ یہ بیان فی الاصل ارجنٹینیا کے شاعر لیو پولڈو لوگونیس کا ہے۔ لیکن شاید اردو میں ''زندہ و مردہ استعارے'' کا ذکر پہلی بار محمد حسن عسکری کے پاس ہی آیا ہے تاہم انھوں نے اس تقسیم کے بنیادی مباحث کو نہیں چھیڑا۔ اُن کا یہ مفروضہ بھی درست نہیں کہ ''زندہ اور مردہ دونوں قسم کے استعارے آخر ایک ہی عمل کے ذریعے اور ایک ہی اُصول کے مطابق تخلیق ہوتے ہیں''۔ محمد حسن عسکری کے بیان پر معید رشیدی نے عمدہ بحث کی ہے:

> ''عسکری صاحب مردہ استعارے کی بات کرتے ہیں، یعنی زندہ استعارہ بھی کوئی شے ہے۔ اصل زبان استعارہ کیوں ہے؟ ہم نے ایک رقیق شے کو پانی فرض کر لیا۔ مفروضہ استعارے کی کلید ہے، لیکن اس میں بعض رعایتیں / مماثلتیں بھی ہونی چاہئیں۔ ہر استعارہ اپنی اساس رکھتا ہے۔ روزمرہ / گفتگو یا اصل زبان میں پانی محض ایک پینے یا پیاس بجھانے والی چیز ہے۔ اس میں اجتماعی اتفاق ہے۔ یہی پانی جب ادبی تخلیق میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد زندگی ہوتی ہے۔ یعنی پانی اگر محض پیاس بجھانے والی کوئی شے ہو تو مردہ استعارہ ہے، اور اس سے مراد زندگی ہو تو زندہ استعارہ ہے۔ ہر لفظ ایک مردہ استعارہ ہے۔ اس میں زندہ استعارہ بننے کی قوت ہوتی ہے۔ گویا ہر لفظ میں استعارہ بننے کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔''[22]

معید رشیدی نے ہر دو طرح کے استعاروں کے لیے ''پانی'' کی مثال پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''پانی بمعنی پیاس بجھانے والی شے، مردہ استعارہ'' اور ''پانی بمعنی زندگی، زندہ استعارہ'' ہے۔ یہاں تک معید رشیدی کی بات دُرست مانی جائے گی لیکن ''پانی بمعنی پیاس بجھانے والی شے'' کو مردہ استعارہ قرار دینے کی جو توجیہ اُنھوں نے کی ہے، قابلِ غور ہے۔ اگر معید رشیدی کی مانیں تو ہر لفظ میں چونکہ استعارہ بننے کے امکانات موجود ہوتے ہیں اس لیے استعارہ بننے سے پہلے اُسے مردہ استعارہ سمجھا جائے گا۔

مغرب میں اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ''زندہ و مردہ استعارات'' کی بحثیں عروج پر تھیں۔ لیو پولڈ ولوگونیس اکتوبر 1909ء میں اپنے شعری مجموعے Lunario Sentimental کے مقدمے میں ہر لفظ کے استعارہ ہونے کا تذکرہ کرتا ہے۔ لوگونیس لکھتا ہے، ''زبان جو کہ پیکروں کا مجموعہ ہوتی ہے، غور کیا جائے تو ہر لفظ میں ایک استعارہ رکھتی ہے۔ اس لیے نئے اور خوبصورت پیکر دریافت کرنا اور اُنھیں وضاحت و اختصار کے ساتھ پیش کرنا نہ صرف افزائشِ لغت کے لیے ضروری ہے بلکہ زبان کو نکھارنے کے لیے بھی۔''[23] لوگونیس کی مراد یہی ہے کہ ''ہر لفظ ایک مردہ استعارہ ہے'' جیسا کہ متاخرین نے سمجھا ہے اسی لیے یہ مشہور قول "Every word is a dead metaphor" لوگونیس ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ٹی ای ہیوم ایک جگہ لکھتا ہے، ''زبان میں ہر لفظ کی پیدائش ایک استعارے کی صورت میں ہوتی ہے۔''[24] ایک دوسرے مضمون میں ہیوم اس کی مثال بھی پیش کرتا ہے، ''پہاڑ درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔۔۔ یہ فقرہ آج ہمیں بس حقائق پر مبنی ایک بیان محسوس ہوتا ہے لیکن جب یہ پہلی بار استعمال ہوا تھا تو یہ ایک پیکر (image) تھا، مناسبت لباس سے جو انسان کے بدن کو ڈھانکتا ہے۔''[25]

ہیوم نے استعارہ (metaphor) کے بجائے پیکر (image) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بلاشبہ یہ فقرہ ''پہاڑ درختوں سے ڈھکا ہوا تھا'' ایک بصری پیکر تخلیق کرتا ہے اور یہاں ''ڈھکا ہونا'' حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں مستعمل ہے جیسے کہ خود ٹی ای ہیوم نے نشاندہی کی ہے۔ سی ڈے لیوس نے اپنے مضمون ''پیکر کا مزاج'' میں پیکر کے استعاراتی پہلو کی اس طرح وضاحت کی ہے:

> ''سادہ ترین لفظوں میں کہا جائے تو پیکر لفظوں سے بنی ایک تصویر ہوتی ہے۔ کوئی لقب (epithet)، استعارہ یا تشبیہ بھی پیکر بنا سکتے ہیں اور ایک فقرہ یا بظاہر مفصل عبارت بھی کوئی پیکر پیش کر سکتی ہے لیکن پیکر ہمارے تخیل کو خارجی حقیقت کے محض عکس سے کچھ آگے تک پہنچاتا ہے یعنی ہر شاعرانہ پیکر کچھ حد تک استعاراتی (metaphorical) ہوتا ہے۔''[26]

ہیوم کے معروضات پر اُردو کے کئی نقاد صاد کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ استعارہ جب مردہ ہو جاتا ہے تو شعر کی زبان اُسے خارج کر دیتی ہے اور وہ محاورہ بن جاتا ہے۔ اقتصادیات کا مشہور قانون کہ خراب سکے اچھے سکوں کو بازار سے نکال دیتے ہیں، شعر کی دنیا پر دوسری طرح صادق آتا ہے۔ نیا استعارہ پرانے استعارے کو محاورہ بنا دیتا ہے اور اُسے ملک بدر کر دیتا ہے۔ ورنہ دل ٹوٹنا، آنکھ لڑنا، پانی پانی ہونا، سبز باغ دکھانا، ہوا باندھنا وغیرہ ہزار ہا محاوروں نے کیا بگاڑا تھا

کہ ان کو اب شعر میں استعمال کرنے سے آنند نرائن ملا بھی شرماتے ہیں۔ کیا یہ استعارے نہیں ہیں؟ دل بھلا کب ٹوٹتا ہے؟ اور آنکھ کیونکر لڑتی ہے؟ آدمی پانی میں کہاں تبدیل ہوتا ہے؟ یہ سب استعاراتی بیان ہیں لیکن کثرتِ استعمال کی وجہ سے ان کی استعاریت مردہ ہوگئی ہے۔ اب یہ محاورے بن کر زبان کی متلاطم گدلی سطح پر بے مدعا تیرتے پھرتے ہیں۔''[27]

محاورے یا مردہ استعارے شعری زبان میں جگہ پاتے ہیں یا نہیں، اس پر علاحدہ سے بحث کی جاسکتی ہے۔ فی الحال ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ فاروقی ہر محاورے کو مردہ استعارہ شمار کرتے ہیں اور استعاراتی زبان میں مردہ مچھلی جو ''زبان کی متلاطم گدلی سطح پر بے مدعا تیرتی پھرتی ہے۔'' ٹی ای ہیوم کی بات ممتاز حسین نے بھی دہرائی ہے:

''غصے کا بھڑکنا جو محاورہ بنا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ وہ ابتداً استعارہ تھا جس میں مستعار لہ (مستعار منہ؟) محجوب تھا۔ محاورہ بنتا اسی بنیاد پر ہے۔ ہر ایک محاورہ استعارہ ہے اور جو استعارہ نہیں وہ محاورہ نہیں بلکہ روزمرہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ محاورے کثرتِ استعمال سے کجلا جاتے ہیں تو ہم اُنھیں روزمرہ میں اس طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح کہ عام لفظ ہماری زبان پر آتے ہیں۔''[28]

لیکن ممتاز حسین نے محاورے کو صاف طور پر مردہ استعارہ نہیں کہا بلکہ انھوں نے آگے اسی مضمون میں یہ دونوں اصطلاحیں یعنی زندہ استعارہ اور مردہ استعارہ بالترتیب کامیاب استعارہ اور ناکام استعارہ کے لیے استعمال کی ہیں۔[29]

دراصل یہ نظریہ کہ ''ہر لفظ ایک مردہ استعارہ ہے''، ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی طرح کلی طور پر قیاسی ہونے کے باوجود خاصا مقبول ہے اور جس طرح نظریۂ ارتقا کی تردید کرنے والے بے شمار ہیں، اسی طرح ''نظریۂ مرگِ استعارہ'' کے انکاری بھی کم نہیں۔ انگلش ڈکشنریوں میں مردہ استعارے کی تعریف اس طرح منقول ہوتی ہے، ''مردہ استعارہ یعنی وہ استعارہ جو کثرتِ استعمال کے سبب اپنی مجازی قدر کھودے۔''[30]

استعارے کے ضمن میں مجازی قدر (figurative value) کے لیے ہم ''استعاراتی حیثیت'' کی اصطلاح استعمال کریں گے۔ استعاراتی حیثیت کھودینے کے بعد بھی مردہ استعارہ اپنے روایتی یا رائج معنی کے ابلاغ کے باعث کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ مردہ استعاروں کا وجود درحقیقت زبان کے ارتقا میں ایک معنیاتی تبدیلی (semantic change) کا نتیجہ ہے۔ مردہ استعارے کے کوئی حقیقی معنی نہیں ہوتے یا یوں کہہ لیجیے کہ مجازی معنی ہی حقیقی معنی بن کر رائج ہوجاتے ہیں۔ no figurative value سے مراد تو یہ لیا جانا چاہیے کہ ان استعاروں کی ''استعاریت'' غور و تامل پر بھی ظاہر نہیں ہوتی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب نقاد حضرات چند منتخب الفاظ یا محاوروں کو مردہ استعارے کی مثالوں میں پیش کرتے ہیں تو ساتھ ہی اُن سبھی کی استعاریت بھی واضح کردیتے ہیں۔

تجزیاتی فلسفی میکس بلیک نے یہ بحث اُٹھائی تھی کہ جو استعارہ اپنی استعاراتی چمک کھودے، اُسے مردہ استعارہ کہنے کی بجائے کیوں نہ کوئی دوسری اصطلاح وضع کی جائے کیونکہ اُس کی دانست میں مردہ استعارہ کسی طور میں استعارہ کہلانے کے لائق نہیں ہوتا۔[31] آپ اِسے ادبی انتہا پسندی کہہ سکتے ہیں۔ میکس بلیک زندہ استعارے کے لیے Active Metaphor کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور اس کی ذیلی درجہ بندی Strong اور Weak کرتا ہے۔ مغرب میں ہنوز اصطلاح Dead Metaphor ہی بالعموم استعمال ہوتی ہے۔ البتہ بعض لوگ Frozen یا Fossilized جیسی اصطلاحیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہیں زندہ استعاروں کو Alive کے بجائے Living بھی کہا جانے لگا ہے۔

مغرب میں مزید دو اصطلاحیں Stale Metaphor (فرسودہ یا باسی استعارہ) اور Dormant Metaphor (خوابیدہ استعارہ) بھی رائج ہیں جو اکثر و بیشتر مردہ استعارے ہی کے لیے استعمال ہوتی ہیں لیکن بعض ماہرین مردہ اور خوابیدہ استعاروں میں اس طرح تفریق کرتے ہیں کہ مردہ استعارہ، وہ استعارہ ہے جو اپنی تخلیقی دلالت کے گم ہو جانے کے سبب مردہ ہو جائے اور خوابیدہ یا فرسودہ استعارہ، وہ استعارہ ہے جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے اپنی استعارتی چمک کھودے۔ شمیم حنفی نے بھی محاورے کو ''سوئے ہوئے استعارے'' سے تعبیر کیا ہے۔[32] تاہم صرف محاورے ہی خوابیدہ استعارے نہیں ہیں۔

خوابیدہ استعارے کی ایک عمدہ مثال ہے ''بزدل''۔ اسے بہادر کی ضد کے طور پر ڈرپوک کے مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی لغوی (literal) ساخت اور استعاراتی حیثیت پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ کسی کو بزدل کہتے ہوئے ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہم اُسے بکرے (یا بکری) جیسا دل رکھنے والا کہہ رہے ہیں۔ جن حضرات نے شارق کیفی کی نظم ''روتا ہوا بکرا'' پڑھی ہے، وہ گواہی دیں گے کہ شارق کیفی کا بکرا ببلو کے بکرے سے پٹا ضرور تھا لیکن وہ ''بزدل'' قطعاً نہیں تھا۔ شاید اس ایک مثال سے آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ استعارہ کیسے کثرتِ استعمال کی وجہ سے اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ جب بزدل کی استعاراتی حیثیت دُھندلائی تو اس کے سارے مشتقات اُسی حال کو پہنچ گئے مثلاً بزدلی، بزدلانہ وغیرہ لیکن یہ معاملہ ''شیر دل'' کے ساتھ نہیں ہوا اسی لیے کثرتِ استعمال کے باوجود شیر دل، آج بھی ایک زندہ استعارہ ہے۔ ''شیر دل'' میں شیر کی دھاڑ گونجتی ہے۔ ایک اور مثال لیجیے ''خوبصورت''۔ کسی منظر یا شعر سے متاثر ہو کر ہم بے ساختہ کہہ دیتے ہیں کہ ''خوبصورت منظر ہے''، ''خوبصورت شعر ہے'' اور ہمارا ذہن اس طرف بالکل نہیں جاتا کہ ہم نے منظر یا شعر کی تعریف میں لفظ ''خوب+صورت'' حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اب ہم اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ کسی بھی شخص کی ایک عام سی گفتگو مردہ اور خوابیدہ استعاروں کی متعدد کڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

کہاوتیں، ضرب الامثال، محاورے، اساطیری یا تلمیحی حوالے اُن کے تخلیقی پس منظر اور منطقی مناسبتوں کے موہوم ہو

جانے کے باوجود عوام وخواص کی عام گفتگو میں بے ساختہ اور برمحل استعمال ہوتے رہتے ہیں۔کئی اسم بھی اس تبدیلی کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔عورتوں کی لغات سے چند مثالیں پیش ہیں۔چاندنی (چاند کی روشنی)،اُس سفید پتلی چادر کو کہتی ہیں جو دری یا شطرنجی پر بچھائی جاتی ہے۔گاؤ تکیہ (بیل کا کوہان)،اُس گول تکیے کو کہتی ہیں جو مسند صدر پر رکھا جاتا ہے۔پنجہ (حیوان کا کفِ دست)،ایک قسم کا چوڑا چمچہ جو عورتیں پکے ہوئے چاول نکالنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔اور بھی کئی الفاظ ایسے ہیں جنھیں عورتیں،اُنکے استعاراتی پہلو کو نہ سمجھتے ہوئے بھی،اپنی عام بات چیت میں استعمال کرتی رہتی ہیں۔ مزے کی بات تو یہ کہ بہت سارے نئے نئے محاورے ہر زبان میں عورتیں ہی ایجاد کرتی ہیں اور پھر اُنھیں اس کثرت سے استعمال کرتی ہیں کہ اُس کا استعاراتی پہلو دب کر رہ جاتا ہے۔ایسی ہی مثالوں کے پیش نظر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کثرتِ استعمال سے استعارے کی بتدریج موت واقع ہوتی ہے اور یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جو لفظ آج ہمیں استعارے نہیں معلوم ہوتے،اُن کی پیدائش بھی کسی استعارے ہی کی شکل میں ہوئی ہوگی لہٰذا ہر لفظ استعارہ ہے،کوئی زندہ تو کوئی مردہ۔

نظریۂ مرگِ استعارہ کی صداقت کی دلیل میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زبان کی سرحدیں جس طرح الفاظ کے نفوذ وخروج کے حق میں سیال ہوتی ہیں بعینہٖ اُسی طرح استعاروں کی پیدائش اور موت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔کب کون سا زندہ استعارہ اپنی چمک دمک کھو کر مردہ استعاروں کی فہرست میں شامل ہو جائے کہا نہیں جا سکتا اور زبان ہر مردہ استعارے کو زندہ استعارہ بنانے کی طاقت بھی ضرور رکھتی ہے۔

عرف عام میں مردہ استعارے کہلائے جانے والے الفاظ یا محاوروں کو مردہ کی بجائے فرسودہ یا خوابیدہ استعارہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ عام گفتگو کے دوران استعمال ہونے پر ان کے لغوی معنی کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ان استعاروں کی شفافیت (transparency) اُن کی استعاراتی صفات کو بیشتر افراد کے لیے مخفی بنا دیتی ہے اور وہ اُنھیں محسوس کیے بغیر سرعت سے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن اگر علاحدہ سے ان پر غور کیا جائے تو ان کا استعارہ ہونا عیاں ہو جاتا ہے۔ایسے استعاروں کو مردنی استعارہ (Dying Metaphor) کہنا بھی گوارا نہیں کیونکہ سالوں اور صدیوں سے ''حالت نزع'' میں سمجھے جانے کے باوجود ہزاروں محاروں کی استعاراتی دلالت کو کشید کیا جا سکتا ہے۔

پھر مردہ استعارہ کی تخصیص کیسے ہو؟ میں نے معید رشیدی کی پیش کردہ مردہ استعارے کی مثال ''پانی بمعنی پیاس بجھانے والی شے'' کی تائید کی تھی۔اس کی توجیہ یوں ہوگی کہ جب پہلی بار پیاس بجھانی والی شے کو پانی نام دیا گیا ہوگا تو اُس کی کوئی استعاراتی بنیاد ضرور رہی ہوگی جو لفظ ''پانی'' کے کثرت استعمال کے سبب یا اُس کے لغوی اسبابِ تشکیل سے توجہ ہٹ جانے کے سبب بتدریج بھلا دی گئی اور ''پانی'' جو کسی زمانے میں ایک زندہ استعارہ تھا،آج مردہ استعارہ ہو گیا اور یہ دعویٰ ہر اُس لغت کے ساتھ ممکن ہے جس کی تخلیقی دلالت سے ہم آج اجتماعی طور پر نا آشنا ہیں۔یہاں میرا سارا زور لفظ

''اجتماعی'' پر ہے کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عموماً جنھیں مردہ استعارہ کہا جاتا ہے، اُن کی استعاراتی خوبی بیشتر افراد کے لیے مخفی ہوتی ہے لیکن بعض کے لیے نمایاں بھی ہوسکتی ہے یا علاحدہ غور وتامل کرنے پر سبھی کے لیے نمایاں ہوجاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر لفظ استعارہ ہے، کوئی زندہ، کوئی مردہ اور کوئی خوابیدہ۔

حوالہ جات:

[1] وزیر آغا: علامت کیا ہے، مشمولہ معنی اور تناظر، انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2000ء، ص49۔

[2] شمس الرحمٰن فاروقی: علامت کی پہچان، مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، سوئم ایڈیشن، 2005ء، ص142۔

[3] ایضاً۔

[4] شمس الرحمٰن فاروقی: ن۔م۔راشد۔صوت ومعنی کی کشاکش، مشمولہ شعر، غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، سوئم ایڈیشن، 2005ء، ص330۔

[5] گوپی چند نارنگ: بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں، مشمولہ فکشن شعریات ۔تشکیل وتنقید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009ء، ص111۔

[6] وارث علوی: استعارہ اور نرالفظ، مشمولہ بت خانۂ چین، گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، 2010ء، ص598۔

[7] وارث علوی: حالؔی، مقدمہ اور ہم، کتابی دنیا، دہلی، 2012ء، ص53-56۔

[8] امام ابوالقاہر الجرجانیؒ: کتابُ اَسرارِ البَلاغَۃ، حواشی محمود محمد شاکر، دارالمدنی، جدہ، 1991ء، ص303۔

[9] Joseph Roux: *Meditations of a Parish Priest,* translated into English from French by Isabel F. Hapgood, 1886, p.43.; Science is for those who learn; poetry, for those who know.

[10] حکیم نجمی رام پوری: بحر الفصاحت، جلد دوم، مدون کمال احمد صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2006ء، ص1095۔

[11] الطاف حسین حالؔی: مقدمہ شعر وشاعری مع دیوان حالؔی، مطبع انصاری، دہلی، 1893ء، ص159۔

[12] انیس اشفاق: علامت کیا ہے اور کیونکر بنتی ہے، مشمولہ اُردو غزل میں علامت نگاری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1995ء، ص52۔

[13] سید مسعود حسن رضوی ادیب: میر انیسؔ کے کلام میں صنعتوں کا استعمال، مشمولہ انیسیات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، سوئم ایڈیشن، 2010ء، ص125۔
[14] شبلی نعمانی: موازنۂ انیس و دبیر، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2004ء، ص88۔
[15] Herbert Read: *English Prose Style*, Pantheon Books, New York, 1952, p.23; Metaphor is the synthesis of several units of observation into one commanding image; it is the expression of a complex idea, not by analysis, nor by direct statement, but by a sudden perception of an objective relation.
[16] الطاف حسین حالیؔ: مقدمہ شعر و شاعری مع دیوان حالیؔ، مطبع انصاری، دہلی، 1893ء، ص162۔
[17] مولانا محمد صلاح الدین یوسف: تفسیر احسن البیان۔
[18] عبدالرحمٰن کیلانی: مترادفات القرآن مع الفروق اللغویۃ، مکتبہ الاسلام، لاہور، 2009ء، ص178۔
[19] *The Mahabharata*, translated into English from Sanskrit by Pratap Chandra Roy, Vol. 4, p.p.333-334)
[20] محمد حسن عسکری: استعارے کا خوف، مشمولہ مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2008ء، ص196۔
[21] امداد امام اثرؔ: کاشف الحقائق، مرتبہ وہاب اشرفی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، دوم ایڈیشن، 1998ء، ص370۔
[22] معید رشیدی: استعارے کا بھید، مشمولہ ماہنامہ اخبارِ اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، جولائی 2012ء، ص60۔
[23] Leopoldo Lugones: *Selected Writings By Leopoldo Lugones,* translated from the Spanish by Sergio Waisman, edited by Gwen Kirkpatrick, Oxford University Press, New York, 2008, p.70; Furthermore, language is a set of images, consisting, if one looks at it properly, of one metaphor per word; therefore, finding new, beautiful images, and expressing them with clarity and concision, is a way of simultaneously enriching and renovating the language.
[24] T. E. Hulme: *Speculations*, edited by Herbert Read, Second Edition, Kegan Paul, Trench, Trubner & Co., London, 1936, p.152; Every word in the language originates as a live metaphor, but gradually of course all visual meaning goes out of

them and theybecomea kind of counters. Prose is in fact the museum where the dead metaphors of the poets are preserved.

[25] T. E. Hulme: *Further Speculations*, edited by Samuel Hynes, University of Minnesota Press, Minneapolis, 1955, p.p.74-75; Today the expression "the hill was clad with trees" is felt as a factual statement; but the first time it was an image, a comparison with the clothes a human being wears.

[26] Cecil Day Lewis: *The Poetic Image*, A. W. Bain & Co. Ltd., London, 1947, 10th impression 1961, p.18; In its simplest terms, it (image) is a picture made out of words. An epithet, a metaphor, a simile may create an image; or an image may be presented to us in a phrase or passage on the face of it purely descriptive, but conveying to our imagination something more than the accurate reflection of an external reality. Every poetic image, therefore, is to some degree metaphorical.

[27] شمس الرحمٰن فاروقی: ترسیل کی ناکامی کا المیہ، مشمولہ لفظ و معنی، شہرزاد، کراچی، دوم ایڈیشن، 2009ء، ص83۔

[28] ممتاز حسین: رسالہ در معرفتِ استعارہ، مشمولہ نیا دور، پاکستان کلچرل سوسائٹی، کراچی، شمارہ 3-4، 1956ء، ص95۔

[29] ایضاً، ص99۔

[30] *Webster Dictionary*: A dead metaphor is a metaphor that through overuse has no figurative value.

[31] Max Black: *More About Metaphor*, in *Metaphor and Thought* edited by Andrew Ortony, 2nd edition, Cambridge University Press, New York,1993, p.25;A so-called dead metaphor is not a metaphor at all, but merely an expression that no longer has a pregnant metaphorical use.

[32] شمیم حنفی: نئی شعری روایت، دوسرا باب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2005ء، ص181۔

❖

یاسر اقبال

برصغیر میں عوامی موسیقی کا چلن

لوک موسیقی (عوامی موسیقی) کی تخلیق بھی ایک ایسی روایت ہے جو ہمیں ہر ملک وقوم کے ہاں نظر آتی ہے۔ ہماری موسیقی میں بھی اِس روایت کا خوب صورت چلن موجود ہے۔لوک موسیقی کی بیشتر اصناف (لوریاں، بولیاں، گیت، ٹپے، بیت، ہیمڑی، وغیرہ) کے بول کسی فردِ واحد کی تخلیق نہیں ہوتے بلکہ ان کا وجود خودرو پھولوں کی طرح ہوتا ہے۔ یہ اصناف پوری قوم کا قیمتی ثقافتی سرمایہ ہوتی ہیں۔لوک موسیقی کے سُر گھر کے آنگن سے لے کر کھیت کھلیانوں تک بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس موسیقی کا براہ راست تعلق عوام کے جذبات واحساسات سے ہوتا ہے۔لوک گیتوں کا دائرہ بچوں، عورتوں اور دوشیزاؤں تک ہی نہیں بلکہ بوڑھوں اور جوانوں تک پھیلا ہوتا ہے۔ماں کی لوری بچے کی نیند کو پرسکون بناتی ہے تو پنگھٹ پر دوشیزاؤں کی پازیبوں کی چھنکار ان کے خوابیدہ احساسات کو جگاتی ہے،خود بخود ان کے لبوں پر گیتوں کے بول لہرانے لگتے ہیں۔ چرواہوں کی تانیں انھیں فطرت سے ہم آہنگ کر کے تازگی بخشتی ہیں تو ٹپوں کے بولوں کا مخصوص لب ولہجہ بوڑھوں کے فکر وافکار کو تازہ کرتا ہے۔غرض لوک موسیقی میں رقص وآہنگ اور شعریت کی مٹھاس دونوں شامل ہوتے ہیں۔اس میں عوام کے جذبات واحساسات کا اظہار بڑی بے ساختگی سے ملتا ہے۔

لوک موسیقی کی ابتدا کیسے ہوئی یا کس طرح کے گانے کو ہم لوک موسیقی میں شمار کر سکتے ہیں؟ یہ معلوم کرنا اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنا لوک ادب کی ابتدا کے بارے میں جاننا مشکل ہے۔لیکن اہل علم کی متفقہ رائے کے مطابق یہ غیر متمدن آبادیوں کے عوام کے جذبات کا طریقہ ہائے اظہار ہے۔ برصغیر کی موسیقی میں اِسے دیسی یا عوامی موسیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ موسیقی سیدھی سادھی اور مختصر سُروں پر مشتمل ہوتی ہے۔سروں پر بولوں کو مقدم سمجھ کے گایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس موسیقی میں لفظ اور معانی کا رشتہ زیادہ مضبوط اور واضح ہوتا ہے۔

پنڈت ہنگ جنھوں نے برصغیر کی دیسی موسیقی (لوک موسیقی) پر مفصل اظہار خیال کیا ہے ان کے مطابق کوئی نغمہ چار یا چار سے کم سروں سے ترتیب نہیں پا سکتا۔ایسے نغمات جو چار یا چار سے کم سروں سے تالیف ہوتے ہیں، جنگلوں میں رہنے والے قبائل میں مقبول ہیں جیسے ساور، پلندہ، کام بھوج، ونگا، کیرت، اندھیرا وغیرہ۔ ہندوستان میں ایسے سادہ تالیف کیے گئے نغمات جو عورتیں، بچے، گوالے، کسان اور چرواہے اپنے اپنے علاقوں میں گاتے تھے دیسی موسیقی میں شمار کیے جاتے تھے۔ یونسکو کا بین الاقوامی ادارہ انٹرنیشنل فوک میوزک کونسل عوامی یا لوک موسیقی پر ایک عرصے تک کام کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا:

> ''لوک موسیقی وہ موسیقی ہے جس کی ترسیل زبانی ہو۔ یہ ارتقاء کا نتیجہ ہے اور اس کا انحصار تسلسل، تنوع اور انتخاب پر ہے۔'' (کارپلز:٦)

اس تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے رشید ملک کہتے ہیں کہ:

''اس تعریف سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ عوامی موسیقی ایک ایسی روایت ہے جو تحریر میں نہیں آتی۔اس روایت کی تشکیل کرنے والے عناصر میں پہلے نمبر پر تسلسل ہے جو ماضی کو حال سے ملاتا ہے۔دوسرے نمبر پر تنوع ہے جو کسی فرد یا گروہ کی تخلیقی قوت کا مظہر ہے اور تیسرے نمبر پر انتخاب ہے جو کسی عمرانی گروہ کے ذریعے نغمے یا دھن کی اس وضع کی تشکیل کرتا ہے جس میں وہ معاشرے میں زندہ رہتی ہے۔'' (راگ درپن کا تنقیدی جائزہ۔ص:۴۳۲)

عوامی موسیقی کا اطلاق ایسی موسیقی پر بھی کیا جاسکتا ہے جو اپنے ارتقائی عمل میں کلاسیکی موسیقی سے متاثر نہ رہی ہو یا جس کی دھن یا بندش کو کسی فرد نے تو مرتب کیا ہو لیکن آنے والی نسلوں میں اس دھن یا غنائی بندش نے عوامی موسیقی میں جذب ہوگئی ہو۔عوامی موسیقی کے نمایاں امتیازات میں ایک اہم عنصر اس کی تشکیلِ نو ہے یہی وجہ ہے کہ عوامی موسیقی ایک متحرک فن ہے جو نئے نئے اضافوں کے ساتھ نسل در نسل پروان چڑھتا رہتا ہے۔ہمارے ہاں فن موسیقی کو تین بنیادی درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔عوامی موسیقی، کلاسیکل موسیقی اور نیم کلاسیکل موسیقی۔ان میں کلاسیکل موسیقی ایک منضبط فن ہے جسے اس کے متعین کردہ اصول وضوابط کے تحت گیا جاتا ہے۔اس موسیقی میں جذبات واحساسات کے اظہار کا سارا کا سارا انحصار سر پر ہوتا ہے۔الفاظ کو سروں کی نسبت کم اہمیت دی جاتی ہے۔ پر بندھ، دھروپد، خیال، ترانہ وغیرہ اس کی اہم اصنافِ گائکی ہیں۔کلاسیکل موسیقی کا اپنا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔اس میں جو مشہور تالیں رائج ہیں ان میں چند کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے جن میں تین تال سولہ ماترے جس کے بول یہ ہیں:

دھا۔دھن۔دھن۔نا۔،دھا۔دھن۔دھن۔نا۔تا۔تن۔تن۔نا۔دھا۔دھن۔دھن۔نا۔

یہ زیادہ برتا جانے والا تال ہے جس میں تین ضربیں ہیں اور ایک حصہ خالی ہے۔

جھپ تال دس ماترے جس کے بول یہ ہے:

دھن۔نا۔دھن۔دھن۔نا۔تن۔نا۔دھن۔دھن۔نا

اس میں تین ضربیں ہیں اور دو خالی ہیں۔جھومرا ۱۴ ماترے کا تال جس کے بول یہ ہیں:

دھن۔دھاگے۔ترکٹ۔دھن۔دھن۔دھاگے۔ترکٹ۔تن۔تاگے۔ترکٹ۔دھن۔دھن۔دھاگے۔ترکٹ۔

اس میں تین ضربیں ہیں اور ایک خالی ہے۔

اکتالہ ۱۲ ماترے جس کے بول یہ ہیں:

دھن۔ترکٹ۔دھن۔نا۔دھن۔دھن۔نا۔ترکٹ۔تُو۔نا۔کت۔تا

اس میں ۴ ضربیں ہیں اور تین خالی ہیں۔اسی طرح کئی اور تالیں ہیں جو کلاسیکی موسیقی میں مستعمل ہیں۔ ہر تال کا اپنا ایک نام ہے۔ماتروں کی تعداد متعین ہے اور ہر تال اپنے اندر ایک خاص انفرادیت رکھتا ہے۔کلاسیکی موسیقی میں گانے والا تالوں کے

نظام اوران کے وزن وچلن سے خوب آگاہ ہوتا ہے اور یہ آگاہی کلاسیکی موسیقی کی بنیادی شرط ہے جو گائک پر عائد ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر کلاسیکی گائک ایسے گزرے ہیں جو نہ صرف راگ داری کے نظام سے بخوبی واقف تھے بلکہ طبلے کے فن سے بھی آراستہ تھے۔دوسری اہم بات کے اس کے لیے سامع کا تربیت یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔سامع فن موسیقی کی مبادیات سے واقف ہوگا تو اس حظ اٹھا سکے گا۔

نیم کلاسیکل موسیقی کلاسیکل موسیقی کی کوکھ سے نکلنے والا فن ہے۔لیکن یہ عوامی موسیقی کی نسبت زیادہ منضبط فن ہے اس میں لفظ اور معانی کا رشتہ معطل نہیں ہوتا۔ بلکہ الفاظ کو سروں پر مقدم سمجھ کے گایا جاتا ہے۔لفظوں کی ادبی اور شعری حیثیت کا خاص التزام برتا جاتا ہے۔ٹھمری،غزل،قول وغیرہ اس کی معروف اصناف ہیں۔اس فن کو نبھانے کے لیے گانے والے کے اندر اُتنی ہی پختگی درکار ہوتی ہے جتنا کلاسیکل موسیقی میں ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے کلاسیکل گائکوں نے نیم کلاسیکل کو دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر انداز سے گایا ہے۔اس میں جو تالیں مستعمل ہیں ان میں کہروا،۸ ماترے، مغلی،۷ ماترے،دادرا،۶ ماترے، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس موسیقی میں طبلے والے کو اپنا فن دیکھانے کا بھی خوب موقع ملتا ہے وہ ٹھیکے کو طرح طرح کی خوبصورت شکلوں کے ساتھ پھیلا کر بجاتا ہے۔ جہاں تک عوامی موسیقی اور کلاسیکی موسیقی کا تعلق ہے تو کلاسیکی موسیقی اور عوامی موسیقی دو الگ الگ زمروں میں شامل ہیں۔کلاسیکی موسیقی ایک منضبط فن ہے جس میں قوائد وضوابط کی پابندی لازم ہوتی ہے اور اس کی پیش کش میں سر،تال اور راگ کی پوری شکل کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا ہے۔اس موسیقی کی اپنی ایک متعین کردہ ساخت پرداخت ہے جسے اس کے مقررہ کردہ اصول وضوابط کے ساتھ نبھایا جاتا ہے۔اس کے برعکس عوامی موسیقی کا انحصار اس کی سادگی، بولوں کی غنائیت اور عوام کے جذبات کے سچے اظہار پر ہے جس میں عوام کی محبتیں،آرزوئیں،امیدیں اور درد والم کی کیفیات شامل ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں عوامی موسیقی کی روایت کلاسیکل موسیقی کے بالمقابل چلتی رہی ہے۔لیکن ماہرین موسیقی اسے غیر متمدن لوگوں کی موسیقی سمجھ کے نظر انداز کرتے رہے۔ ماضی قریب تک اسے علم موسیقی کی تاریخ میں خارج سمجھا جاتا رہا۔آرٹ موسیقی کی اجارہ داری اور دربار کی سرپرستی کے آگے عوامی موسیقی کو بہت کم اہمیت دی جاتی تھی۔اس کی مثال ایسے ہی تھی جس طرح ابتدا میں زبانِ فارسی کے آگے زبانِ اردو کی اہمیت تھی۔ابتدائی دور میں اردو کو بھی گنوار اور جاہلوں کی زبان سمجھ کر شعراء دہلی نظر انداز کرتے رہے۔مغرب نے بھی ایک عرصے تک عوامی موسیقی کو نظر انداز کیے رکھا تاہم اٹھارویں صدی میں پہلی بار اس کے لیے فوک میوزک اور فوک سانگ جیسی اصطلاحوں کو وضع کیا گیا تاکہ ثقافتی نقطہ نظر سے نام نہاد پس ماندہ عوام کے رسم ورواج اور توہمات کا احاطہ کیا جاسکے۔اٹھارویں صدی میں عوامی موسیقی کو آرٹ موسیقی کے پہلو بہ پہلو احترام کا درجہ اس وقت ملنے لگا جب مغربی دانشوروں نے دیہاتی زندگی کی تعریفیں شروع کیں۔ چونکہ عوامی موسیقی عوام کے مشترکہ تجربات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کسی قبیلے یا قومی گروہ کی نمائندہ موسیقی کہلاتی ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ عوامی موسیقی مقبول موسیقی سے بھی بڑا گہرا تعلق رکھتی ہے لیکن مقبول موسیقی کو ہم عوامی موسیقی

نہیں کہہ سکتے۔مقبول موسیقی سے میری مراد فلمی موسیقی اور تھیٹر کی موسیقی ہے۔جس کی مقبولیت ایک عرصے تک رہتی ہے اور اس کی تخلیق موسیقاروں کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور کاروباری نقطہ نظر سے اس کے بول اور دھنیں ترتیب دی جاتی ہیں اور اس کو مخصوص تناظر میں سنا جا سکتا ہے۔جب کہ لوک موسیقی یا عوامی موسیقی ایک روایت ہے جس میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔جو کسی بھی معاشرے میں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔لوک موسیقی کی کمپوزیشن اور اس کے بولوں کو تصنیف کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا البتہ لوک گیتوں کے الفاظ میں نسل در نسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔عوامی موسیقی کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ گھرانوں کی نمائندہ نہیں ہوتی اس کا تعلق کسی قبیلے یا عوامی گروہ سے ہوتا ہے۔

عوامی موسیقی میں لفظ اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔الفاظ اور معانی کا رشتہ بڑا واضح اور اہم ہوتا ہے کلاسیکی موسیقی میں جذبات کے اظہار کی بنیاد سر اور راگ کے پھیلاؤ پر رکھی جاتی ہے جبکہ عوامی موسیقی لفظ کی ادبی حیثیت کو نظر انداز نہیں کرتی اس کا سارا سفر لفظوں کے سہارے ہی مکمل ہوتا ہے۔یہاں تک کے تال کا انتخاب بھی الفاظ کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔یعنی گائے جانے والے لوک گیتوں میں شعری وزن کی مناسبت سے تال کا انتخاب ہوتا ہے۔عوامی موسیقی کا نغمہ چند سروں پر مرتب ہوتا ہے اور انھیں سروں کے گرد گھوم کر اور بار بار کی تکرار سے اپنا غنائی چکر مکمل کرتا ہے۔سروں اور لفظوں کی تکرار عوامی موسیقی کا خاصہ ہے اگر ایسا نہ ہو تو نغمہ غنائی تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے چاروں صوبوں کی عوامی موسیقی کا اپنا ایک خاص تشخص ہے۔اپنے خاص طرح کے لب و لہجے کے ساتھ رنگ بکھیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ذیل میں عوامی موسیقی کی ان اصناف کا جائزہ لیا جاتا ہے جو پاکستان میں رائج ہیں اور جنھیں عوامی سطح پر مقبولیت حاصل ہے۔

ا۔ٹپہ: ٹپہ ایک پنجابی صنفِ گائکی ہے۔ابتدا میں پنجاب کے ساربان ہیر رانجھا کی منظوم کہانی کو ٹپے کے شکل میں ترتیب دے کر گاتے تھے بعد میں آصف الدولہ کے ایک درباری پنجابی گائک شوری نے اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ٹپے کا اپنا ایک خاص غنائی اسلوب ہوتا ہے۔اس میں چند بولوں کو تکرار کے ساتھ گایا جاتا ہے۔اس میں استہائی انترہ نہیں ہوتا۔بلکہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ہر بند مشتمل ہوتا ہے۔اور ہر بند کا غنائی تسلسل ایک جیسا ہوتا ہے۔عشق و محبت کی جملہ کیفیات کا اس میں اظہار پایا جاتا ہے۔شاعری میں ایک خاص طرح کا مقامی لہجہ موجود ہوتا ہے۔ہر خطے کا ٹپہ اپنی مقامیت کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔دیہی کلچر کے عناصر اس میں زیادہ ہوتے ہیں۔ ٹپے کی صنف پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ٹپہ کی صنف ویسے تو اہل پنجاب کی میراث سمجھی جاتی ہے لیکن پاکستان کے چاروں صوبوں کی عوامی موسیقی میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔صوبہ سرحد کی عوامی موسیقی کا زیادہ حصہ ٹپوں پر مشتمل ہے۔اسی طرح سندھ میں اسے بولیوں کی شکل میں بھی گایا جاتا ہے۔اس طرح دیگر خطوں میں بھی اس کا کسی نہ کسی شکل میں وجود ملتا ہے۔کچھ احباب نے تو اس کے لیے مخصوص نوٹیشنز کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔میرے خیال میں یہ غلط ہے۔کیوں کے عوامی موسیقی ایک متحرک فن ہے اور اس کی جملہ اصناف کے غنائی اسالیب نئے نئے اضافوں کے ساتھ نئی نسل کو منتقل ہوتے رہے ہیں۔

مثال کے طور پر اہل پنجاب میں ٹپوں کی دھنیں کئی راگوں میں نظر آتی ہے۔ بھیرویوں، پہاڑی، جوگ، بھیم پلاسی میں بھی مقبول دھنیں کئی عرصے سے رائج ہیں۔ اسی طرح سرحد میں بھی ٹپے کئی انداز سے گائے جارہے ہیں۔ لہذا کسی مخصوص سروں میں اس کی دھن کو پابند کرنا درست نہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ دھنیں وقتی طور پر مقبول تو ہوجاتی ہیں لیکن کچھ عرصہ زندہ رہنے کے بعد ان کا وجود ختم ہوجاتا ہے وہ عوامی موسیقی کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ اس کی بنیادی وجہ ایک یہ بھی ہوتی ہے کہ وہاں عوامی موسیقی کی روایت بہت کمزور ہوتی ہے اور کسی بھی نئی مقبول دھن کو عوامی موسیقی میں جذب ہونے میں عرصہ لگ جاتا ہے۔ جن معاشروں میں عوامی موسیقی کی روایت مضبوط ہوتی ہے وہاں کی نئی مقبول دھنیں جلدی عوامی موسیقی کی روایت میں جذب ہوجاتی ہیں۔ لہذا ٹپے کے حوالے سے اس کی کوئی ایک مخصوص دھن مقرر کرلینا کہ بس اسی دھن میں ہی ٹپہ گایا جاسکتا ہے میرے نقطہ نظر سے درست نہیں۔ دھن میں اضافوں کی پوری گنجائش نہ صرف موجود ہے بلکہ ٹپے کے لیے کئی اور نئی دھنیں بھی تخلیق کی جاسکتی ہیں۔ ہاں البتہ ٹپے کی گائیکی کا جو خاص امتیازی رنگ ہے وہ اس کا غنائی لب ولہجہ ہے۔ جو کسی بھی دھن سے ہم آہنگ کرکے گایا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ ٹپہ عوامی موسیقی کی وہ صنف ہے جس کی گائکی کے دو رنگ ہیں ایک کلاسیکی موسیقی کا رنگ اور دوسرا عوامی رنگ۔ کلاسیکی رنگ کے ٹپے میں لفظوں کی تکرار کو ایک خاص غنائی چکر میں ادا کیا جاتا ہے۔ بہلاوے اور مرکیوں کے ساتھ اس کے بولوں کو مزین کرکے گایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ابھی بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسی انگ میں ٹپے کی گائکی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اساتذہ نے بھی ٹپے کے کلاسیکی رنگ کو اپنایا ہے۔ اس کی ایک مثال ہمیں اردو میں ''باغوں میں پڑے جھولے'' راگ پہاڑی میں گائی گئی بولیوں میں بھی نظر آتی ہے۔

۲۔ لوک گیت: لوک گیت ہمارے مقامی کلچر کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس میں مقامی سطح پر جذبات واحساسات کا بے ساختگی سے اظہار ہوتا ہے۔ پاکستان میں لوک گیتوں کی گائکی کافی مقبول گائیکی سمجھی اور جانی جاتی ہے۔ اس کی شعری ہیت میں مطلع اور مقطع کی پوری گنجائش موجود ہوتی ہے۔ لوک گیت میں مطلع کو مکھڑا کہتے ہیں۔ پاکستان کے سرائیکی علاقوں میں لوک سرائیکی گیتوں کا ایک خاص چلن موجود ہے۔ ان گیتوں میں عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ صوفیانہ مزاج بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ گیت ایسے ہیں جو بولیاں نما ہیں جن میں

ساوی مورا کین تے بوٹا کڈھ ڈے چولے تے
رکھی نہ منیساں بہوں ناراض ہاں ڈھولے تے
اج ٹک پو سویلے لگا ونج جانی
ڈینہہ تپاای ڈوپاراں بھن جانی
بے درد ڈھولا انج نیں کریندا
ڈکھیاں کو ں پُنلا گل چا لویندا
خان گھڑا دے بند وے خاناں

میں ڈھولے دی منگ وے خاناں

ان گیتوں میں جذبات کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔اور ایک خاص طرح کا کرب، کسک اور سوز و گداز ان گیتوں کا شعری تلازمہ ہے۔اسی طرح پوٹھوہار میں بھی اس طرح کے بولیاں نما گیت ملتے ہیں۔ پوٹھوہار میں بیت کی گائکی کا بھی ایک خاص رنگ ہے جو گھڑے کے مخصوص گت میں پڑھے جاتے ہیں۔بیتوں کو ایک خاص انداز میں گایا جاتا ہے اور ایک بیت سے دوسرے بیت کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے اسے ٹانٹے ہارمونیم ، گھڑے اور چھوٹے ردھم (خنجری) کی سنگت سے بھرا جاتا ہے۔اس کے بعد جب بیت گانا ہوتا ہے تو ہارمونیم کے علاوہ باقی ساز خاموش رہتے ہیں۔

۳۔دوہڑے ماہیے: دوہڑے ماہیوں کی گائکی بھی پنجاب کی عوامی گائکی میں شامل ہے۔اس گائکی کا امتیازی رنگ یہ ہے کہ جو موضوعاتی تخیل دوہڑے میں ہوتا ہے گانے والا دوہڑے کے بعد ماہیے میں بھی اُس کا پورا التزام رکھتا ہے۔سرائکی علاقوں میں جو لوک گیت گائے جاتے ہیں ان کی ابتدا دوہڑے ماہیوں سے کی جاتی ہے اور گانے والے کی شعوری کاوش یہ ہوتی ہے کہ لوک گیت میں جو تخیل ہے وہی تخیل دوہڑوں ماہیوں میں بھی قائم رہے تا کہ سامع پر موضوعاتی تسلسل برقرار رہے۔تا کہ آغاز سے آخر تک ایک خاص طرح کی فضا میں رہ کر سماعت کر سکے۔اسی طرح کچھ گیت ایسے بھی ہیں جو شادی بیاہ پر عورتیں گاتی ہیں ان گیتوں میں عموماً دولہا اور دلہن کی مدحت سرائی کی جاتی ہے۔سرائکی خطے کے مضافات میں اب بھی یہ روایت پوری طرح قائم ہے شادی سے چند دن پہلے شادی والے گھر اڑوس پڑوس کی عورتیں شام کے بعد جمع ہو جاتی ہیں اور پرات (تھالی) پر ہیمڑی (عورتوں کا گانا) اور بولیاں گاتی ہیں۔

۴۔سار بانوں اور چرواہوں کے گانے: سار بانوں اور چرواہوں کے گانے بھی عوامی موسیقی میں شامل ہیں۔ جو فطرت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ان گانوں کو بلند آواز میں اوپر والی سروں میں آلاپا جاتا ہے۔سار بان یا چرواہے جب اپنے مال مویشی لے کے آبادیوں سے دور کھلے میدانوں اور کھیتوں کا رخ کرتے ہیں تو خود کو فطرت سے ہم کنار کرنے کے لیے اور اپنے جذبات کا اظہار ایک خاص طرح کی تانوں کو آلاپ کر کرتے ہیں۔

ہماری موسیقی (برصغیر کی موسیقی) اپنے اندر ایسی جاذبیت رکھتی ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں میں چاہے وہ کلاسیکی پہلو ہے، نیم کلاسیکی یا عوامی، ایک خاص طرح کا تاثر پایا جاتا ہے اور علم موسیقی کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ہم کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔یہ فن اپنے اندر بہت سی جہتوں کو سموئے ہوئے مستقبل کی طرف رواں دواں ہے۔ موجودہ دور میں ثقافتی کلچر کی یلغار کے آگے عوامی موسیقی بھی اپنے رنگ بدل رہی ہے۔نئے نئے سازوں کی آمیزش سے نئے نئے غنائی اسالیب برتے جا رہے ہیں اور عوامی موسیقی جس کی ساخت پرداخت اپنے مقامی رنگ سے وابستہ ہوتی تھی اب اُس مقامیت سے اس کا دامن چھوٹتا ہوا نظر آ رہا ہے۔پاپ میوزک کے آہنگ سے عوامی موسیقی کی بہت سی اصناف متاثر ہو رہی ہیں۔جس سے عوامی موسیقی کا ایک نیا رنگ روپ سامنے آ رہا ہے۔

☆

امین راحت چغتائی

روایات

سرِ شام پھر باغ میں آ گیا ہوں
اُسی مخزنِ رنگ و بو کی لگن میں
کہ جس نے کبھی روح کو تازگی، کیف و مستی کی دولت عطا کی،
فضا کو دلآویزیِ جاوداں دی،
نگاہوں کو نئے زاویے، دل کو تہذیبِ جذبات دے کر
روایات سے پیار کرنا سکھایا،

یہاں کاسنی، اودے اودے، گلابی، شہابی سبھی پھول ہیں،
سبزہ زاروں میں جائیں تو بیلے کی خوشبو
فراواں، فراواں،
کہیں موگرے اور چنبیلی کی مہکار راحت بہ داماں
گلابوں کے تختوں میں ہر دیدہ و دل کی تسکیں کا ساماں،
یہاں ڈھاک[1] ہے
جس کے پھولوں سے مغلوں نے اپنی تصاویر کے رنگ اُبھارے،
اِسی ڈھاک کے رنگ کی دل کشی سے
بساون[2] نے، دسونت[3] نے مغلِ اعظم کے دربار میں داد پائی،
یہاں ایک بوڑھا شجر بھی ہے
جو زیست کے خارزاروں سے تنگ آ کے گوتم بنا،
گیان میں محو ہے،
اور یہ سب روایاتِ ماضی ہیں
اِن کا بھلا عہدِ حاضر سے رشتہ ہی کیسا!

یہاں تو ہری گھاس پر ٹکڑیوں میں بٹے لوگ بیٹھے
سُبک گام بادِ معطر سے فرحاں و شاداں
ہجومِ گل و رنگ پر تبصرے کر رہے ہیں

میں کب سے کھڑا ہوں،
سماعت کی اِس تشنگی کو بجھاؤں تو کیسے!
میں وہ قہقہے ڈھونڈتا ہوں
جو گونجیں تو ایسا گماں ہو
کہ جیسے سرِ شام دلّی کے باغوں میں بجتے کٹورے[۴]

۱۔ڈھاک سے شوخ زرد رنگ حاصل کر کے شاہی تصویر خانے کی تصویروں میں رنگ بھرا جاتا تھا۔
۲،۳۔شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے تصویر خانے کے دو ممتاز ہندو مصور۔
۴۔رواج تھا کہ شام کے وقت دِلّی کے باغوں میں لوگ سیر کو جاتے تھے تو سقّے اپنی مشکوں میں ٹھنڈا پانی بھر کے کانسی کے دو دو کٹورے ہاتھ میں لیے خاص آہنگ میں بجاتے، روشوں میں پھرتے رہتے تھے۔بچوں اور خواتین کو بالخصوص پیاس لگتی تھی تو سقّے ان کٹوروں میں بھر بھر پانی پلاتے تھے اور عوضانے کے طور پر ایک پیسہ پاتے تھے۔

معین نظامی

دھند میں

بہت جی میں آنے لگا ہے
کہ اس دھند میں راستہ بھول جاؤں
اور اُس موڑ سے پہلے واپس نہ آؤں
جو اس راستے کی نہایت میں ہے
اور پلٹنے بھی دیتا نہیں ہے
سُلگتے ہوئے چشم و لب
اور جھلستے ہوئے اپنے تلوے لیے
جن میں کانٹے چُبھے ہیں
جو نوکیلی پلکوں کی ناکام کاوش پہ خندہ زناں ہیں
نکلتے نہیں، پیٹ میں پرورش پاتے
ان آتشیں اژدہاؤں کی بَل کھاتی رسی گھسیٹے
چٹختی ہوئی ناف کے کنڈلوں میں پھنسے
منجمد، مضطرب، درد سے گپ لگاتا ہوا
جس کا امراضِ خفیہ سے کوئی تعلق نہیں
دھند میں راستہ بھول جاؤں

☆

یٰسین آفاقی

(۱)

رنگوں بھری ہوا

تم روز گھر میں آتی ہو
میں تمھیں دیکھنے کے لیے آنکھیں رکھ دیتا ہوں
لیکن تمھارا کوئی نشان نہیں
جب تم آتی ہو
میں رات کے خلاف لڑتا ہوں
رات بھاگ جاتی ہے
ایک اجنبی شبیہ آنکھوں میں ابھرتی ہے
اور بدن کی رسی کے بَل کھلتے ہیں
تم نے پانی کی لہر کو اوپر اُٹھایا تھا
ہوا گیلی ہوگئی تھی
میں نے رنگوں بھری ہوا آنکھ میں رکھ لی
جو میری دیوانگی سے قوسِ قزح کی طرح پھیلتی ہے

(۲)

میں خزانے لٹادوں گا

میں نے آسمان کا پانی پیا
روشنی کو آنکھ میں قید کرلیا
اور تمھارے اندر آنکھ کھولی
تم نامعلوم کی زبان میں بولتی ہو

میں تمھیں سُنتا ہوں جب تم میرے وجود سے گزرتی ہو!
تم کس کیفیت میں شفا دینے آؤ گی
کیا میں آخری حد تک تم میں سما جاؤں گا؟
میں اپنے آپ کو پیاس سے پیوست کروں گا
سفید سینے پر روح کا رقص رقم کروں گا
اور اپنے سارے خزانے لُٹا دوں گا!

(۳)

میں شعلہ بن کر زندہ رہوں گا!

میں موت سے زندگی پاتا ہوں
اپنے لوگوں کے بارے خبریں سُنتے ہوئے
طوفان کی طرف پیش قدمی کرتا ہوں
اور جنگ جیتنے کا کھیل شروع کر دیتا ہوں
میں تمھیں دُور دیکھنے والی نگاہ دوں گا
تم تھکی ہوئی زندگی کو اُکھاڑ پھینکو گے!
میں ایک خواب سے دوسرے خواب میں نقلِ مکانی کر رہا ہوں
ذہن کے دَروں پر کتاب جنم لے رہی ہے
میں ایک اور نظم میں لوٹ آؤں گا
اور تمھارے دلوں میں شعلہ بن کر زندہ رہوں گا!

(۴)

میں نظم بننا چاہتا ہوں

میں لفظ ہوں
نظم بننا چاہتا ہوں

راستے میں نیند کا پاؤں پڑا ہے
میں آسمان سے لٹکی ہوئی رسی نہیں بن سکتا
میں آسمان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گلی میں گر جاتا ہوں
شہروں میں خواب کی طرح رہتا ہوں
بدن کی مٹی میں بہتے ہوئے ہوا میں اُڑتا ہوں
آنکھیں ستارے بن کر راستوں میں پھیل جاتی ہیں
مجھے نظم بننے کی مہلت نہیں ملتی جو چلتی رہتی ہے
جب آدمی تھک جاتا ہے!

(۵)

کُشادگی کا خواب

دل کا پھیلاؤ، جس نے تھکن کو میری جان سے جُدا کر دیا ہے
کشادگی کا خواب دیکھتا ہے،
تم کشادگی کو جان لو گے: جب تمھارے لفظ کرب سے بھیگ جائیں گے
ایک عجیب کیف کا در کھل جائے گا
اور تم زمین کی طرف گر پڑو گے
تمھارا باطن سرسراہٹ سے سہم جائے گا
زمین کی صدا وجود کو ہلا کر رکھ دی گی
صدا کا جادو، الفاظ کی تہوں سے پھوٹے گا
جن میں آسمان اپنا پُرانا لباس بدل لے گا
اور تمھاری آنکھ کے کنارے کائنات برہنہ ہو گی!

☆

ارشد معراج

کیا مجھے زندگی سے محبت نہیں ہے؟

(داؤد رضوان کے لیے)

یہ داؤد ہے
ہاں بتایا تو تھا
وہی جو کہیں سرخ اور سبز کے درمیان رک گیا تھا
اسے سبز کی چاٹ اب لگ گئی ہے
میں اکثر یہ داؤد سے پوچھتا ہوں
بڑھاپا، مرض، لذت کام کے ختم ہوتے ہی
کیسے زوالوں کی سوچوں کی پھنیر ستاتے ہیں
رستوں میں آ کر ڈراتے ہیں
راہی کو سنسان قبروں کے کتبے دکھاتے ہیں
اور عمر کی ریزگاری کو کھوٹا بتاتے ہیں
کیوں ہے۔۔۔؟
ایک عرصہ لگا تب کھلا ہے
ستاروں پہ پاؤں دھرے
سیرِ افلاک کو شام سے ہیں نکلتے
مگر صبح دم جا کے سجدوں میں گر کر
شب رفتہ کے داغ دھوتے ہیں
افسوس کرتے ہیں
مگر میں محبت کا داعی
پیادہ
سفر در سفر
ریگ زاروں کی جھلسی ہوئی ساعتوں میں چلا جا رہا ہوں
مجھے تو کہیں سبز ٹکڑا دکھائی دیا ہی نہیں ہے

☆

شہزاد نیّر

گردش کی اسیری

اے کوکبِ رخشندہ!
کس اوٹ چھپا ہے تُو
کس ابر سے اُبھرے گا، کس بام پہ اُترے گا
کس رُخ کو ضیا دے گا، کس آنکھ میں چمکے گا
کس سمت گیا ہے تُو
اے کوکبِ تابندہ!
کس چاپ پہ دیکھیں گے دو نین ستارے سے
کس بخت کو لکھیں گے پلکوں کے اشارے سے
کس بھیس ملا تھا وہ کس دیس کا باشندہ
وہ کوکبِ رخشندہ
اُس نام نے لَو بخشی گردش کے اسیروں کو
اُس ہاتھ نے ضَو بخشی ہاتھوں کی لکیروں کو
اُس چشم سے آتا تھا ایمان اُمیدوں پر
اُس حسن سے ہوتا تھا اِک مان نصیبوں پر
جب دُور چمکتا تھا
ہم تیرہ نصیبوں کی نظروں سے پھسلتا تھا
چھونے کی تمنّا کے امکان سے چھپتا تھا
کیوں جسم ہوا پھر تُو
اے کوکبِ رخشندہ!

☆

کاشف نعمانی

زمیں کو از سرِ نو خَلق کرنے کی ضرورت ہے

(۱)

(یہ دُنیا خدا کی شاعری ہے)

یہ دُنیا
خدا کی شاعری ہے
سمندر، لہلہاتے کھیت، ہنستی کِھلکھلاتی آبشاریں
پرندے، پھول، بچے، تتلیاں اور چاند تارے
سب اُس کی آیتیں ہیں
سو، ہم کون ہوتے ہیں
کہ جو ان میں تصرف کر سکیں
مگر، سچ پوچھیے تو
کون سی شے ہے
جو اپنی اصل پر قائم ہے!
سکون و حرکتِ اجسام
نور اور آواز کے بارے میں
____ آپ اپنی نفی کرتے _____
آئے دن کے اکتشافات اور دعاوی کے نتیجے میں
گماں تو خیر پہلے ہی گماں تھا
مگر اب تو ''یقیں'' بھی
اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے قاصر ہے
ہم نے شوقِ خودنمائی
اور زعمِ قوتِ ایجاد میں
ہر اِک شے کی فطری نہج کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے
سبزیوں، پھولوں، پھلوں اور مختلف اجناس سے لے کر
حضرتِ انسان تک
ہر کسی کی ہائی برڈ* نسلیں بنائی جا رہی ہیں

ہر اِک شے کی کلوننگ ** ہو رہی ہے
جیسے کسی بچے کے ہاتھوں میں
مُو قلم اور رنگ آ جائے تو وہ
گھر کی اُجلی چادروں پر
صاف اور بے داغ دیواروں میں اور کاغذ میں
کسی تفریق کا قائل نہیں رہتا
ہم نے بھی اُس شوخ بچے کی طرح
بلا تفریق فطرت کے توازن *** کا
اس کے فطری حسن اور اس کے تناسب کا
خوب اچھی طرح ستیاناس کر ڈالا ہے
وقت سے پہلے ہی
اُس کے آب و رنگ کو برباد کر ڈالا ہے
اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا
کہ اس دُنیا کی ہیئت میں تصرف کر کے ہم
قیامت جتنی
____ بل کہ اس سے بھی بڑی ____
حماقت کر رہے ہیں؛
اِس کے خالق کی اِہانت کر رہے ہیں؛
یہ دُنیا جو خدا کی شاعری ہے
ہم اس کے نظم کو بے نظم کرنے کی
جسارت کر رہے ہیں

[* Hybrid ** Cloning *** Ecology]

(۲)

(دھیان کے برگد تلے اُگنے والی سوچ)

ہمارے روبرو،
اور کوئی بھی نہیں،
ہم آپ ہی ہیں،
ہم اپنے آپ ہی سے پنجہ کش ہیں،

اوراپنے آپ سے زور آزما ہیں
ہماری ساری جدوجہد
اپنے آپ ہی کو زیر کرنے کے لیے ہے
کسی سے کیا!
ہم اپنے آپ سے آگے نکلنے میں لگے ہیں
اور اِک آواز کیا!
رفتار کی ساری حدوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں
بلکہ یوں کہیے!
کہ اپنے سارے کاموں کو
رئیل ٹائم* میں کرنے کے لیے بے چین ہیں
اور چاہتے ہیں:
کہ ہر مشکل سے مشکل کام
ایک ٹچ** یا ایک ہلکی سی کلِک ***
___یا فقط اِک حرفِ ''کُن''___ کے ساتھ ہی
انجام پا جائے
اوراب تو بات اتنی دُور جا پہنچی ہے
کہ شاید کل کلاں کو
وقت کے اس بیریئر**** کو توڑ کر
یہ مشتِ خاک، اِک ایسے زمانے میں پہنچ جائے
جہاں ہر چیز حرکت میں ہو لیکن وقت ساکن ہو
یہ بات ایسی بھی اَن ہونی نہیں ہے
کہ سُن کر ہی کسی کی سانس رُک جائے
چاند پر تو آنا جانا لگ چُکا ہے
روشنی کا ہم سفر ہونا بھی
بس اب کو یہ دن کی بات ہے
پھر وقت کی باگیں ہمارے ہاتھ میں ہوں گی
ہماری، اپنے ماضی اور مستقبل پہ، یکساں
دست رس ہو گی

سو، جب چاہیں گے
اپنے ماضی کو اُٹھا کر حال میں لے آئیں گے
یا کبھی ماضی کے ماضی اور مستقبل کے مستقبل میں
جانے کو، جو دل چاہا
تو شاید اپنی پیدائش ہمیں
آنے والے 'کل' کا کوئی واقعہ معلوم ہو!
اور اپنی موت، شاید، قصۂ ماضی لگے!!!
مگر کیا؟ روح کا یہ نرم رو آہنگ
جسم کی اس برق رفتاری میں
_____ اس کا ساتھ دے پائے گا؟
اور کیا؟ روح کا یہ جذب و استغراق
جسم کے شور و شغب میں کھو نہ جائے گا؟
ہزاروں سال پر پھیلا ہوا یہ دھیان کا برگد
اپنی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں سے
پہلے کی طرح اب بھی
کیا ہماری آتما کو شانتی دے گا؟
ہمیں نروان حاصل ہو سکے گا؟
اگر ایسا نہ ہو!
اور یہ ہو بھی سکتا ہے
تو پھر اس جسم کی آسودگی کا کیا کریں گے!!
جو، سوچوں میں اندھیرا
اور دلوں میں واہمے بھر دے
ہم ایسی تیرہ باطن روشنی کا کیا کریں گے!!

* Real Time ** Touch *** Click **** Barrier

(۳)

(ایک شاعرانہ خوش خیالی)

ابھی کل تک!
زمیں کے ناک نقشے

___ اس کے ہر پست و بلند اور خشک و تر ___ کو
زمیں سے دُور ہٹ کر دیکھنا
اِک ایسی شاعرانہ خوش خیالی تھی
کہ جیسے آئنے سے عکس
اور اپنے آپ سے خود کو جُدا کرنا
اور اب دشتِ خلا سے
زمیں کو سخت گستاخانہ اور بے باک نظروں سے
ٹٹولا اور کھنگالا جا رہا ہے
یار لوگوں نے تو سب تہذیبی قدریں
اُٹھا کر طاق پر رکھ دی ہیں
'پڑوسی چاند' کی چھت پر کھڑے ہو کر
زمیں کو تاڑنا، اب اُن کا روز کا معمول بنتا جا رہا ہے
اس کی ہر کروٹ کی، ہر پہلو سے،
ہر اِک زاویے سے ننگی تصویریں بنائی جا رہی ہیں
زمیں کی عفت و دوشیزگی کا تلف ہو جانا
بہ جائے خود اِک ایسا سانحہ ہے
کہ ہم اہلِ زمیں کو
ابھی اس کی اَلم ناکی کا اندازہ نہیں ہے
اور پھر آئے دن!
سِتاروں اور سیّاروں
___ کائناتی نغمگی اور روشنی کے ان سفیروں ___ کی
کھلی بے حرمتی کے روز افزوں واقعات؛ اور
سُرخ سیّارے کی پامالی
چاند کے تاریک غاروں ___ اور اس کے
'رخِ زیبا' کی ساری 'خوش نمائی' کی حقیقت
سامنے آنے کے بعد،
ذرا تم ہی بتاؤ!
کہ وہ 'تاروں بھری راتوں' میں پریوں کی

غنائی داستانیں؛
'کہکشاں پر آبلہ پائی'* کی باتیں؛
'چاند کے افسوں' کے قصّے؛
'چاندنی کی سحر کاری' کے فسانے
کون مانے گا؟
ہم اِک 'ریموٹ کلچر'** کے نشانے پر ہیں
جہاں سب کام گھر بیٹھے ہی
____یہاں تک کہ محبت کے مراحل بھی____
لیپ ٹاپ*** اور صرف اِک چھوٹے سے موبائل**** پہ
طے پانے لگے ہیں
لہٰذا اب ہمیں 'صحرا نوردی'،
اور 'جوئے شیر' لانے کا، نیا مفہوم طے کرنا پڑے گا
مگر صرف اس سے کیا ہوگا
محبت: اِک اضافی قدر***** سے تعبیر کی جانے لگی
خلوص: اِک ایسا سکہ ہے
کہ جو افراطِ زر کے دور میں
اپنی حقیقی قدر کھو بیٹھا ہے
رفاقت: ایک سمجھوتا ہے
جو ضرورت اور مجبوری پہ مبنی ہے
وفا: 'دستِ تہِ سنگ آمدہ' کے نام سے پہچانی جاتی ہے
مری دانست میں: یہ دُنیا، شاید، اپنی عمر پوری کر چُکی ہے؛
اور اب برباد کر دینے کے قابل ہوگئی ہے
اسے یکسر تلف کر کے
از سرِ نو خلق کرنے کی ضرورت ہے

*''اس کہکشاں پہ آبلہ پا ہم ہوئے کہ تُم'' (مصطفیٰ زیدی)

** Remote Culture *** Lap Top **** Mobile Phone***** Relative Term

☆

عارف نوشاہی

افسانوی باغوں سے ربودہ خوشبو والا درۂ یوش

(ایرانی شاعر نیما یوشیج کے دیار میں ایک دن)

هوای درّۂ یوش است ،این که می آید

ربوده عطر گل از باغ های افسانه

(حسین منزوی)

مئی ۲۰۰۷ء میں ترکی میں مولانا رومی بین الاقوامی سمپوزیم میں شرکت کرنے کے بعد میں نے اسلام آباد واپسی کے لیے، تہران کا راستہ انتخاب کیا۔ استنبول سے چلتے وقت ڈاکٹر تحسین فراقی کو فون کر کے بتادیا کہ میں تہران پہنچ رہا ہوں۔ وہ ان دنوں تہران یونی ورسٹی میں اُردو پڑھاتے تھے۔ مجھے یہ خوش گمانی کہ ہمارے یہ بابصیرت بصیر پوری دوست، جو خود کو یکے از عشّاق مولانا بتاتے ہیں، مجھے لینے کے لیے بنفس نفیس تہران کے مہر آباد ہوائی اڈے آئیں گے اور بصد شوق اس گردِ سفر کو اپنا سرمۂ بصارت بنالیں گے جو میں مولانا کے شہر قونیہ شریف کے گلی کوچوں اور راستوں سے اپنے دامن پر لپٹا کر لا رہا ہوں۔ مگر میں انھیں ہوائی اڈے پر دیکھتا ہی رہ گیا اور آخر اپنا دامن جھاڑ کر مہر آباد سے امیر آباد شمالی کے کوچۂ شہید دوانگہ میں فراقی صاحب کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ گھنٹی بجائی، ایک بار، دو بار، لیکن اندر سے صدائے برنخاست۔ ''اگر در خانہ کس است یک حرف بس است'' کا سبق یاد تو تھا لیکن واپس جاتا تو کہاں؟ کوئی آدھا گھنٹہ دروازے پر انتظار کروانے کے بعد جب حضرت فراقی آنکھیں ملتے، چہرے پر معصوم مسکراہٹ سجائے، دروازہ کھول کر مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے آگے بڑھے تو تجاہل عارفانہ سے فرمایا: ''یار تم نے تو کل نہیں آنا تھا؟'' اب معلوم نہیں وہ گذرے ہوئے کل کی بات کر رہے تھے یا آنے والے کل کی؟ دونوں صورتوں میں گویا قصوروار میں ہی تھا۔ ایک دن پہلے آ گیا ہوں یا ایک دن تاخیر سے! اور وہ گویا تاریخ کے اسی الٹ پھیر کی وجہ سے مجھے ہوائی اڈے پر لینے نہیں آئے اور بے خبر سوتے رہے!

مجھے ابھی تہران میں مزید تین ماہ کے لیے رُکنا تھا اور اپنی کچھ زیرِ طبع کتابوں کے پروف دیکھنے تھے۔ میں نے طے کیا کہ پہلے ایک دو روز پرانے ایرانی دوستوں سے مل کر تجدید ملاقات کرتا ہوں، اس کے بعد اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔ اگلے ہی روز میں اپنے ایک پرانے دفتر چلا گیا جہاں ۱۹۸۹ تا ۱۹۹۳ء جز وقتی کام کیا کرتا تھا۔ خانم یگانہ سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کل ہی دفتر کی طرف سے ایک روزہ تفریحی سفر، یوش جا رہا ہے۔ ادارے کے ہر فرد کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک مہمان کو بھی ساتھ لے جا سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ''اگر تم بھی ساتھ چلو تو کوئی مضائقہ نہیں! ہر کوئی اپنا کھانا خود ساتھ لے کر جائے گا، لیکن تم اس کی فکر نہ کرو، میں تمہارا کھانا لیتی آؤں گی، کل صبح ساڑھے چھ بجے اسی دفتر کے

سامنے پہنچ جانا، بس یہیں کھڑی ہوگی، میں بھی پہنچ جاؤں گی۔'' سب کچھ یگانہ نے ایک ہی سانس میں خود ہی سُجھا دیا تھا ،اب میرے لیے چون وچرا کی کیا گنجایش تھی؟

اگلے روز صبح تڑکے میں فراقی صاحب کو خوابِ غفلت میں چھوڑ کر گھر سے نکلا اور اس دفتر کے سامنے جا پہنچا جو یگانہ نے بتایا تھا۔ بس آ چکی تھی لیکن ابھی دوسرے مسافر نہیں پہنچے تھے۔ میں سب سے پہلے پہنچنے والوں میں سے تھا۔ پاس ہی ایک نانبائی کے تنور سے آگ پر پھیلے کنکروں پر پکائے جانے والے ایرانی روٹی ''سنگک'' کی مہک مشام جان میں پہنچ کر یاد دلا رہی تھی کہ میں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا ہے۔ میں نے آدھی روٹی خریدی اور ساتھ کی گلی میں اسی طرح راہ چلتے چلتے توڑ کر کھانے لگا جیسے ایرانیوں کی عادت ہے۔ گرم گرم سنگک روٹی اتنی خوش ذائقہ تھی کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے لوازمے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ دوبارہ بس کے پاس پہنچا تو لوگ آ چکے تھے، میں بھی سوار ہو گیا۔ مسافروں نے ایک صلوات ''**اللّٰھم صل علیٰ محمد و علیٰ آلِ محمد**'' بلند کی اور بس چل پڑی۔ تہران کی سڑکوں پر ابھی گاڑیوں کی وہ بھیڑ نہیں تھی جس کے لیے یہ شہر مشہور ہے۔ ابھی شہر آنکھ کھول رہا تھا اور انگڑائی لے رہا تھا، ویسے بھی آج جمعرات کا دن تھا، بیشتر دفاتر بند تھے اور لوگ باگ گھروں میں پڑے سو رہے تھے۔ بس شہر سے نکل کر جادۂ چالوس پر آ گئی۔ جادۂ چالوس، تہران کو ایران کے شمالی صوبہ مازندران سے ملاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صوبہ گیلان ہے۔ یہ دونوں صوبے اپنے قدرتی مناظر، سرسبز و شاداب جنگلوں اور خنک موسم کی وجہ سے خاص طور پر گرمیوں میں سیّاحوں کی جنت ہیں۔ بحیرہ خزر [کیسپین] کا طویل ساحل ان دونوں صوبوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنے والے سیاحوں کو ایک طرف تا حدّ نگاہ بحیرہ خزر کا نیلگوں پانی، اور دوسری طرف سر بفلک سرسبز پہاڑوں کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جادۂ چالوس ایران کے خطرناک ترین راستوں میں شمار ہوتا ہے۔ پہاڑوں کے ایک طویل سلسلے سے بس گذرتی ہے، جس کے ایک طرف دیوقامت پہاڑ کھڑے ہیں اور دوسری طرف نیچے دریا بہتا ہے۔ کبھی یہ دریا دور ہٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی پہاڑ لے لیتا ہے۔

میں صبح تڑکے سے جاگا ہوا تھا، بس کے ہلکوروں سے ایک غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ آنکھیں خود بخود ہی بند ہو گئیں۔ لیکن ذہن جاگ رہا تھا۔ میں اپنی اَن دیکھی منزلِ مقصود کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں مکان کو نہیں، مکین کو جانتا تھا۔ ہماری منزل ''یوش'' تھی۔ 'علی اسفندیاری کا گاؤں جو ادب میں نیما یوشیج (۱۲ نومبر ۱۸۹۶-۶ جنوری ۱۹۶۰ء) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس نے ایران میں جدید فارسی شاعری کی بنیاد رکھی اور اس کو ایسی نہج دی کہ فارسی ادب میں اس طرز کی شاعری اسی سے منسوب ہو کر ''شعر نیمائی'' کہلانے لگی۔ میری ہر سال نیما سے ایک بار جبری غائبانہ ملاقات یوں ہو جاتی کہ گورڈن کالج راول پنڈی میں اپنے طلبہ کو اس کی مختصر نظم ''آمد بہاراں'' پڑھانا پڑتی ہے جس میں ایک ایسے مقام کے مناظر بیان کیے گئے ہیں جو فطرت کے بہت قریب ہے اور یہ اس کا اپنا گاؤں ہی ہو سکتا ہے۔

''برف کے تودے ٹوٹنے لگے
پہاڑ کی چوٹی ابلق ہوگئی
چرواہا اپنی جھونپڑی سے نکلا
خوشی اور کامیابی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا
کہ اب بھیڑوں کو سبزہ چرانے کا موسم آ پہنچا ہے
اے عاشق تم بھی اٹھو کہ بہار آ گئی ہے
ایک چھوٹا سا چشمہ پہاڑ سے پھوٹا ہے
صحرا میں پھول آگ کی طرح پھیل گئے ہیں
اور دشت پھولوں سے ست رنگیا ہو گیا ہے
صبحگاہی شبنم کے سر پر
طلائی دھوپ الماس کی طرح چمکی
اور پانی میں مچھلی نے
موجوں پر قلابازی لگائی...''

✦✦✦

''وہ شقایق دیکھ رہے ہو؟'' ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میری آنکھ کھل گئی۔ دوسری طرف کھڑکی کے پاس بیٹھی یگانہ نے آنکھوں ہی آنکھوں سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ کوہسار کے دامن میں جنگلی لالے کے پھول اس کثرت سے کھلے ہوئے تھے کہ تنگی داماں کا احساس ہونے لگا۔ یگانہ کا مجھے لالہ کے پھولوں کی طرف متوجہ کرنا بے وجہ نہ تھا۔ یہ ۱۹۹۸ء کی گرمیوں کا موسم تھا۔ میں ایران میں سلمان ساوجی کے شہر ساوہ پہنچا تو رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ ہو پایا کہ جس جگہ میں اُترا ہوں، اس کا محل وقوع کیا ہے؟ صبح آنکھ کھلی تو اپنے مکان کے چاروں طرف ایک ایسا بیابان پایا جس میں خودرُو شقایق (لالے) کی فصل لہلا رہی تھی۔ آتشین رنگ کے پھولوں کا یہ منظر میری آنکھوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اقبال نے کسی ایسے ہی منظر کو دیکھ کر کہا تھا: ''لالہ کمر در کمر، نیمۂ آتش بہ بر'' یا ''لالہ ز خاک بر دمید... خاک شرر شرر ببین'' واقعی لالے کو دیکھ کر لگتا تھا زمین سے شرر پھوٹ رہے ہیں۔ میں نے دشتِ ساوہ سے لالے کے چند پھول توڑے اور اپنی ڈائری میں رکھ لیے۔ تہران پہنچ کر یہ پھول یگانہ کو پیش کر دیے۔ اس کی آنکھوں سے حیرت اور مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اس نے سہراب سپہری کا مصرع ''تا شقایق ہاست زندگی باید کرد'' پڑھتے ہوئے پھول مجھ سے لے لیے۔

✦✦✦

بس اصلی سڑک - جادۂ چالوس - سے اتر کر اب چھوٹی سڑک پر آ گئی تھی۔ ابھی ہمیں یہاں سے ۵۵ کلومیٹر اور آگے جانا تھا۔ یہ کوہستانی راستہ تھا۔ دور پس منظر میں البرز پہاڑ نظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلے جُڑے ہوئے تھے۔ انھی میں سے ایک ''کوہ اسبی کوہک'' کے دامن میں واقع ''بلدہ'' نامی قصبے میں جا کر ہماری بس رُکی۔ ہمسفروں میں سے دو چار نیچے اترے اور دوپہر کے کھانے کے لیے دہی کے چند ''کونڈے'' اور چند کلو کھیرے خرید لائے۔ ہمارے ہاں دودھ دہی کی دکانوں پر مٹی کی صحنک یا اسٹیل کی پرات میں دہی جمایا جاتا ہے۔ ایران میں اس کام کے لیے پلاسٹک کی بالٹی استعمال ہوتی ہے اور یہ ہر سائز میں دستیاب ہیں۔ ایران میں لبنیات- دودھ، دہی، پنیر- کا استعمال وافر ہے، خاص طور پر ناشتے میں پنیر کا استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔ وہاں کسی کو انکسار کے ساتھ کھانے کی ''صلح مارنے'' کے لیے روایتی جملہ یہی کہا جاتا ہے: ''جناب نان و پنیر حاضر ہے''۔ کھیرے کی اتنی اہمیت ہے کہ ایرانی جب تک مہمانوں کے آگے پھلوں سے بھری سینی کی چوٹی پر کھیرا سجا کر نہ رکھ لیں، پذیرائی نامکمل رہتی ہے۔ گل سرسبد تو سُنا تھا، میوۂ سرسبد ایران میں دیکھا۔ یہ کھیرے قلمی ہوتے ہیں، دُبلے پتلے، خوش رنگ، خوش ذائقہ، جنھیں چھال سمیت بھی کھا لیں تو ہضم ہو جائیں۔ تہران میں اگر کسی دکان کے آگے مرد و زن کی لمبی قطار نظر آئے تو دور سے ہی جان لیجیے کہ یہ لوگ سبزی فروش سے قلمی کھیرے خرید رہے ہیں یا نانبائی سے تازہ روٹی۔ نان و خیار کے حصول کے لیے اس قدر نظم و ضبط اور صبر و حوصلہ کے ساتھ صف بندی پر ایرانیوں کو داد دینا ہوگی!

بلدہ سے تھوڑا ہی آگے گئے تو کوہ سرچشمہ اور کوہ سرچال کے درمیان گھرے ایک گاؤں کے پاس جا کر بس رُک گئی۔ یہی ''یوش'' تھا۔ دس سال پہلے اس گاؤں کی آبادی صرف ۲۵۰ نفوس تھی، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گاؤں کس قدر چھوٹا ہے۔ مکانات پہاڑ کی ڈھلوان پر واقع ہیں۔ پہاڑ سے پھوٹنے والے چشموں کا پانی گاؤں کو سیراب کرتا ہوا نیچے ایک ندی کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ہم نے اسی ندی کے بہتے پانی کے کنارے دسترخوان بچھایا۔ سب نے اپنی اپنی زنبیلیں دسترخوان پر اُلٹ دیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے کھانے چن دیے۔ یگانہ اپنے اور میرے لیے ''کالباس'' والے برگر اور ''موسیر'' [لہسن ملا دہی] بطور چٹنی لائی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم دوسروں کے لائے ہوئے کھانے نہیں چکھ سکتے تھے۔ ایرانی اخلاقیات کے منافی ہے کہ وہ کوئی چیز خود کھائیں اور اپنے ساتھی کو ''صلح'' نہ ماریں، جسے وہ ''تعارف'' کہتے ہیں۔ سب نے ایک دوسرے سے تعارف کیا۔ جہاں ہم نے دسترخوان بچھایا تھا اس سے آگے درختوں کا گھنا جنگل تھا۔ جنگل کے اس پار کیا تھا؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کھانا کھا چکنے کے بعد اکیلا ہی درختوں کے اس انبوہ کی جانب چل پڑا۔ اس انبوہ کو چیر کر دوسری طرف نکلا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ آگے سرسبز کھیت تھے جن کے بیچوں بیچ ایک دریا بہہ رہا تھا۔ میں کھیتوں سے گذرتا ہوا دریا کے کنارے پر بیٹھ گیا اور پانی کے شور کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد

میرے کانوں میں باتوں کی بھنبھناہٹ سی ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو یگانہ، اپنی دوست خانم ماہ جان کے ساتھ، جسے وہ تہرانی لہجے میں ''مہ جون'' بلاتی تھی اور میں اسے ''معجون'' سمجھتا تھا! - شاید میری تلاش میں یا کسی نئے منظر کی تلاش میں، اِدھر ہی آ رہی تھیں۔ جس دُوری پر وہ تھیں وہاں سے انھیں اندازہ نہیں تھا کہ آگے دریا بھی ہے۔ میں نے انھیں ہاتھ سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ ان کے پیچھے آہستہ آہستہ باقی قافلہ بھی آ نکلا۔ سب نے دریا کا نظارہ کیا۔ ساتھ ہی کھیتوں میں کھِلے چھوٹے چھوٹے زرد اور بنفشی پھول ہمارا دامن اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ میری طرح ماہ جان بھی اس قافلے میں ''اجنبی'' تھی یعنی کسی کی مہمان بن کر آئی تھی، لیکن میرے مزاج کے برخلاف،، وہ بہت چلبلی اور سب میں گھل مل جانے والی لڑکی تھی۔ کچھ ساتھیوں نے پھول توڑ کر اس کی مانگ میں سجائے اور اسے اسی سال ''سبز بخت'' ہونے کی دعا دی! کیا عجب کہ ایران میں جاری ''سبز تحریک'' سے پوری ایرانی قوم ہی سبز بخت ہو جائے۔

گاؤں سے باہر ٹیلے پر ایک کہنہ قبرستان میں کیا داود کا تاریخی مقبرہ ہے۔ ٹیلے پر جانے کا کوئی صاف راستہ نہیں تھا۔ ایک جگہ جھاڑیوں کے درمیان سے کچھ کچی زمین ایسی تھی جہاں سے لگ رہا تھا کہ سیاح اس راستے سے اوپر جاتے ہیں۔ ہمارے قافلے کے نوجوان ہمت کر کے اوپر چڑھ گئے۔ میں بھی کوہ نوردوں کی طرح زمین کا سہارا لیتا ہوا ٹیلے پر پہنچ گیا، لیکن وہ مقبرہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اس میں فن تعمیر کے لحاظ سے کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ ایرانیوں کے لیے شاید اس میں قدامت کی وجہ سے کوئی کشش ہو، لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کیا داود کون ہے؟ میں نے نیچے اترنے کی ٹھانی اور اسی راستے سے نیچے جانا چاہا جس سے اوپر آیا تھا۔ لیکن معلوم ہوا میرے لیے نیچے اُترنا، اوپر چڑھنے سے زیادہ دشوار ہے۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل لڑھکتا ہوا نیچے آ گرا۔ کپڑے جھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا، خدا کا شکر ہے کسی ہمسفر کی مجھ پر نظر نہیں پڑی ورنہ کھسیانا ہوتا۔ میرا بازو چھِل گیا اور خون بہنے لگا۔ میں نے آدھے بازو والی شرٹ پہن رکھی تھی، لہٰذا میرا زخم چُھپ نہ سکا اس سے پہلے کہ یگانہ کی مجھ پر نظر پڑتی اور وہ مجھ سے سوال کرتی، میں نے زخم صاف کر کے دھو لیا۔ لیکن جلد ہی خون دوبارہ رسنے لگا اور یگانہ کے پوچھنے پر کچھ جھوٹ موٹ کہہ دیا! بعد میں پتا چلا میرا پاؤں بھی سوجھا ہوا ہے اور درد کر رہا ہے۔

جب ہم یوش کے نواح کی سیر سے فارغ ہوئے تو نیما یوشیج کا گھر دیکھنے چلے۔ یہ گھر گاؤں کے اندر ہے اور گاؤں پہاڑ کی ڈھلوان پر واقع ہے۔ ہم ایک گلی میں اوپر کی طرف چل رہے تھے۔ گلی میں اس چشمے کا پانی بھی ساتھ ساتھ نیچے کی طرف بہہ رہا تھا جو اوپر کہیں پہاڑ سے پھوٹتا ہے۔ میں نے منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مارا تو تازگی کا عجیب احساس ہوا۔ یوش کے جس مکان میں نیما رہتے تھے وہ اسی میں دفن ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ گھر ان کا مولد بھی ہے اور مدفن بھی۔ اسے اب ''خانۂ فرہنگ'' [ثقافتی مکان] کا نام دے دیا گیا ہے اور میوزیم بنا دیا گیا۔ ہم نے ٹکٹ لیا اور مکان میں داخل

ہوئے۔ایران میں مشاہیر کی قبروں پر جانے کے لیے آپ کو ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔۔شاہنامہ کے خالق فردوسی (طوس، مشہد) اور حکیم بوعلی سینا (ہمدان) کے مزاروں پر مجھے ایسا ہی اتفاق ہوا، بلکہ بدتر یہ کہ غیر ملکیوں سے دُگنے تگنے دام وصول کیے جاتے ہیں۔یہی بدعت قونیہ (ترکی) میں مولانا جلال الدین رومی کے مزار پر بھی دیکھی جسے میوزیم کا درجہ دیا گیا ہے اور داخل ہونے کے لیے ہر زائر کو ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے اور غیر ملکی کو کچھ زیادہ ہی ادا کرنا پڑتا ہے۔ایران اور ترکی میں زائرین کو مزارات پر جو سہولتیں مہیّا کی جاتی ہیں، ان کو برقرار رکھنے کے لیے اس طریقے سے کچھ رقم فراہم ہو جاتی ہے۔کیا ہم تصوّر کر سکتے ہیں کہ ایک دن ہمیں داتا صاحب یا علامہ اقبال کے مزار پر جانے کے لیے ٹکٹ خریدنا ہوگا؟

نیما کا مکان، حویلی کی طرح ہے۔دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ قدرے تنگ ہے جس میں ایک برآمدہ، چند کمرے اور باورچی خانہ ہے۔اس کی دیواروں پر نیما اور اس کے خاندان کی پرانی تصاویر، اس کے بعض اشعار اور نیما کی یاد اور تعریف میں دیگر شاعروں کا کلام آویزاں ہے۔نیما کی یہ سب تصویریں اسی گاؤں میں گذری ہوئی زندگی کے مناظر پر مشتمل ہیں۔کہیں نیما نے شکار کا لباس پہنا ہوا ہے، کہیں بندوق میں کارتوس بھر رہا ہے، کہیں وہ چرواہا ہے، کہیں اسی ندی کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھا ہے جہاں آج ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔نیما نے ایک دیہاتی زندگی گذاری ہے یا بہتر ہے یہ کہا جائے کہ فطرت کے درمیان زندگی گذاری ہے۔مکان کا اگلا یعنی پائینی حصہ وسیع تر صحن پر مشتمل ہے جس کے اردگرد کمرے ہیں۔اسی صحن کے وسط میں نیما کی قبر ہے۔اس سے کچھ فاصلے پر سیروس طاہر طاہباز کی قبر ہے جس نے نیما کا کلام جمع کیا تھا۔ایران میں قبروں کے سرہانے کتبے کھڑے کرنے کی بجائے قبر کے تعویذ پر جو پتھر لگایا جاتا ہے اسی پر صاحب قبر کے بارے میں کچھ کندہ ہوتا ہے۔نیما اور طاہر طاہباز کی قبروں پر بھی ایسے ہی پتھر نصب تھے۔نیما کی قبر کے پتھر پر یہ مختصر تحریر درج ہے:

نیما یوشیج

علی اسفندیاری

سپیده دم پنجشنبه ۱۴ دیماه ۱۳۳۸

اماموں اور امام زادوں کے مزارات پر حاضری کے آداب سے قطع نظر، ایران میں عام قبروں پر ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے کا رواج نہیں ہے۔یہاں ایرانی زائرین قبر کی پاس پنجوں کے بل بیٹھ کر ایک ہاتھ قبر پر رکھتے ہیں اور احترام بجالاتے ہیں۔نیما کی قبر بھی ایرانیوں نے ایسا ہی کیا۔پہلے سب پنجوں کے بل قبر کے پاس بیٹھے رہے پھر سب نے قبر کے پاس کھڑے ہو کر تصویریں بنوائیں۔

یہ مکان صوبہ مازندران کے محکمۂ سیاحت و ثقافتی ورثہ کی نگرانی میں ہے اور اسے ایک سیاحتی مقام کی حیثیت

حاصل ہوگئی ہے۔محکمہ کی طرف سے اس کی تزئین اورمرمّت کا کام ہو رہا تھا۔ ایران میں ہر سال نوروز کی تعطیلات میں جب اکثر و بیشتر ایرانی شمالی علاقوں کا رخ کرتے ہیں تو ادب دوست ایرانی سیاح یوش بھی جاتے ہیں۔

ہماری واپسی کا سفر شروع ہوا۔سورج ڈھل رہا تھا۔ جادۂ چالوس کے پہاڑوں کے سائے لمبے اور مہیب ہو چکے تھے ۔لیکن میں اس تاثر سے سرشار اور خوش تھا کہ تہران سے کوئی دو سو کلومیٹر دور، البرز پہاڑ کے دامن میں واقع ، ایک چھوٹے سے گاؤں میں بسنے والے اس شخص کی حویلی اور ابدی آرامگاہ دیکھ لی ہے جس نے فارسی شاعری کو نیا موڑ دیا۔اہل ایران نے اپنی قومی زبان اور ادب کے اس قہرمان کے مکان کو محفوظ کر کے اپنا خراج عقیدت پیش کر دیا ہے۔کیا پنجاب کے محکمۂ سیاحت و آثار قدیمہ کو یہ توفیق ہو سکتی ہے کہ علی پور چٹھہ میں ''پاکستانی نیما یوشیج'' ن م راشد کا مکان محفوظ کر لے؟

✦✦✦

امجد علی شاکر

کیمبرج، کیمبرج اور لندن

ٹرینٹی کالج کے بعد سوراج ہمیں کنگز کالج میں لے کر جاتا ہے۔ یہ یہاں کے بڑے کالجوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں سوراج بتاتا ہے: ''اس میں پانچ کورٹ ہیں۔ ہم انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ ان پر چل نہیں سکتے۔ ان پر صرف اساتذہ، وہ بھی سارے نہیں صرف سینئر اساتذہ اور اُن کے مہمان، چل پھر سکتے ہیں۔ طلبہ انھیں دیکھ کر رشک کرتے اور خواہش کرتے ہیں کہ ہم کبھی استاد بن گئے تو ان پر چل پھر سکیں گے۔'' وہ کہتا ہے: ''آکسفورڈ میں کچھ لان ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر نہ وہ خواہش کر سکتے ہیں، نہ ان پر چل سکتے ہیں۔ یہ لان سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ ان میں صرف مالی چل پھر سکتے ہیں۔'' میں یہ سن کر طلبہ پر ترس کھاتے ہوئے کہتا ہوں: ''آہ بیچارے طلبہ''۔ فرنٹ کورٹ کافی بڑا ہے۔ لان میں گھاس کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ تو قالین ہے۔ یہ مصنوعی لگتا ہے۔ یقیناً یہ انسانی ہاتھ کا تراشیدہ تو ہے، مگر قدرت نے زمین کو ایسی روئیدگی بخشی ہے کہ یہ بہت ہی سبز ہے۔ اس لان پر ہنری ششم کا مجسمہ استادہ ہے۔ آگے بلڈنگ ہے۔ اس بلڈنگ سے ایک طرف سے ہو کر نکلیں تو آگے اتنا بڑا کورٹ ہے کہ فرنٹ کورٹ کا وقار کم ہو جاتا ہے۔ یہ کورٹ سرسبز شاداب اور پھیلا ہوا ہے۔ یہ آگے اور آگے پھیلا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ دریائے کیم (CAM) آ جاتا ہے۔ دریا کا کنارہ اور سبزے کا فرش۔ ہلکی بارش میں اس کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ ہم لطف لیتے ہیں۔ دریا میں کشتیاں زیادہ نہیں ہیں۔ کچھ دیر کے لیے یوں لگتا ہے جیسے یہ پارک ہو۔ ہم اس منظر میں گم ہو جاتے ہیں۔ عمارتیں نظروں سے اوجھل ہونے لگتی ہیں۔ سوراج بتاتا ہے: ''ایسٹر ٹرم میں سیاحوں کے لیے صرف چیپل کھلا ہوتا ہے۔ دوسری ہر شے بند ہے۔''

''گویا ہم اُن دنوں آتے تو یہاں نہ آ سکتے۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں آپ ضرور آتے۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ طلبہ کے لیے کالج سارا سال کھلا ہے۔ وہ علاقہ بھی جہاں کبھی وزٹر جا سکتے ہیں اور وہ علاقہ بھی جہاں وزٹر نہیں جا سکتے۔''

''یہ ایسٹر ٹرم کب ہوتی ہے۔'' شاہینہ سوال کرتی ہے۔

''یہاں چار ٹرمز ہوتی ہیں۔ ایسٹر ٹرم نصف اپریل سے نصف جون تک ہوتی ہے۔''

اور بقیہ ٹرمز کب کب ہوتی ہیں؟

پہلی ٹرم اکتوبر کی ابتداء سے دسمبر کے ابتدائی ایام تک، دوسری ٹرم نصف جنوری سے نصف مارچ تک، تیسری

ٹرم ایسٹر ٹرم ہوتی ہے کہ یہ ایسٹر کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چوتھی ٹرم جون کے آخری دنوں سے نصف جولائی تک۔''

''ان چار ٹرمز کے درمیانی دنوں میں کیا ہوتا ہے؟'' میں چونک کر سوال کرتا ہوں۔

''چھٹیاں ہوتی ہیں۔''

''اتنی زیادہ چھٹیاں!'' حیرت سے میرا منہ کھل جاتا ہے۔

''ہاں اتنی زیادہ چھٹیاں۔ کیمبرج چھٹیوں کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔'' سوراج بتاتا ہے۔

''طلبہ ان چھٹیوں میں کیا کرتے ہیں؟''

''ریسرچ کرتے ہیں۔ اپنی اپنی لائبریری میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں اور اپنے ٹیوٹر سے مدد لیتے ہیں۔''

''پھر تو چھٹیاں بیکار جاتی ہیں۔'' میں تبصرہ کرتا ہوں۔ سوراج مسکرا دیتا ہے۔

یہاں کی عمارتیں بھی اپنی تاریخ رکھتی ہیں۔ اس کالج کا سنگِ بنیاد ہنری ششم نے ۱۴۴۱ء کو رکھا تھا۔ کالج سینٹ نکولس کے لیے بنایا جا رہا تھا۔ وہ یقیناً کیتھولک چرچ سے منسلک تھے۔ یہ کالج دو روایتوں کا امین ٹھہرا۔ رائلٹی کی روایت اور مذہب کی روایت۔ دونوں کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔ اس کا چیپل کیمبرج کے کسی بھی چیپل سے وسیع اور عظیم ہے۔ بنیادگزاروں کا خیال تھا کہ یہ اپنی مثال آپ ہو۔ پس یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اب اتنا عظیم چیپل پورے برطانیہ میں نہیں۔ اسی لیے تو اس کی تعمیر میں ایک مدت صرف ہوگئی۔ ہنری ششم قتل ہو گیا۔ پھر اس کے جانشین آتے گئے۔ وقت، موسم اور اداوار بدلتے گئے۔ جنگ اور امن کے اثرات اس چیپل پر اپنے نشانات رقم کرتے رہے۔ یہ چیپل فنِ تعمیر کے تین عہد دیکھ چکا ہے اور تینوں کے آثار و اثرات اس پر نظر آتے ہیں۔ اس چیپل کے ساتھ ایک لطیفہ اور ہوا کہ جب ہنری ششم اس کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا تو یہ کیتھولک چرچ کا حصہ تھا۔ اس کی تکمیل ہنری ہفتم کے عہد میں ہوئی۔ آں موصوف نے پاپائے روم سے بغاوت کر دی اور خود چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ بن گیا۔ اب یہ انگلیکن چرچ کا حصہ ہے۔

کنگز کالج کا چیپل کبھی عبادت گاہ کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ عبادت تو اب بھی یہاں ہوتی ہے، مگر یہ زیادہ تر دیکھا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بنانے والوں نے اسے قابلِ دید عمارت کے طور پر بنایا تھا۔ اس کو دیکھنے کے لیے الگ سے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے سوراج کا اسٹوڈنٹ کارڈ کافی ہے۔ ان کے جذبوں میں جذبۂ عبودیت تھا یا اظہارِ شہنشاہی کا جذبہ شدید تر تھا، کیا تھا، بہرحال ہم اسے دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہاں دیکھنے کو بہت کچھ ہے۔ اس ایک چیپل میں کتنے ہی چھوٹے چھوٹے چیپل ہیں۔ ان میں انفرادی طور پر عبادت کی جا سکتی ہے۔ اس کی عمارت میں لکڑی کا کام اتنا ہے اور ایسا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ویسے تو یہاں کی عمارتوں کا بیرونی منظر پتھروں کا ہے، مگر انھیں دیکھ دیکھ کر نظر پتھراتی نہیں۔ ان کے اندر جائیں تو لکڑی ہی لکڑی نظر آتی ہے۔ لکڑی کو انسانوں کے ہنرمند ہاتھوں نے کچھ ایسے ڈھالا ہے اور

اس میں کچھ یوں پھول بوٹے بنا دیئے ہیں کہ خشک لکڑی انسانی جذبوں کی امین لگتی ہے۔

یہ چیپل ۸۸ میٹر طویل اور ۱۲ میٹر عریض ہے۔ اس طول و عرض میں کھڑکیوں، دروازوں، آلٹر (قربان گاہ) اور کرسیوں تک ہر شے سے فنکاری اور ہنرمندی کا اظہار ہو رہا ہے۔ دائیں بائیں منسلکہ چھوٹے چیپل اپنی خوبی اور خوبصورتی کے لیے دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ کسی میں شیشے کا کام اپنا جمال دکھاتا ہے تو کسی میں وہی لکڑی کا کام۔ یہاں کتنے ہی چیپل ہیں اور ہر چیپل کے لیے الگ سے کوئی شناخت ضروری نہیں۔ ایک چیپل ایسا ہے جو بپتسمہ دینے کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے چھوٹے چیپل انفرادی عبادت کے لیے ہیں۔ بڑا چیپل اجتماعی عبادت کے لیے ہے۔ ظاہر ہے یہ اتوار کے اتوار ہی ممکن ہے۔ روزانہ کی عبادت دائیں بائیں کے کسی چھوٹے چیپل میں کی جا سکتی ہے۔ چیپل کی دیواروں پر تصویریں ہی تصویریں ہیں۔ کبھی قدیم یونان میں وہاں کی دیومالا کی تصویری تشکیل کی جاتی تھی۔ ویسے ہی رومن کیتھولک میں بائبل کی کہانیوں کی Illustiation کی گئی۔ کہیں صلیب پر حضرت مسیح علیہ السلام نظر آتے ہیں، کہیں بیماروں کو شفا دیتے اور کہیں بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے۔ معجزات جو بائبل مقدس میں روایت ہیں، یہاں رویت بن گئے ہیں یعنی تصویر کے روپ میں جلوہ گر ہیں۔ ہم دیر تک چیپل کو دیکھتے باہر آئے اور مختلف ادوار میں بنی بہت سی عمارتوں کو دیکھنے لگے۔

کنگز کالج کی عمارتیں کئی صدیوں میں بنی ہیں اور کئی صدیوں کی تاریخ سناتی ہیں۔ کتنے ہی فنون تعمیر ان عمارتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ عمارتیں عہد بہ عہد تعمیر ہوتی رہیں اور ہر عہد کا فن تعمیر محفوظ ہوتا رہا۔ اب بھی صدیوں پرانی عمارتوں پر کہیں خطرناک عمارت کا بورڈ آویزاں نہیں۔ خدا جانے یہ لوگ ایسی عمارتیں کیوں بناتے ہیں۔ گویا انھوں نے یہاں مستقل رہنا ہے۔ ہمارے ہاں کے ٹھیکیداروں میں دنیا سے بے رغبتی بہت ہے۔ وہ یہ سوچ کر عمارتیں بناتے ہیں کہ دنیا چند روزہ ہے۔ عمارتیں چند روز چل جائیں، یہی کافی ہے۔ اگر چند روزہ نہ بھی چلیں تو ایسی بھی کیا دنیاداری ہے۔ پختہ عمارتیں بنانے کی روایت ہمارے ہاں کے سلاطین میں بہت تھی۔ وہ خود چلے گئے۔ عمارتیں ہمارے لیے چھوڑ گئے کہ دیکھتے رہیں اور ان کے متعلق باتیں بناتے رہیں۔ یہاں ہم باتیں بنانے کی بجائے باتیں کرتے پُل کی طرف بڑھتے گئے۔ پل کے نیچے دریائے کیم بہہ رہا تھا اور ہم پل کے کنارے درختوں اور پھولوں میں کھڑے تصویریں بنا رہے تھے۔ ویسے یہ منظر خود ایک تصویر لگتا تھا۔ پل کے پار دیکھا تو چراگاہیں نظر آئیں۔

کنگز کالج میں ہم دیر تک گھومتے رہے۔ منظروں کو نظر میں جذب کرتے رہے۔ سوراج اپنی ٹوٹی پھوٹی معلومات کے دریا بہاتا رہا اور ہم سوال پر سوال کرتے رہے۔ کبھی یہ بھول جاتے کہ وہ یہاں کا سٹوڈنٹ ہے، پیشہ ور گائیڈ نہیں۔ وہ نپی تلی بات کرتا۔ وہ بعض ایسی باتیں بتا رہا تھا جو ایک سٹوڈنٹ بتا سکتا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ یہاں قصبے کے لوگوں اور کالجز کے طلبہ کے مابین سرد جنگ رہتی ہے۔ قصبے والے طلبہ کو گاؤنی کہتے ہیں۔ جیا پوچھتی ہے: ''اور طلبہ قصبے والوں کو کیا

کہتے ہیں؟''

''ہم قصبے والوں کو ٹاؤنی کہتے ہیں۔''

کیمبرج اور آکسفورڈ کی آبادی میں کیا فرق ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کیمبرج تو قصبہ ہے اور آکسفورڈ شہر ہے۔ پھر وہ گوگل پر سرچ کرتا ہے اور اپنے بیان کی تصحیح کرتا ہے: ''نہیں نہیں دونوں ہی قصبے ہیں۔ آکسفورڈ ذرا بڑا ہے۔''

ہمارا اگلا پڑاؤ سینٹ جانز کالج تھا۔ یہ ہنری ہشتم کی پردادی لیڈی مارگریٹ نے ۱۵۱۱ء میں قائم کیا تھا۔ اس کے صدر دروازے پر آں محترمہ کا خاندانی نام لکھا ہوا ہے۔ آگے گلی میں سینٹ جان کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ اس کے قدموں میں عقاب نظر آتا ہے جو ایک علامتی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں قبل ازیں انھی سینٹ جان کا ہسپتال تھا۔ یہ کالج بھی اپنی وسعت میں بے پناہ ہے۔ اس کا چیپل ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوا تھا۔ گویا کالج سولہویں صدی کے آغاز میں بننا شروع ہوا جب ایسٹ انڈیا کمپنی عالم وجود میں نہیں آئی تھی۔ چیپل مکمل ہوا تو برطانیہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جیت چکا تھا اور شاہ برطانیہ کے تاج میں ہندوستان کی حکومت کا پھندنا بھی شامل ہو چکا تھا۔ تب تک ہندوستان کی دولت اُن کے خزانے میں اور نوادر اُن کے عجائب خانوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ فتح کا نشہ تھا کہ اس چیپل کا ٹاور کیمبرج میں سب سے بلند نظر آتا ہے۔ اس کی بلندی میں فاتح کا غرور بھی شامل تھا۔ ہم شکستہ خوردہ لوگوں نے اپنے بادشاہ کا سوچا جو کسی کی آنکھ کا نور یا کسی کے دل کا قرار نہ تھا، مگر اس کی درمندی بھی کیا تھی، وہ کہہ رہا تھا:

جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

ویسے تو بُرج بھی صرف دکھادے کے کام آتے ہیں، مگر یہ تاریخ سناتے اور تاریخ کے ستم زدوں کو ان کے دُکھ یاد دلاتے ہیں۔ ویسے تو یہاں یاد کرنے کو بہت کچھ ہے۔ یہاں سڑک کنارے ایک بادشاہ کے مقہور شخص کا مجسمہ بھی نظر آتا ہے۔ اس پیرِ دانا نے لیڈی مارگریٹ کو قائل کیا تھا کہ وہ یہاں ایک کالج بنائے، مگر وہ ہنری ہشتم کی اصلاح کلیسا کی پالیسیوں سے اختلاف کر بیٹھا۔ اس طرح کے کاموں کا نتیجہ ہمیشہ ایک سا رہا ہے، یعنی جس سر میں اس طرح کا دماغ پایا جائے، اسے جسم سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ جسم قبر میں چلا جاتا ہے اور دماغ اپنے سر کے ساتھ ہی تاریخ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

اس کالج کی عمارتوں سے متعلق بہت سی کہانیاں وابستہ ہیں۔ سرخ اینٹوں کی ایک عمارت سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے بنانے والوں کے لیے بدنصیبی لائی تھی۔ اس کی تعمیر میں جس خاتون نے پیسہ لگایا، وہ اس کا پورا بل ادا کرنے کے قابل نہ رہی۔ ایک معمار کا تعمیر کے دوران میں ہاتھ نہ بچا اور ایک معمار کے خلاف کالج والوں نے مقدمہ کر دیا اور وہ جیل چلا گیا۔ جن عمارتوں کے پیچھے شاہی خاندان ہوتے تھے، اُن کے معمار زیادہ خوش نصیب نہیں ہوتے تھے۔ یا تو زندہ نہ رہتے اور اگر زندہ رہتے تو گمنام مر جاتے۔ عمارتیں صرف شاہوں کا نام سناتی ہیں، معماروں کو بھول جاتی ہیں۔

اس کالج میں بہت سے کورٹس ہیں۔ایک کورٹ کو ویڈنگ کیک کہا جاتا ہے۔ یہ انھی دنوں بنایا گیا جن دنوں آہوں کا پل تعمیر کیا جارہا تھا۔ یہ کورٹ سرسبز اور شاداب ہے۔ایک ہی وقت میں کیسی کیسی تعمیرات ہوتی ہیں، جن کی قسمتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔آہوں کا پل قیدیوں کی گزرگاہ تھا۔ان کی آہوں نے اسے Bridge of Sighs کا نام دے دیا۔اب بھی یہ نام زباں زدِعام ہے۔

یہاں عمارتیں بہت ہیں، مگر انھیں کنکریٹ یا پتھروں کا جنگل کہنا ممکن نہیں۔ یہاں درخت اور پھول پھل بھی بہت ہیں۔جنگلی پھولوں کا ایک سلسلہ تھا کہ دور دور تک چلا گیا تھا۔ولیم ورڈزورتھ یہاں ۱۷۸۷ء میں طالب علم رہا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اسے شاعری کے لیے یہاں کے کورٹس میں اُگے پھول اور دریائے کیم کا کنارہ ہی بہت تھا۔وہ یہاں رہ کر بھی اسی قسم کی شاعری کرسکتا تھا جو اس نے تمام عمر کی۔اسے لیک ڈسٹرکٹ جانے کی ضرورت نہیں تھی، مگر مجھے اس سے اتفاق نہ ہوسکا۔میں لیک ڈسٹرکٹ دیکھ چکا تھا اور کسی طرح بھی اس دعوے سے اتفاق نہ کرسکتا تھا۔

یہ کالج کیمبرج کے قدیم اور اہم کالجوں میں شامل ہے۔اس کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ یہاں ورڈزورتھ پڑھتا رہا۔جیسے گورنمنٹ کالج لاہور کے لیے اقبال کی مادرِعلمی ہونے کا اعزاز ہی کافی ہے۔یہاں اور بھی بڑے لوگ پڑھتے رہے۔ولیم وائرفورس یہاں کا طالب علم تھا۔وہ غلامی کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔یہاں سے پڑھ کر چھے لوگ وزیراعظم بنے، تین آرچ بشپ ہوئے۔ابتدا میں یہ کالج بشپ اور آرچ بشپ بنانے کے لیے بنا تھا۔یہاں کے بیشتر کالج اسی مقصد کے لیے بنائے گئے۔ پھر چیپل صرف دیکھنے کے لیے رہ گئے اور لائبریریاں اور لیبارٹریاں آباد ہوتی گئیں۔یہاں سے بھی تین بڑے سائنس دان پڑھ کر نکلے۔ پاکستان کے نوبیل انعام یافتہ عبدالسلام یہیں پڑھتے رہے۔ ان کا سوچ کر یہ بات سمجھنا آسان ہوجاتا ہے کہ ایک شعبے کے فاضل شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ دوسرے شعبے میں عام آدمی کی طرح پیدائشی فکر سے ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ویسے بھی ہدایت صرف اللہ کے پاس ہے۔یہاں سے نو لوگوں نے نوبیل انعام حاصل کیا۔

ہم سینٹ جانز کالج سے باہر آتے ہیں اور چلے چلتے کنگز پریڈ پر آجاتے ہیں۔یہاں سینیٹ ہاؤس ہے۔یہاں ہر گریجویٹ کو ڈگری دی جاتی ہے۔ڈگری عطا ہونے سے پہلے ہر طالب علم کا رزلٹ کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں کردیا جاتا ہے۔سوراج بتاتا ہے: ''یہاں بہت احتجاج ہوا کہ رزلٹ طالب علموں کا ذاتی معاملہ ہے۔اس کو عام نہیں ہونا چاہیے، مگر کیمبرج کی روایات غالب رہیں اور انتظامیہ نے مان کر نہ دیا۔'' سوراج نے بتایا:

''یہاں سینیٹ ہاؤس میں تقسیم اسناد کی تقریبات میں تین کالجوں کو ترجیح حاصل ہے۔''

ہم حیران ہوتے ہوئے سوال کرتے ہیں: ''وہ کیوں؟''

وہ بتاتا ہے: ''یہ تین کالج رائل کالج سمجھے جاتے ہیں۔''

پھر وہ بتاتا ہے: ''یہ تین کالج سینٹ جانز کالج، کنگز کالج اور ٹرینٹی کالج ہیں۔''

ہم قدیم ترین جمہوری ملک میں اس غیر جمہوری رویے کا سن کر چونکتے ہیں، مگر چپ رہتے ہیں۔ سوراج بتا رہا ہے:

''کسی کالج نے پروگرام بنا رکھا ہو اور ان تین میں سے کوئی کالج پروگرام بنالے تو دوسرے کالجوں کو اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑتا ہے۔''

ہم سینیٹ ہاؤس کی عظیم عمارت کو دیکھتے ہیں۔ یہاں ایک خاص راستہ ہے جہاں سے گریجویٹ جلوس کی شکل میں گزرتے ہیں۔ سوراج بتاتا ہے:

یہاں صرف اسناد تقسیم ہوتی ہیں۔ انعامات اور اعزازات کالج اپنے چیپل میں تقسیم کرتے ہیں۔ سینیٹ ہاؤس ۱۷۳۰ء میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ زمانہ ہمارے ہاں سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ انگلینڈ اپنے ہاں کے نظامِ تعلیم کو ترقی دے رہا تھا تاکہ وہ عالمی امپریلزم کا نظام چلا سکے۔ سینیٹ ہال کی تقریبات میں علم کا وقار بھی ہوتا ہے اور امپریلزم کا شان و شکوہ بھی۔ اب امپریلزم کی یادیں بچی ہیں جو یہاں کے در و دیوار سے جھلک رہی ہیں۔

''سینیٹ ہاؤس تو ۱۷۳۰ء میں تعمیر ہوا تھا۔ اس سے پہلے اسناد کہاں دی جاتی تھیں؟'' میں نے سوراج سے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ جاتا ہے اور کچھ بتا نہیں سکتا۔

ہم پھر کنگز پریڈ پر ہیں۔ یہاں ایک جگہ بہت لوگ کھڑے ہیں۔ بہت سے ملکوں کے لوگ گروہ در گروہ یہاں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، مگر کہیں ہجوم نہیں کرتے۔ حیرت ہے یہاں ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ ہم ان میں جا شامل ہوتے ہیں۔ سامنے کارپس کلاک ہے۔ میں پوچھتا ہوں: ''کیا یہ بھی قدیم ہے۔''

سوراج بتاتا ہے: ''نہیں یہ پرانا تو نہیں ہے۔ ابھی کچھ سال پہلے لگایا گیا ہے۔''

یہ بہت بڑا کلاک ہے۔ اس کا تخیّل جان سی ٹیلر نے پیش کیا اور سٹوارٹ ہگز لے نام کے انجینئر نے اسے ڈیزائن کیا۔ یہ اتنا بڑا کلاک ہے کہ اسے دو سو آدمیوں کی مدد سے پانچ سال میں بنایا اور نصب کیا گیا۔ اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ سٹیفن ہاکنگ نے اس کی نقاب کشائی کی۔ یہ دنیا کا بڑا کلاک ہے۔ ہمارے ہاں ایشیا کی سب سے بڑی شے بنانے یا بتانے کا رواج بہت ہے، مگر یہاں دنیا کی بڑی شے بنانے کا کلچر ہے۔ ویسے بھی یہ دنیا کی قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ اس کلاک میں ایک مگرمچھ بیٹھا لمحوں کو کھا رہا ہے اور ہر پندرہ منٹ کے بعد اپنی دُم اٹھاتا ہے۔ اس کے نیچے ایک پنڈولم بھی ہے۔ اب ہمارے ہاں پنڈولم والی گھڑیوں کا رواج بہت کم رہ گیا ہے۔ یہ کلاک سترہویں اٹھارہویں صدیوں کی گھڑی سازی کے انداز کو یاد دلا رہا ہے۔ گھڑی کی ایجاد دنیا کی بڑی ایجادوں میں سے ایک ہے۔ یہ کلاک وقت کے

گزرنے کا احساس کم ہی دلا رہا ہے۔ دیکھنے والے اس کے ڈیزائن میں گم ہیں اور گھڑی سازی کی صنعت کی تاریخ کو یاد کرتے ہیں۔

ہماری اگلی منزل یونیورسٹی کا سرکاری چرچ ہے۔ اس کا نام گریٹ سینٹ میری چرچ ہے۔ کیمبرج میں چرچ تو بہت ہیں۔ اتنے ہی زیادہ اور اتنے ہی وسیع وعریض اور بلند و بالا جیسے تمام انگلینڈ میں ہیں۔ یہاں کبھی لوگ بہت مذہبی ہوتے ہوں گے اور بادشاہ مذہب کے محافظ۔ وہ اسی طرح مذہب کی حفاظت کر سکتے تھے کہ بڑے بڑے چرچ بنواتے۔ بادشاہت تو خیر اب بھی مذہب کی محافظ ہے، مگر یہ حفاظت صرف کاغذی کارروائی تک محدود ہے۔

یہاں چرچ میں کتابوں کا سٹال موجود ہے۔ ایک محترمہ موجود ہیں۔

میں پوچھتا ہوں: ''یہ چرچ کیتھولک ہے یا پروٹسٹنٹ؟''

محترمہ بتاتی ہیں: ''نہیں یہ انگلیکن چرچ ہے۔''

وہ محترمہ خاصی باخبر ہیں۔ ہمیں بتاتی ہیں: ''یہ چرچ سینیٹ ہاؤس کی تعمیر سے قبل یونیورسٹی کا سرکاری چرچ تھا۔''

ہم حیران ہو کر پوچھتے ہیں: ''سرکاری کا کیا مطلب؟''

وہ بتاتی ہیں: ''۱۷۳۰ء تک تقسیم اسناد کی تقریبات یہیں ہوتی تھیں۔ تقریری مقابلے بھی یہاں ہوتے تھے۔'' وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے: ''اب بھی یونیورسٹی سے اس کا تعلق برقرار ہے۔ یہ اب بھی یونیورسٹی کا چرچ ہے۔'' اس کی ایک دیوار پر یونیورسٹی کی تاریخ رقم ہے۔ پتا چلتا ہے کہ یہاں ۱۲۰۹ء میں کچھ اساتذہ آئے تھے۔ یہ استاد آکسفورڈ میں پڑھاتے تھے، مگر وہاں شہر والوں نے فساد کر دیا تو کچھ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے اور یہاں آ پہنچے۔ یہ سال یونیورسٹی کا سرِ آغاز ہے۔ یہاں پہلا کالج ۱۲۸۴ء میں قائم ہوا۔ یہ پیٹر ہاؤس ہے، مگر یونیورسٹی تو استاد کا نام ہے۔ انگریزوں کو ویسے بھی قدامت کا شوق ہے۔ انھوں نے ۲۰۰۹ء میں یونیورسٹی کا آٹھ سو سالہ جشن منایا تو کسی نے یہ نہیں پوچھا تھا: ''بھیا ۱۲۰۹ء میں یونیورسٹی کہاں تھی۔'' ہمارے لوگوں کو قدامت کا کوئی ایسا شوق بھی نہیں ہے، ورنہ ہم ٹیکسلا یونیورسٹی کا کئی سو سالہ جشن منا سکتے تھے۔ شاہی مسجد یونیورسٹی کا چار سو سالہ جشن منانا چاہیں تو ہم خود ہی اپنا مذاق اڑائیں گے کہ یونیورسٹی تو انگریزوں کا لایا ہوا تصور ہے، حالانکہ کیمبرج اور آکسفورڈ بھی ابتدا میں مذہبی مدرسے ہی تھے۔ یہاں پڑھنے پڑھانے والے مانکس (Monks) کہلاتے تھے۔ اس کا اردو مترادف قلندر درویش، جوگی ہو سکتا ہے۔ Monk سے مراد ماٹیسری یعنی خانقاہ یا صومعہ میں رہنے والا ہے۔ یہاں پڑھنے پڑھانے کا مقصد وہی تھا جو ہمارے ہاں کے دینی مدارس کا مقصد ہے۔ وہی عقیدے اور ایمان کی تبلیغ۔ پہلے تو یہاں تعلیم کا مقصد لاطینی زبان میں مہارت کا حصول تھا۔ یہاں کی تعلیم کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں ۱۷۷۲ء تک امتحان زبانی ہوا کرتا تھا اور امتحان دینے والا تین ٹانگوں والے سٹول پر بیٹھتا تھا۔ اب سٹول تو کہیں

کسی سٹور میں یادگار کے طور پڑے ہوں یا نہ ہوں، مگر یہ سٹول یہاں کے امتحان کے لیے Tripos کی اصطلاح دے گئے۔

کیمبرج کے تعلیمی نظام میں دنیاوی علوم کی تدریس ۱۲۸۴ء میں ہی شروع ہوگئی تھی، لیکن دینی تعلیم ۱۸۷۱ء تک لازمی رہی۔ فیلو راہبانہ زندگی گزارتے۔ وہ شادی کرنا چاہتے تو فیلوشپ چھوڑ کر ایسا کر سکتے تھے۔ پھر یہاں خواتین کی تعلیم کا کوئی ایسا رواج نہیں تھا۔ ہمارے سرسید احمد خاں تعلیم نسواں کے خلاف تھے۔ ہمیں بہت شرمندگی ہوتی ہے کہ ہمارے اتنے بڑے مفکر اور ایسی کمزور سوچ کے حامل۔ کیمبرج میں ۱۹۴۷ء میں پہلا خواتین کالج قائم ہوا۔ سرسید احمد خاں کی وفات کے صرف نصف صدی بعد اور لطیفہ یہ کہ ان بیچاریوں کو تعلیم تو دی جاتی تھی، ڈگری نہیں دی جاتی تھی۔ ڈگری دینے کا رواج مزید پچیس سال بعد میں ہوا جب یہاں مختلف کالجوں میں خواتین کو داخلے کی اجازت ملی۔ خواتین کے حقوق کے حوالے سے ہمارے ہاں کی یونیورسٹیاں بہت آگے ہیں۔ کیمبرج میں طالبات کی تعداد اب بھی کچھ بہت زیادہ نہیں۔ ان کا تناسب زیادہ سے زیادہ وہی ہوگا جو ہمارے ہاں پنجاب یونیورسٹی میں لڑکوں کا ہوتا ہے۔ کیمبرج میں جن دنوں نیوٹن پڑھتے اور پھر پڑھاتے رہے، یہاں عورت ذات کا داخلہ ممنوع تھا۔ آئن سٹائن کا زمانہ بھی بہت پرانا ہے۔ سٹیفن ہاکنگ جب یہاں پڑھتے تھے۔ عورت بیچاری تو یہاں داخلہ نہیں لے سکتی تھی اور اس پر کیمبرج والے کوئی شرمندہ بھی نہیں ہیں۔

سوراج بتاتا ہے: ''یہاں عورتوں کی تعلیم کو بس چالیس پچاس سال ہوئے ہیں۔''

ہمارے ہاں ان پچاس سالوں میں دنیا کیا سے کیا ہوگئی ہے۔ عورت کی ترقی کے معاملے میں ہم یہاں سے بہت آگے ہیں۔

اس چرچ کی تعمیر ۱۶ مئی ۱۴۷۸ء کو چھے بج کر پینتالیس منٹ پر شروع ہوئی۔ اس سے پہلے بھی یہاں چرچ ہی تھا۔ دوبارہ تعمیر شروع ہوئی تو فنڈ بہت کم تھے۔ یونیورسٹی نے عطیات کی وصولی کے لیے گھڑسوار سفیر ملک بھر میں روانہ کیے۔ چندے کی اپیل لیے یہ لوگ شہر شہر گئے۔ فنڈز جمع کیے، تعمیر آگے بڑھی۔ چرچ ۱۴۹۱ء میں مکمل ہوگیا۔ پھر ۱۵۳۶ء میں ٹاور کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ یہ مختلف تعمیری مراحل سے گزرتے ہوئے ۱۶۰۸ء میں تکمیل پذیر ہوا۔ صدیوں عطیات جمع ہو کر خرچ ہوتے رہے۔ اب اس ٹاور کے لیے چندہ لینے کی بجائے ٹکٹ بیچے جاتے ہیں۔ ہاں یونیورسٹی کے طلبہ اور ان کے دو دو مہمان بغیر ٹکٹ کے اوپر جا سکتے ہیں۔ اوپر جانے کے لیے ۱۲۳ سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ یہ ۱۱۴ فٹ بلند ہے۔ بلندی پر جا کر چار سو دیکھا جاتا ہے۔ ہر طرف عمارتیں ہیں، بلند و بالا عمارتیں۔ یہ کنگز کالج ہے، یہ بھی کنگز کالج ہی ہے مغرب اور جنوب میں زیادہ تر یہی کالج نظر آتا ہے۔ یہ ٹرینٹی ہال ہے۔ یہ ٹرینٹی کالج ہے۔ یہ سینٹ جانز کالج ہے۔ تینوں رائل کالج آس پاس ہی ہیں۔ یہ یونیورسٹی کا مرکزی علاقہ ہے۔ ٹاور کتنا اچھا ہے۔ ہم نیچے آ جاتے ہیں۔ بعد میں ایک معلوماتی کتابچے سے پتا چلتا ہے کہ جس روز یہ ٹاور مکمل ہوا۔ اس کا معمار بغیر سیڑھیوں کے نیچے آ گیا تھا۔ منتظمین نے یقیناً اُس کے

متعلق بتایا ہوگا کہ وہ سیدھا جنت میں چلا گیا ہے۔

ہمیں احساس ہوتا ہے کہ دن کا بہت حصہ گزر گیا ہے۔ ابھی ہم نے چند ہی کالج دیکھے ہیں۔ ہم زیادہ کالج نہ دیکھ پائیں گے، نہ ایسی ضرورت ہے، مگر بعض کالج ایسے ہیں جنھیں دیکھ لینا چاہیے۔ سوراج کا خیال ہے کہ ہم دو تین پرانے کالج دیکھ لیں تاکہ ہم اس کی قدامت سے آگاہ ہوسکیں۔ وہ ہمیں بے ترتیب سڑکوں اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔ کبھی ہم کسی کالج میں جا نکلتے ہیں اور کبھی کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ اب مجھے کوئی ترتیب یاد نہیں کہ ہم کس ترتیب سے گئے تھے اور ہم نے یہ کالج دیکھے تھے۔

پیٹر ہاؤس یہاں کا قدیم ترین کالج ہے۔ یہ ۱۲۸۴ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کالج کے ابتدائی طلبہ رشی مُنی قسم کے لوگ تھے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ کبھی یہاں رشنی منی پڑھتے تھے۔ اب دنیا دار نوجوان دنیا کی زندگی کے اسرار کھوجتے ہیں۔ ویسے تو حافظِ شیراز نے کہا تھا:

حدیثِ مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جُو
کہ کس نکشود و نکشاید حکمت ایں معمّا را

یہاں مطرب کا تو پتا نہیں، مے خانہ ضرور موجود ہے۔ ویسے میخانہ ہر کالج کا اپنا ہے۔ یہاں کوئی کسی سے یہ نہیں کہتا کہ بہ چنگ مے مخور کہ محتسب تیز است۔ یہاں محتسب نے اس کی آزادی دے رکھی ہے۔ شرطِ میخواری یہ ہے کہ عمر اٹھارہ سال ہو۔ اس سے کم عمر کا شخص نہ خرید سکتا ہے، نہ پی سکتا ہے۔ ہمیں میکدے سے کوئی غرض نہیں تھی، مگر یہ کئی جگہ ہمارے کام آیا۔ وہ یوں، جب کبھی ٹوائلٹ جانے کی ضرورت پڑی۔ میخانے کھلے پائے اور ان کے ٹوائلٹ بھی۔

پیٹر ہاؤس کی عمارت بھی عظیم و جلیل ہے، اس کے لان بھی کمال کے ہیں۔ اس کے لان میں دور دور تک ڈیفوڈلز دکھائی دے رہے تھے۔ اتنے وسیع لان میں اتنے بے شمار پھول کھلے تھے کہ کوئی بھی شاعر انھیں دیکھتے ہی شعری تجربے سے دوچار ہوسکتا ہے۔ اس کی بلڈنگ کے عقب میں ۱۹۳۰ء کی دہائی تک ہرنوں کا پارک تھا۔ غزالانِ رعنا یہاں کھلے پھرتے تھے، مگر اب وہ یہاں نہیں ہیں۔ کہاں گئے، کسی نے بتایا نہیں۔ ہم کیا بتائیں۔ اس کالج کی ایک تاریخی حیثیت یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے بعد یہ دوسرا مقام ہے جہاں ۱۸۸۴ء میں بجلی کے چراغ روشن ہوئے تھے۔ تب اس کا ۶۰۰ سالہ جشن منایا جارہا تھا۔ یہ کالج یہاں کا پہلا کالج ہے تو یونیورسٹی اس سے پچھتر سال پہلے کیسے بن گئی۔ کسی نے بتایا نہیں۔

کلیر کالج (Clare College) یہاں کا دوسرا قدیم کالج ہے۔ یہ ۱۳۲۶ء کو عالم وجود میں آیا۔ اس کی بلڈنگ اٹھارہویں صدی میں دوبارہ تعمیر ہوئی۔ بتایا گیا کہ لیڈی ایلزبتھ نے ۱۳۳۸ء میں اسے بہت عطیات مہیا کیے۔ وجہ یہ تھی آں موصوفہ تین دفعہ بیوہ ہوئیں۔ بار بار کی بیوگی نے ان کا دل نرم کر دیا تھا۔ انھوں نے اس کالج کو مالا مال کر دیا۔ اس

کالج کے قریب دریائے کیم پر قدیم ترین پل موجود ہے جو ۱۶۳۸ء میں بنایا گیا اور پتھر سے بنایا گیا۔

یہ کالج ان تین کالجوں میں سے ایک تھا جنھوں نے ۱۹۷۲ء میں خواتین کو داخلہ دیا۔ یقیناً اس کالج میں بڑے بڑے لوگ پڑھے ہوں گے۔ آخر اس کالج کو سات صدیاں ہونے کو ہیں۔ اس نے خدا جانے کیسے کیسے مبلغ، بشپ اور سکالر پیدا کیے۔ ہم کس کس کا سراغ لگائیں۔

ہم چلتے چلتے نوٹ کرتے ہیں۔ یہاں سائیکلیں بہت ہیں۔ جہاں کہیں لوہے کا جنگلا نظر آیا، اس کے ساتھ سائیکلیں لاک کی ہوئی نظر آئیں۔ سوراج نے بتایا: ''یہاں سائیکلوں کو لاک کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ ان کی چوری بہت عام ہے۔''

میں حیران ہوتا ہوں۔ انگریز اور چوری۔ میں تو انھیں ماورائی مخلوق سمجھے ہوا تھا۔ سوراج بتاتا ہے:

''یہاں سائیکل کا استعمال بہت عام ہے۔ جو شخص سائیکل چوری کرتا ہے اسے یقین ہوتا ہے یہ بِک جائے گی۔''

ہم سائیکل چوری کا قضیہ بھول کر ایک اور کالج میں جاتے ہیں۔ یہ کارپس کرسٹی کالج ہے۔ یہ وہ کالج ہے جو یہاں کے شہریوں نے بنایا تھا۔ اس کالج کی ضرورت یوں پڑی کہ پلیگ میں بہت سے پادری فوت ہو گئے۔ ان کے بغیر نہ بپتسمہ ہو سکتا تھا، نہ جنازہ۔ یہ کالج ۱۳۵۳ء میں وجود میں آیا اور ۱۳۸۱ء کی کسان بغاوت میں برباد ہو گیا۔ یہ پھر آباد ہوا۔ یہیں کے پادری نے ہنری ہشتم کی اصلاحِ کلیسا کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس مقصد کے لیے قیمتی کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا گیا۔ ۱۶۳۰ء میں یہاں دوبارہ پلیگ نے حملہ کیا تو یہاں کے ہاؤس ماسٹر نے پلیگ میں مرنے کے بجائے اس کے خوف میں موت کو خود آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

ماڈلین (Magdalene) کالج ۱۴۲۸ء میں بطور خانقاہ کے بنا تھا اور راہبوں کا ہوسٹل تھا۔ ہنری ہشتم نے خانقاہیں بند کر دیں تو یہ کالج ہو گیا۔ ہاؤس ماسٹر آڈلے نے اس کا تلفظ اپنے نام جیسا کر دیا اور اسے ہوسٹل سے کالج بنا دیا۔ یہ کالج سڑک کے دونوں طرف پھیلا ہوا ہے، مگر ہم اسے دیکھنے کی بجائے Magdalene پل کو دیکھنے آگے بڑھ گئے۔ یہ ۱۸۸۲ء میں بنا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہاں ۸۷۵ء میں ایک پل بنا تھا۔ یہ پل اس دریا کا پہلا پُل تھا۔ ماڈلین کالج میں سب سے آخر میں ۱۹۸۸ء میں لڑکیوں کو داخلہ دیا گیا۔ آہ بیچاری لڑکیاں!

ہم نے کیمبرج کو بہت دیکھ لیا۔ اس سے زیادہ کچھ دیکھنا باقی تھا، مگر کیا کچھ دیکھتے۔ ہم تھک چکے تھے۔ بھوک سے بھی نڈھال ہو رہے تھے۔ ہم کھانے کی تلاش میں تھے۔ ہمارا مسئلہ یہ بھی تھا کہ حرام سے بچنا ہے۔ آسان آپشن یہی تھا کہ انڈین کھانے تلاش کیے جائیں۔ سوراج ایسے کسی ریسورنٹ سے زیادہ واقف نہ تھا۔ اس نے اندازاً ایک راستے پر چلنے کو کہا۔ ایک جگہ انڈین فوڈز کا بورڈ نظر آ گیا۔ ہم ایک تنگ سی راہداری سے گزرتے ہوئے ایک تہہ خانے میں جا اُترے۔

ایک میز پر نشست سنبھالی، مگر پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ انڈین کھانوں کا وقت گزر چکا ہے۔ ہم کھوٹے سکے کی طرح واپس ہوئے۔ آخر چلتے چلتے ایک ریسٹورنٹ میں جا پہنچے۔ یہاں دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ کھانے کو بھی اور پینے کو بھی، مگر ہمارے کھانے کے لیے کیا کچھ ہوسکتا تھا، یہ ایک سوال تھا۔ ہم نے ان کے مینیو کا مطالعہ شروع کیا۔ میں نے سیدھے سبھاؤ چپس اور کافی پر انگلی رکھی۔ جیا نے ایک دو کھانوں کی تجویز پیش کی، مگر میں بضد رہا۔ اس نے بار بار کہا: ''یہ آپ کو پسند آئے گی۔'' مگر مجھے صرف چپس اور کافی پسند آ چکے تھے۔ سوراج، شاہینہ اور جیا نے اپنی اپنی پسند کی اشیا کا آرڈر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی شے گوشت کی بنی ہوئی نہیں تھی۔ میں مزے سے چپس کھاتا رہا۔ شاہینہ تھوڑا سا کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی پلیٹ مجھے صاف کرنا پڑی۔ کھانا ایسا تھا کہ کسی نے بھی مذمتی گفتگو شروع نہ کی۔ آخری آئیٹم کافی تھا۔ یہ کافی مقدار میں تھی اور ٹھیک تھی۔ ہم لوگ کافی پی کر باہر آ گئے اور اسٹیشن کی طرف چلنے لگے۔

راستے میں ہمارے دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ ایک جگہ کیمبرج یونیورسٹی کی بک شاپ تھی۔ میرا ارادہ تھا کتابیں دیکھ لیں، مگر کسی نے ہامی نہ بھری۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ ہم ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرتے واپسی کا سفر کر رہے تھے۔

سوراج کہتا ہے: ''میں نے آپ کو صرف قدیم کالج دکھائے ہیں۔ نئے کالج دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

میں سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہوں اور پوچھتا ہوں: ''وہ کیوں؟''

وہ بتاتا ہے: ''یہاں بہت سے کالج ہیں جو دو دو تین تین سو سال پہلے قائم ہوئے تھے۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں۔''

میں پھر سوال کرتا ہوں، ایسا کیوں ہے۔ وہ جواب دیتا ہے: ''ان کی بلڈنگ ایسے ہی ہے جیسے کسی امریکن یونیورسٹی کا کوئی کیمپس۔''

امریکن یونیورسٹیوں کے لیے یہ تحقیر دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔

ہم تھکے ماندے چلے جا رہے ہیں۔ ایک جگہ ایک قدیم چرچ آتا ہے۔ ہم اسے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ یہ کیتھولک چرچ ہے۔ اس کی قدامت کے باعث اس کا ''اورا'' کافی مرعوب کن بھی ہے متاثر کن بھی۔ ہم کچھ دیر اُسے دیکھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ کیتھولک چرچ ہے، مگر اینگلکن چرچ کی طرح بے آباد ہے۔ آس پاس کوئی شخص نہیں۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر سوراج ہمیں بوٹینکل گارڈن دکھانے کا کہتا ہے۔ ہم دور سے گارڈن کو دیکھتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ گلگشت کی جائے، مگر ہمارے جسم تھک چکے ہیں۔ ہم سوراج کو اجازت دیتے ہیں اور خود اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ ایک چوک میں ایک مجسمہ ہے۔ یہ فوجی ہے جنگ عظیم کا فوجی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی یادیں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ ہر کالج میں ہر راستے پر کہیں کوئی عظیم جنگ کا فوجی لاٹھی سے اپنا سامان لٹکائے اور لاٹھی کاندھے پہ دھرے نظر آتا ہے۔ کہیں

ان کی یادگاریں ہیں۔اور کہیں صرف ان کے نام رقم ہیں۔عظیم جنگیں ان کے حافظے سے پیوست ہوکر رہ گئی ہیں۔

ہم اسٹیشن پر آتے ہیں۔ایک نوجوان کو اس کی گرل فرینڈ اسے الوداع کہنے آئی ہے۔وہ اسے پیار کرنے میں مگن ہے۔آج کے دن میں یہ پہلا بالمشافہہ پیار ہے۔کیمبرج میں ایک تو لڑکیاں ذرا کم نظر آتی ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہیں۔

ہم گاڑی میں بیٹھے ہیں۔میں سامنے پڑی میز پر Cambridge Times کا مفت میں اٹھایا ہوا پرچہ پھیلا کر پڑھنے لگتا ہوں۔ایک خبر پڑھتا ہوں:

Somebody is going to die here, warns trader

نیچے خبریں ہیں،طلبہ و طالبات کی خبریں جو تیز رفتاری سے سائیکل چلاتے ہیں اور حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔شہر کے لوگ طلبہ سے نالاں ہیں۔ٹاؤنی لوگ گاؤنی نوجوانوں کا شکوہ کرتے ہیں۔میں حیران ہوتا ہوں۔پھر سوچتا ہوں۔کیمبرج کے طلبہ بھی نوجوان ہیں اور وہی کچھ کرتے ہیں جو نوجوان کرتے ہیں۔

Cambridge News میں پڑھنے کو بہت کچھ ہے۔ایک مضمون ایک سابقہ ملاح کے مشاہدات پر مشتمل ہے۔اس میں بہت سے واقعات ہیں جو مزاحیہ ہیں،مگر ان کا ترجمہ کیجیے تو یہ مزاحیہ نہیں رہتے۔کچھ واقعات ایسے ہیں جو انگلش معاشرے میں عام ہیں،ویسے تو یہ ہمارے معاشرے میں بھی ہو سکتے ہیں،مگر یہ بیان نہیں کیے جاتے۔اس میں بعض واقعات ایسے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ انگلینڈ میں بھی سارے لوگ عقل مند نہیں ہوتے۔اسی لیے تو اس سے بعض لوگ پوچھتے ہیں:''تم کس کالج میں پڑھتے ہو۔'' وہ اگر کسی کالج میں پڑھ رہا ہوتا تو ملاح کیوں بنتا۔ملاح سے اکثر پوچھا جاتا ہے:''تمہارا پول بہت بڑا ہے۔'' اس پر لڑکیاں دوپٹے میں منہ چھپا کر کھی کھی نہیں کرتیں۔کھل کر ہنستی ہیں۔وہ بیچارہ اس سے کیا لطف اٹھا سکتا ہے۔

ملاح بتاتا ہے کہ وہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی باہمی مناقشت کے بارے میں ہمیشہ لاتعلق رہا ہے۔جب کبھی آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبہ کا کشتی رانی کا مقابلہ ہوتا ہے تو وہ غیر جانبدار رہتا ہے۔وہ اگرچہ اپنے شہر سے محبت رکھتا ہے، مگر وہ ٹاؤنی ہے گاؤنی نہیں ہے۔وہ کہتا ہے:"I am a Townie, not a gownie"

میں خود ہی ملاح کے مشاہدات سے لطف لیتا ہوں اور اخبار لپیٹ لیتا ہوں۔

گاڑی میں زیادہ رش نہیں ہے۔شام کو بہت کم لوگ چھوٹے شہر سے بڑے شہر جاتے ہیں۔دوسری لائن کی گاڑیوں میں خاصا رش ہے۔وہ بڑے شہر سے آ رہی ہے۔کچھ دیر میں ہم لوگ لیور پول سٹریٹ کے اسٹیشن پر اتر رہے ہیں۔ہم ''لینا'' کا انتظار کرتے ہیں اور انتظار کے ساتھ ساتھ اسٹیشن کی رونق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔اب ہم لینا کے ساتھ

ٹیوب اسٹیشن پر جاتے ہیں اور بارکنگ جا پہنچتے ہیں۔ بارکنگ میں اسٹیشن کے باہر کبابش ہمارا راستہ روکتا ہے۔ یہاں لاہور سے آئے لوگ لاہوری کھابے تیار کیے بیٹھے ہیں۔ میں یہاں غلطی سے دو بنگالیوں کو پاکستانی سمجھ کر بات کرتا ہوں اور منہ کی کھاتا ہوں۔ دکاندار مزے سے اردو پنجابی زبان میں پنجابی کھانے بیچ رہے ہیں۔ دو دن بعد عید ہے۔ میں ان سے مسجد کا پتا دریافت کرتا ہوں۔ وہ بڑی محبت اور تفصیل سے راستہ بناتے ہیں۔ ہم ایک بس پر بیٹھ کر ''لینا'' کے فلیٹ میں پہنچ جاتے اور لاہوری کھانا کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ فلیٹ سے باہر لندن آباد ہے۔

اشفاق احمد ورک

مخبور الحواس

جسامت ایسی کہ پوری طرح دیکھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ذرا غصے سے دیکھ لیں تو نظر ہی نہیں آتے، لیکن جب بولنے، لکھنے پہ آتے ہیں تو باون گزے بن جاتے ہیں۔ ان کے بچے اکثر شکوہ کرتے ہیں کہ ساری دنیا کے ابّے کبھی نہ کبھی بڑے ہو جاتے ہیں، آپ خلوصِ دل سے ارادہ کیوں نہیں کرتے؟ ان کے جسم کی کیمسٹری کچھ ایسے انداز سے مرتب کی گئی ہے کہ ان کی دوسری مثال ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے، سوچتے سوچتے بندہ تنگ آ کے کہہ اٹھتا ہے کہ: اپنی مثال آپ ہیں۔

ایک دن سکول وین دروازے پہ عین اسی وقت آ کے رکی، جب یہ اپنا بیگ اٹھا کے کالج جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ویگن کنڈیکٹر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اٹھا کے ویگن میں دھر لیا۔ یہ حضرت چالیس سال کی عمر میں بھی پانچویں جماعت کی کوایجوکیشن میں کنڈیکٹر کی بھول چُوک کے مزے لوٹتے رہے۔ بھانڈا تو اس وقت پھوٹا جب بریک میں بستے سے لنچ بکس کی جگہ منٹو کا کلیات اور نیاز فتح پوری کی 'شہوانیات' برآمد ہوئیں۔

سیلف میڈ آدمی ہیں، ماضی قدیم کے مؤرخ کا بیان ہے کہ یہ حضرت کسی زمانے میں جیسے تیسے، گرتے پڑتے میٹرک کر کے واہ کینٹ فیکٹری میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ آج بھی واہ کینٹ کا اس قدر آہ بھر کے ذکر کرتے ہیں کہ وہ واہ کینٹ بھی ہمیں شاہ کینٹ لگنے لگتا ہے۔ اصل مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب انھوں نے کلرک بادشاہ بننے اور ڈبل روٹی کھا کر خوشی سے پھول جانے کی سعادت سے مستفید ہونے سے یکسر انکار کر دیا، بلکہ نہایت غیر کلرکانہ حرکت کرتے ہوئے اپنا تعلق کتاب جیسی غیر منافع بخش چیز سے جوڑ لیا۔ کتاب کی محبت اور مطالعے کی حِدّت نے انھیں کہیں کا نہ رہنے دیا۔ کلرکی کے میدان سے بھاگے تو فوڈ انسپیکٹری منھ کھولے کھڑی تھی۔ حکیم جی فرماتے ہیں کہ فوڈ والوں نے تو انھیں یہ دیکھ کے بھرتی کر لیا کہ زیادہ سے زیادہ کتنا کھا لے گا؟ پھر حالات نے بھی ثابت کیا کہ یہ فوڈ کے نہیں موڈ کے آدمی ہیں۔ چنانچہ کالج یونیورسٹی کے امتحانوں میں چہل قدمی کرتے کرتے لیکچرشپ کے کوچے میں جا داخل ہوئے، اور پھر وہیں سے پی ایچ۔ڈی کی سیندھ لگا کر آج یونی ورسٹی کے چبوترے پہ تحقیق و تدریس کی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔

ان کا تعلیمی سفر تو زندگی بھر کچھوے کی رفتار سے جاری رہا، لیکن اس احساسِ کمتری کو دور کرنے اور ماضی کے ازالے کے پیشِ نظر انھوں نے بچوں کو خرگوش کی رفتار سے پڑھانا شروع کیا۔ پندرہ بیس سالوں ہی میں یہ حال ہو گیا ہے کہ اب اپنے پورے گھر میں سب سے زیادہ ان پڑھ یہ خود ہیں۔

جہاں تک عمر کا معاملہ ہے تو بیس سے ستر کے درمیان کہیں بھی آسانی کے ساتھ فِٹ ہو سکتے ہیں۔ جب بھی کوئی نئی حکومت آتی ہے' انجمنِ تحفظِ حقوقِ اطفال' سے ساز باز کر کے عمر کے دس سال معاف کروا لیتے ہیں۔ ایک دو بار جلد جلد

حکومتیں تبدیل ہوئیں تو مائنس ایج میں چلے گئے، پھر کئی سال کے انتظار کے بعد عمرِ عزیز کے آغاز کی نوبت آئی۔ ہمارے ایک عددی محقق لالہ بسمل کا بیان ہے کہ اگر ان کی مصدقہ عمر دریافت کرنا مقصود ہو تو ان کی مبیّنہ عمر میں جملہ پاکستانی حکومتوں کے دس دس سال جمع کرنے سے اصل حقائق تک پہنچ جانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔

ان کے سر کی طرف دھیان چلا جائے تو قیاس ساتھ چھوڑ جاتا ہے، سمجھ نہیں آتی کہ یہاں کب سے بے بال و پری کا عالم ہے۔ شمال مغربی علاقہ جات کے بعض عینی شاہدین کا بیان ہے کہ اس جسمانی ہیولے پر بچپن سے پچپن کے درمیان کچھ برس بالوں اور دانتوں والے بھی گزرے ہیں۔ یہ بھی ان کی ہمت ہے کہ انھوں نے مختلف زمانوں میں سر سے گرتے بالوں کو ڈاڑھی پر روک لیا ہے، حالانکہ یہ ڈاڑھی بھی اپنے آثار و قرائن سے بڑھی ہوئی شیو کی بڑی بہن لگتی ہے۔ جب سے ایف سی کالج میں ورود ہوا ہے، نہ جانے کس خوش فہمی میں موصوف کئی بار وہاں کے معروف ہیئر ڈریسر نصیر مرحوم (سابق صدر پرویز مشرف کے زمانۂ طالب علمی کا ہیئر ڈریسر) کے آس پاس منڈلاتے دیکھے گئے۔ اگر سر کے بال اور نائی کی نظر تھوڑی سی بھی یاوری کرتی تو یہ حضرت آج پرویز مشرف کے ہم زلف ہوتے۔

پھر جہاں تک حضرت کے منھ کا تعلق ہے، گزری سردیوں تک اس میں دانتوں کے کچھ آثارِ قدیمہ باقی تھے۔ منھ میں جیسے تیسے ڈھائی پونے تین دانت تھے، اس پہ بھی پوری خلقِ خدا کو سائل دینے پر تُلے رہتے تھے۔ دانت بھی ایسے تھے جو سردی سے کم اور مرضی سے زیادہ بجتے تھے۔ حضرت نے انھیں اتنی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ چبانے دبانے کے علاوہ دنیا کا ہر کام کر گزرتے تھے۔ کھانے پینے کے معاملات سے تو یہ محض تجربے کے زور پر نمٹ لیا کرتے تھے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ اپنے مغموم و موہوم دانتوں سے وہی کام لیتے تھے جو آج تک امریکہ بہادر ہمارے حکمرانوں سے لیتا چلا آیا ہے۔ یعنی اپنے اصل فرائض اور اعمالِ مفادِ عامہ سے ہر ممکن گریز۔ اس عرصے میں زبان اور دانت اپنی اپنی حدود کا تعیّن کس طرح کر پاتے ہوں گے، ڈینٹسری کے علما اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ البتہ ہمیں اتنا یاد ہے کہ پچھلی گرمیوں میں چھٹیاں گزارنے کے دوران یہ کالج آئے تو

ان کے منھ میں ہُو کا عالم تھا، پوپلے کلّے میں اکیلی زبان کسی مارشل لا ایڈمنسٹیٹر کی طرح دندناتی پھرتی تھی۔ آس پاس کے لوگوں نے دانتوں سے بے اعتنائی کا یہ عالم دیکھا تو ان سب کے چہروں پہ دانت اُگ آئے۔ پھر ان کی زبان بھلا کون روکتا؟ چنانچہ طرح طرح کے تبصرے ہوئے: کسی کو ''نہ منھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت'' کا محاورہ یاد آیا، کسی نے کہا: اچھا ہے ہر طرح کی دانتا کِل کِل سے بچے۔ کسی نے ٹوتھ پیسٹ اور برش وغیرہ کی بچت پر روشنی ڈالی لیکن سچ پوچھیں ہمیں تو ان کو دیکھ کے زبان اور دانتوں کی لڑائی کا وہ لطیفہ شِدت سے یاد آیا، جس میں دانت اپنی برتری Show کرنے کے لیے ایک دن زبان کو نہایت غیر پارلیمانی انداز میں تڑی لگاتے ہیں کہ'' تم ہر وقت بہت چڑ پڑ باتیں کرتی رہتی ہو، کسی دن ہم نے ذرا سا بھی دبا دیا تو تمھاری چیخیں نکل جائیں گی!!!''

زبان بھلا اس طرح کی دھمکی پر کب چپ رہنے والی تھی، جھٹ گویا ہوئی: ''اور اگر میں نے کہیں تھوڑی سی

بکواس کردی تو تم بتیس کے بتیس باہر پڑے نظر آؤ گے!!!''

غرض یہ کہ جتنے منھ اتنے خدشات۔۔۔اور اس سے بھی زیادہ لطیفے۔حضرت کو جب ہر ایرے غیرے کے منھ کے دانت پہلے سے زیادہ تیز دکھائی دینے لگے تو دانتوں کے کسی ڈاکٹر سے ساز باز کر کے منھ کو ایک بار پھر مصنوعی موتیوں سے بھر لیا۔یعنی ایک ڈینٹسٹ کے پیسہ ورانہ تعاون سے منھ میں بتیسی اُگ آئی۔ یہ بتیسی چونکہ پبلک اور پیٹ کی دہائی کے نتیجے میں وجود میں لائی گئی تھی،اس لیے گوشۂ تنہائی یا لمحاتِ فراغت میں یہ اکثر کسی الماری یا میز کی زینت بنی رہتی۔ایک دن خلافِ معمول کسی بچے کو آواز دے کے کہنے لگے: ذرا جلدی سے میری بتیسی تو پکڑانا!!

گھر کے بھیدی نے جھٹ دریافت کیا کہ کھانا ابھی تیار نہیں ہوا،مہمان کوئی آیا نہیں، پھر بلاوجہ بتیسی؟؟؟

فرمانے لگے: بیٹا بات دراصل یہ ہے کہ صبح سے آپ کی ماں مجھ سے ناراض ناراض پھر رہی ہے،ذرا اسے سمائل دینی ہے۔

انھیں دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپی خبروں سے ہے۔خبر چاہے سیاست کی ہو یا ادب کی،معاشرتی مسائل کی ہو یا حساس اداروں کی، ہمیشہ ان کی ناک پہ دھری رہتی ہے۔صبح کے وقت اخبار کا تو یہ محبوب سے بھی بڑھ کے انتظار کرتے ہیں۔جس روز اخبار ذرا لیٹ ہو جائے، کانٹوں پہ لوٹتے رہتے ہیں۔ایک دن اخبار والا ان کے کمرے میں اخبار پھینکنا بھول گیا تو جذبات میں آ کے اس کے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر دیا۔ٹی وی کے نیوز چینلوں کے سامنے تو ان کی حالت کسی بھوکے بچے سے مختلف نہیں ہوتی۔جس دن ٹی وی یا اخبار پہ کوئی سنسنی خیز خبر دیکھنے یا سننے کو نہ ملے،بجھ سے جاتے ہیں۔حکیم جی تو ان کی حالت دیکھ کے انھیں 'مخبور الحواس' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔معروف صحافی اور خاکہ نگار جناب ضیا ساجد نے لندن میں کسی ساحلِ سمندر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ صبح سے دوپہر تک ننگی اور گوری چمڑیاں دیکھتے دیکھتے مجھے 'نیوڈ پوائزننگ' ہو گئی۔ یہ حضرت بھی بلا ناغہ اخبار اور ٹی وی سے اس وقت تک جدا نہیں ہوتے جب تک انھیں 'نیوز پوائزننگ' نہ ہو جائے۔

آپ نے دنیا میں لوگوں کے بڑے بڑے انوکھے مشاغل سنے یا ملاحظہ کیے ہوں گے،لیکن اُن میں سے کوئی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔آپ یقیناً سن کر حیران ہوں گے کہ ان کا سب سے دل پسند مشغلہ ریٹائر ہونا ہے اور لالہ لبھل کے بقول انھوں نے یہ شوق اس وقت سے پال رکھا ہے، جب ابھی ان کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔اب تک مختلف محکموں سے بٹوری کوئی نصف درجن کے قریب ریٹائرمنٹس ان کی جیب میں ہیں۔اب تو اس ہنر میں اتنے طاق ہو چکے ہیں کہ آپ کوئی نابالغ سے نابالغ سرکاری یا غیر سرکاری ملازم ان کی سرپرستی میں دے دیجیے،اسے پلک جھپکتے میں ریٹائر کروا کے لے آئیں گے۔ان کی یہ غیر محدود حسرت اب تک کلرکی،فوڈ انسپیکٹری،(ان کا ویران حُلیہ شاہد ہے کہ یہ ایک زمانے تک ٹیکنیکل ایجوکیشن کی خاک بھی چھانتے رہے ہیں۔) پھر صُفہ کالج اور پی اے ایف کالجز کی لیکچرشپ کی معصوم گردنوں میں پنجے گاڑ چکی ہے،اور اب ایف سی کالج یونی ورسٹی کی ملازمت کو محض ایک نئی ریٹائرمنٹ کے شوق میں بھگتتے چلے جا رہے ہیں۔ایک دن میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگے: اس اگست کی اکیس کو پورے انسٹھ کا ہو جاؤں گا،اب تو

یہاں سے بھی چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ (یاد رہے اس سلسلے میں ہم نے محض ملازم کے ذاتی بیان پہ بھروسہ کیا ہے، ورنہ ملازم کے جسمانی آثار اس کی دور دور تک گواہی نہیں دیتے۔) لیکن ایک بھیدی نے بتایا کہ ان کی باتوں میں نہ آیئے گا، انھوں نے ہر جگہ اسی قسم کی سرگوشیوں سے اپنی نوخیز ملازمتوں کا گلا گھونٹا ہے۔ ان کی ریٹائرمنٹوں سے ان کی عمر کا اندازہ لگائیں تو ابنِ بطوطہ کے کلاس فیلو نکلتے ہیں۔

اتنا کھجل خراب ہونے کے باوجود نہ جانے عشق کے لیے کہاں سے وقت نکال لیا، جس کے آثار ہمیں ان کی ایک طویل نظم 'ٹیچی کیس' میں دکھائی دیتے ہیں۔ نظم کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت بس میں اپنے اکلوتے اٹیچی کیس سمیت محوِ سفر تھے، کسی محکمانہ اہل کار کی جو شامت آئی تو وہ پوچھ بیٹھا کہ: کا کا اس بکسے میں کیا ہے؟ بس نظم شروع ہوگئی۔ حضرت نے اپنے بچپن کے کھلونوں، جوانی کی حسرتوں، بیوی کے جہیز اور محبوبہ کے سامانِ مسروقہ و مخصوصہ سمیت اتنی اشیا گنوا دیں کہ اہل کار ہاتھ جوڑ کے کہنے لگا: تھوڑے سے بزرگو! جتنا سامان آپ نے اس جستی ٹیچی کیس سے برآمد کروا دیا ہے، اتنا تو پورے بنگلہ دیش ملک کے پاس نہیں ہے۔ نوید رضا نے شاید ان کی نظم پڑھ کے ہی یہ شعر کہا تھا:

؎ منتقل کرنا ہے خوابوں کو مگر کیا کیجے
اتنا سامان تو ڈھویا بھی نہیں جا سکتا

کھانے پینے میں ان کی سب سے بڑی کمزوری یا طاقت چائے ہے۔ جہاں سے مل جائے، جتنی مل جائے، جن حالات میں مل جائے یہ اس گرما گرم کپ پر خودکش حملہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ملتے ہیں۔ محلے کے بچوں کو آج بھی یہی نظم یاد کروانے میں لگے رہتے ہیں:

؎ رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری چائے بنائی

چائے سے ان کے مجنونانہ عشق کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ ان کا نام غفور شاہ قاسم سے بدل کر 'غفور چاء قاسم' رکھ دیں۔

الیکٹرانک ٹیکنالوجی میں یہ سب سے زیادہ گشتی فون کی زلفوں کے اسیر ہوئے ہیں۔ دنیا جہان سے ان کے رابطوں کا سلسلہ صبح کاذب سے لے کر شبِ جاذب تک جاری رہتا ہے۔ رات کے جو چند گھنٹے ان کی بے لوث سروس سے بچ رہتے ہیں، وہ اس منصوبہ بندی میں گزار دیتے ہیں کہ صبح کس کس کو کتنا ایزی لوڈ کروانا ہے اور کس کس کو کتنا بزی رکھنا ہے۔ حالات و واقعات گواہ ہیں کہ اس دُم کٹے آلۂ سمع خراشی کا سب سے زیادہ فائدہ ان کی اکلوتی بیگم کو ہوا ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے پائے گئے ہیں کہ ان کی بیگم نے انھیں موبائل فون کی ڈور سے باندھ کے رکھا ہوا ہے۔ کسی عزیز سے عزیز دوست کی طویل سے طویل کال اتنا اثر نہیں کرتی، جتنا مسز کی مِس کال کرتی ہے۔ چشم دید شاہدین کا بیان ہے کہ بیگم کا نام یا نمبر موبائل کی سکرین پہ ابھرنے کی دیر ہوتی ہے، ان کا پورا جسم کان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کال یا مس کال کے دوران

ہی ان کے اردگرد حیلوں بہانوں کی فصل اُگ آتی ہے۔ یہ دوستوں کے ساتھ کھانے میں مصروف ہوں، کسی دفتری میٹنگ میں ہوں، کلاس پڑھا رہے ہوں، خریداری کر رہے ہوں یا کسی ادبی سیمینار میں بیٹھے ہوں، ان کے قدومِ میمنت لزوم گھر کی جانب اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اگر کالج کا کوئی ٹرپ لے کے اسلام آباد یا مری بھی جا رہے ہوں تو سرائے عالمگیر سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اتر جائیں گے اور پھر تانگوں، ریڑھوں، رکشوں، چھکڑوں حتیٰ کہ کانٹوں پہ چلتے ہوئے پیا کے گاؤں پہنچ جائیں گے۔

ان کا دوسرا بڑا شوق بسوں ویگنوں پہ سفر کرنا ہے۔ جتنا سفر آج تک پنجاب میں انھوں نے کیا ہے، اتنا تو کسی سیاح یا ٹرانسپورٹر نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اتنا سفر انھوں نے زندگی کا نہیں کیا جتنا بسوں ویگنوں کا کیا ہے۔ اب تو یہ حال ہو چکا ہے کہ پچاس ساٹھ میل کے سفر کو محض چہل قدمی سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے نام اور کارناموں پہ کسی شہر کا نام رکھنا پڑ جائے تو وہ یقیناً 'حُجرہ شاہ متحرک' ہوگا۔

ان کے اصل کارنامے یہ ہیں کہ یہ سال ہا سال میانوالی میں رہنے کے باوجود نیازی ہونے سے بال بال بچ گئے۔ سادات گھرانے میں آنکھ کھولنے کے باوجود روایتی سید بننے سے محفوظ رہے۔ (آپ جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرتی حالات میں کسی شاہ کا وہابی ہو جانا معجزے سے کم نہیں۔) یہ کلرکی کی دلدل میں دندناتے ہوئے داخل ہوئے اور کھنکھناتے ہوئے باہر نکل آئے۔ بچپن سے پچپن تک میانوالی میں رہے، اور اس کے بعد اپنی میاں والی کو اٹھا کر لاہور لے آئے۔

سادات فیملی سے تعلق ہے، سنا ہے ان کے جدِّ امجد افغانستان سے پتنگ پہ بیٹھ کے آئے اور میانوالی میں بوکاٹا ہوئے تھے، اسی بنا پر 'پتنگ شاہ' کے نام سے معروف ہوئے۔ پھر بقیہ آباؤ اجداد بھی مبینہ طور پر اچھے خاصے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ مشہور ہے کہ وہ کہیں جانے کے لیے دیوار پہ بیٹھ جاتے تو ان کے حکم اور دہشت سے وہ دیوار چلنے لگتی تھی، جہاں جی چاہتا پٹرول اور سی این جی کا کشٹ کاٹے بغیر پہنچ جاتے۔ یہ حضرت پڑھ لکھ کے وہابی ہو گئے، نتیجۃً آج بسوں ویگنوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ اس سب کے باوجود سادات کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ سڑک پہ شہ زور ٹرک بھی نظر آ جائے تو اسے ہاتھ اٹھا کے سلام کرتے ہیں، کہتے ہیں ٹرکوں کا سید جا رہا ہے۔ تصوف سے ان کا صرف اسی قدر تعلق ہے کہ یہ گھر میں پراٹھوں کے لیے صوفی گھی استعمال کرتے ہیں۔ ملک میں علم و ادب کا مستقبل دیکھتے ہوئے، کبھی کبھی آخری عمر میں پیشۂ آبا کی طرف لوٹنے کا عندیہ بھی ظاہر کرتے ہیں، فرماتے ہیں: بزرگوں کی طرح کوئی اچھا معجزہ نگار میسر آ گیا تو بقیہ زندگی سکون سے گزر جائے گی۔۔۔۔ لیکن پھر یہ سوچ کے ارادہ بدل لیتے ہیں کہ اس پیشے سے ریٹائرمنٹ کی لذّت کیسے کشید کر سکیں گے؟

☆

عِصمت درانی

ابراہیم قُلی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے ابو، ملک سلطان علی کا تبادلہ بطور ایس ۔ایچ ۔او ریلوے ،قصور شہر میں ہوا۔اس مکان کی دھندلی، مدھم اور دل آویز یادیں آج بھی دل کی پسندیدہ مکین ہیں۔ مجھے قصور تھانے کے وسیع و عریض احاطے میں واقع اپنا سرکاری کوارٹر، پھول دار پودے، جامن کے درخت، کوارٹر کی عقبی سمت موسمی سبزیوں کے کھیت ،اور تھانے کے عین وسط میں پورے استحقاق سے سر اٹھائے عمر کھائے پیپل و برگد، سب کچھ بہت بھایا۔اگر کچھ نہ بھایا تو وہ ابراہیم تھا۔لیکن ابو کو جانے اس کی کون سی ادا اس قدر بھا گئی کہ انھوں نے اسے اپنے معتمدین میں شامل کیا۔ابراہیم سے ان کی ملاقات یہیں قصور میں ہی ہوئی تھی۔لیکن اس مختصر عرصہ میں ہی اس نے اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ ابو نے اپنے بچوں کی دیکھ بھال جیسی اہم ذمہ داری بھی اس کے سپرد کر دی۔

مجھے وہ شام آج بھی یاد ہے جب ابو نے پہلی مرتبہ مجھے ابراہیم سے ملوایا۔وہ بُلھے شاہ کے اسی شہر کا باسی تھا اور ریلوے میں بطور قلی ملازم تھا۔درمیانے قد، سیاہی مائل رنگت، قلیوں والے مخصوص سرخ شلوکے اور پگڑی میں ملبوس، ٹھیٹھ پنجابی بولنے والا ابراہیم، جو تقریباً چالیس پینتالیس برس کے پیٹے میں تھا، جانے کیوں پہلی نظر میں ہی مجھے پسند نہ آیا ۔اور جب ابو نے یہ کہا کہ مجھے ابراہیم چاچا کی ہر بات ماننی ہے تو گویا اس ناپسندیدگی پر پکی مہر ثبت ہو گئی۔میرے دونوں بڑے بھائی: عمران اور توقیر، بہت جلد اس سے مانوس ہو گئے اور اس کا دم بھرنے لگے،لیکن میں اپنی جلد مانوس نہ ہونے والی عادت کے مطابق بہت مدت تک فاصلے پر ہی رہی۔ان دنوں ابراہیم نامی ایک درزی کا بھی تھانے میں آنا جانا رہتا تھا، جو ریلوے کا ملازم تھا اور وہیں بیٹھ کر ملازمین کی وردیاں سیتا تھا۔لہذا اسے ابراہیم قلی کے نام سے پکارا جانے لگا۔قلی کا یہ لفظ اس کے نام کے ساتھ یوں جڑا کہ نام کا حصہ بن گیا۔میں نے ہمیشہ اسے ابراہیم کہہ کر ہی مخاطب کیا اور اس کے لیے دل میں جمے خواہ مخواہ کے بیر کے باعث ابو کی لاکھ کوشش کے باوجود کبھی اسے چاچا کہنا گوارا نہ کیا۔

ان دنوں مخلوط تعلیم کا رواج نہ تھا۔میرے دونوں بھائیوں کا داخلہ قصور شہر کے سکول میں ہوا اور ان کے آنے جانے کے لیے تانگہ لگوا دیا گیا۔وہ دو عدد سپاہیوں کی معیت میں مزے سے تانگے پر بیٹھ کر جاتے ۔میرا داخلہ جس سکول میں ہوا، وہ گھر کے قریب ہی تھا۔لہذا مجھے سکول لے جانے اور واپس لانے کے لیے ابراہیم کا انتخاب ہوا۔تانگے جیسی پسندیدہ سواری سے محرومی کا دکھ ہی کیا کم تھا، کہ ابراہیم بھی مجھ پر مسلط کر دیا گیا۔اکلوتی بہن ہونے کے باعث مجھے ہر وہ کام کرنا ہوتا تھا جو میرے بھائی کرتے تھے۔ان کے ساتھ ہر کھیل میں زبردستی شریک ہوتی ، کیونکہ مجھے شریک نہ کرنے کی

صورت میں میری شکایت پر انھیں ابو کی ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب ان کی خوب بن آئی، سوانھوں نے بھی مجھے جی بھر کر چڑایا۔ پہلے دن ہی وہ ابراہیم کو تمسخر آمیز اور مجھے فاتحانہ نظروں سے دیکھتے سکول گئے اور میں منہ بسورتی ابراہیم پر غصہ اتارتی سکول کو روانہ ہوئی۔ لڑکیوں کا یہ سرکاری پرائمری سکول، موضع رسول پور میں واقع تھا جو گھر سے تقریباً دس پندرہ منٹ پیدل کے فاصلے پر تھا۔ ابراہیم نے مجھے بتایا کہ سکول کو دو راستے جاتے ہیں۔ ایک باغ سے اور دوسرا سڑک سے۔ پہلے دن ہم سڑک کے راستے سے گئے، لیکن واپسی باغ سے ہوئی۔ امرودوں سے لدے درختوں والا یہ سرسبز لہلہاتا باغ مجھے بہت پسند آیا، اور تانگے سے محرومی کے دکھ میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ گھر پہنچنے تک میں ابراہیم کو فیصلہ سنا چکی تھی کہ ہم روزانہ اسی راستے سے سکول آیا جایا کریں گے۔

ابراہیم علی الصبح ہی گھر کے باہر آ کر بیٹھ جاتا۔ میں جیسے ہی سکول کے لیے تیار ہو کر باہر آتی، وہ میرا بستہ اور کھانے کی پوٹلی اٹھاتا اور ہم روانہ ہو جاتے۔ ہر روز ابراہیم کا پہلا سوال ہوتا: ''دسو باؤ جی! چھڑک تھانی سکولے جانا وایا باگے تھانی ؟'' (بتاؤ باؤ جی! سڑک کے راستے سے سکول جانا ہے یا باغ کے راستے سے؟) ''اور میں روز اسی تکرار پر جھنجھلا کر گویا نیم چبایا جواب اسی کے لہجے میں دیتی: ''باگے تھانی''۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے اپنا یہ نیا سکول بھی پسند نہ آیا تھا۔ لاہور میں اپنا گڑھی شاہو والا دو منزلہ سکول رہ رہ کر یاد آتا، جہاں میں سفید فراک پر سنہری بکل والی سرخ بیلٹ لگائے بالوں میں سرخ ربن باندھ کر جاتی اور ڈیسک پر بیٹھ کر انگریزی قاعدہ پڑھتی تھی، جبکہ یہاں دیہاتی ماحول، سرکاری سکول کی بوسیدہ عمارت، نیلی قمیض سفید شلوار والی روایتی وردی اور ٹاٹ نشینی۔ لیکن قصور تھانے کے عقب میں واقع یہ سرسبز لہلہاتا باغ گویا میرے ہر درد کا درمان ثابت ہوا۔ تھانہ بہت وسیع و عریض تھا، اور وہاں بھی جامن اور امرود جیسے پھل دار درختوں کی بہتات تھی۔ ابو نے اپنے ذوق کے باعث وہاں ڈھیر سارے پھول دار پودے لگوائے اور سنگی بنچ بھی رکھوائے۔ اس کے باوجود ہر شام میرا دل باغ کی سیر کو ہمکتا، جسے ابراہیم کم ہی خاطر میں لاتا۔ البتہ میری دل داری کو گھر میں لگے جامن اور امرود توڑتا اور دھو کر رکابی میں رکھ کر پیش کرتا، جنھیں میں درخور اعتنا نہ جانتی۔

اسی باغ کے وسط میں ایک ٹیوب ویل بھی تھا جس کا بہتا پانی مجھے مسحور کر دیتا۔ میری خواہش ہوتی کہ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر یہ نظارہ دیکھوں لیکن ابراہیم ہمیشہ سکول سے دیر ہونے کا کہہ کر ٹال جاتا۔ یہی فرمائش واپسی پر دہراتی تو پھر کہتا: ''نہ میرے باؤ! دیر ہون ڈئی اے، ملک ہوریں ناراض ہون دے'' (نہ میرے باؤ! دیر ہو رہی ہے، ملک صاحب ناراض ہوں گے)۔ درختوں سے لٹکتے میٹھے گدرائے امرود الگ اپنی جانب مائل کرتے جنھیں کھانے کو کم اور توڑنے کو زیادہ دل مچلتا، لیکن ابراہیم میری یہ فرمائش بھی ملک ہوریں کی ناراضگی کا ڈراوا دے کر رد کر دیتا اور کہتا: ''ملک ہوریں دا آڈر نئی اے باؤ (ملک صاحب کا حکم نہیں ہے باؤ)۔ باغ کے بیچوں بیچ بنی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر جہاز کے پروں کی طرح دونوں بازو

سیدھے کر کے پنجوں کے بل چلنا میرا مرغوب مشغلہ تھا۔ابراہیم کی خواہش ہوتی کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سیدھے راستے پر چلے، جو میں نے بھی کبھی پوری نہ ہونے دی،اوراس کے''سٹ وج جائے دی''(چوٹ لگ جائے گی) کے واویلے کے باوجوداسی کے لہجے میں''وجنے دؤ''(لگنے دو) کہتے ہوئے اپنا شغل جاری رکھتی۔

ابراہیم ،ابو کی ہدایت کے مطابق سکول کے باہر بیٹھا رہتا اور چھٹی ہونے کے بعد مجھے لے کر ہی گھر واپس آتا۔اسی کی دہائی کی ابتدا تھی اور دیہات کا سکول۔آدھی چھٹی کی گھنٹی بجتی تو کچھ لڑکیاں کھانا کھانے اپنے گھروں کا رخ کرتیں۔بعض باہر کھیتوں میں جا کر''چبڑ'' تلاش کرتیں اور مزے لے لے کر کھاتیں۔میرا دل بھی باہر جانے اور چبڑ کھانے کو مچلتا،لیکن ابراہیم گھنٹی کی آواز سنتے ہی اندر آ کر میرا''لنچ بکس''،یعنی رومال میں بندھا پراٹھا،سٹیل کے چھوٹے سے ٹفن میں رکھا آملیٹ یا کوئی سالن،اور پانی کا گلاس بھر کر میرے سامنے رکھ جاتا۔ایک روز میں نے اپنی ہم جماعت لڑکی،جس کا نام شاید طاہرہ تھا،کو روکھی تندوری روٹی پر سرخ مرچ کی چٹنی رکھے کھاتے دیکھا۔میرے لیے یہ کھانا نیا تھا،چکھنے پر ذائقے نے بھی دل لبھایا۔چنانچہ میں اکثر اس سے اپنا کھانا تبدیل کرنے لگی۔لیکن یہ سلسلہ چندروز ہی چل پایا۔جونہی ابراہیم کو خبر ہوئی،وہ مجھے اپنے سامنے کھانا کھلانے لگا۔سکول کے ساتھ ہی دکانوں پر لڈو پیٹھیاں اور برف کے رنگ برنگے گولے بکتے،جو کھانے کی شدید خواہش رہی۔لیکن میری یہ خواہشیں باہر بیٹھے ابراہیم نے:''ناں میرے بیبے باؤ! ڈھڈ پیڑ کرے دا''(نہ میرے اچھے باؤ،پیٹ میں درد ہوگا) کہہ کر کبھی پوری نہ ہونے دیں۔یہ سب باتیں اس کے لیے میری ناپسندیدگی میں مزید اضافہ کا سبب بنیں۔

ابراہیم کی ایک اور عادت جو میری دانست میں ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی تھی،اس کی بسیار گوئی تھی۔جونہی ہم گھر سے نکلتے ابراہیم کی باتیں شروع ہو جاتیں جو عموماً پند ونصائح،چھوٹے چھوٹے اصلاحی واخلاقی واقعات اور قصے کہانیوں پر مشتمل ہوتیں۔مجھ خاموش طبع اور نازوں پلی بچی کی برداشت بہت جلد جواب دے جاتی اور درمیان میں ہی ٹوک کر اسے خاموش ہونے کو کہہ دیتی۔وہ فوراً ہی خاموش تو ہو جاتا لیکن کچھ دیر بعد پھر گنگنانا شروع کر دیتا:

قدر نبی دا ایہہ کی جانن دنیا دار کمینے
قدر نبی دا جانن والے سوں گئے وچ مدینے
قدر پھلاں دا بلبل جانے ،صاف دماغاں والی
قدر پھلاں دا گرج کی جانے مردے کھاون والی

اور:

لے او یار حوالے رب دے ، اے میلے چار دناں دے

اس دن عید مبارک ہوسی جس دن فیر ملاں گے

''دنیا دار کمینے'' اور ''لے او یار حوالے رب دے'' پر گویا اس کی سوئی اٹک جاتی اور بار بار کسی جذب کے عالم میں دہراتا جاتا۔ میں ناگواری سے ناک چڑھا کر قدرے بدتمیزی سے پھر ٹوکتی۔ وہ کچھ دیر کو ہی خاموش ہوتا، اور پھر گنگنانے لگتا:

سدا نہ باغیں بلبل بولے ، سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ ماں پے حسن جوانی ، سدا نہ صحبت یاراں

اور:

وقت جوانی عیش جہانی پنج ست روز عمر دے
ایویں دُکھاں وچ لنگھاے ، رو رو آہیں بھردے

کبھی میری ناراحتی بھانپ کر مجھے خوش کرنے کے لیے کہتا۔ ''باؤ! لپّے آتی سناواں؟'' (باؤ! لب پہ آتی ہے (دعا بن کے تمنا میری) سناؤں؟)۔ میں تلملا اٹھتی: ''نہیں سننی مجھے تمہاری ''لپّے آتی''، خبردار جواب کچھ بولے''۔ پھر باقی کا راستہ وہ خاموشی سے طے کرتا اور میں خوشی سے۔

ابو ہر شام حسب معمول دن بھر کی روداد سنتے تو میرے پاس ابراہیم کے خلاف شکایات کی ایک لمبی فہرست سنانے کو ہوتی۔ جس میں سرفہرست شکایت یہ ہوتی کہ ابراہیم بولتا بہت ہے، ''گانے'' گاتا ہے، اور ''گالیاں'' بھی دیتا ہے (دنیادار کمینے)۔ توقع ہوتی کہ گانے اور گالیوں جیسے سخت ناپسندیدہ افعال پر ابراہیم کی باز پرس اور سرزنش ہوگی اور خوب لطف رہے گا۔ لیکن میری حیرت اور مایوسی کی انتہا نہ رہتی جب ابو زیر لب مسکراتے اور ابراہیم کو بلوا کر اس کے وہی ''گالیوں والے گانے'' کرسی سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نہایت شوق سے سنتے۔ ہم تینوں بہن بھائی اقبال سے تو واقف تھے، لیکن انھی دنوں ابو نے ہمیں بابا بُلھے شاہ، میاں محمد بخش اور سیف الملوک سے بھی آسان الفاظ میں متعارف کروایا اور ان کے چند اشعار بھی سنائے، جو میں نے محض ابراہیم کی پرخاش میں نہایت ''دل جمعی'' سے ان سنے کیے۔ میری حیرت سوا ہو جاتی، جب بھیرہ سے آئے ہمارے بابا جی (دادا جان) بھی ابراہیم سے یہ گانے خصوصی فرمائش پر سنتے۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتا ''وڈے ملک ہوریں'' کی چارپائی کی پائنتی پر جا بیٹھتا۔ رات گئے تک گلوکاری کی یہ محفل جاری رہتی، جس میں بابا جی کے حقے کی گڑگڑاہٹ موسیقی کا کام دیتی اور گلوکار اپنے فن کے مظاہرے کے ساتھ ساتھ سامع کی ٹانگیں اور پاؤں دباتا رہتا اور وقفے میں حقہ بھی تازہ کر لاتا۔

ابراہیم کا ساتھ صرف سکول تک ہی محدود نہ تھا۔ ہم جونہی گھر سے نکل کر تھانے کی طرف آتے، اس کی چوکیداری شروع ہو جاتی۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کاظم کو گود میں اٹھائے ہمارے ساتھ ساتھ رہتا۔ خاص دھیان رکھتا کہ

ہم ابو کے دفتر یا حوالات کا رخ نہ کریں، درختوں پر نہ چڑھیں، آپس میں نہ لڑیں اور تھانے سے باہر نہ نکل جائیں۔ دونوں بڑے بھائی مجھے اپنے ساتھ کھلانے سے انکار کر دیتے تو وہ میرے کھیل کا ساتھی بھی بن جاتا اور میرے ساتھ سٹاپو کھیلتا۔ بھائیوں کے خلاف میری آئے روز کی شکایتوں پر ابو نے میرے لیے الگ لڈو اور کیرم بورڈ منگوادیا۔ اب میں ابراہیم کے ساتھ لڈو کھیلتی، اس شرط پر کہ وہ نہ تو میری کوئی گوٹ مارے گا اور نہ ہی کبھی مجھ سے جیتے گا۔ لیکن میری لاکھ خواہش اور کوشش کے باوجود اسے کیرم بورڈ کھیلنا نہ آیا، جس پر میں نے اسے سخت سست سنائیں اور بھرپور ناراضگی کا اظہار کیا۔ مجھے تھانے کے سامنے سے گذرتی ریل گاڑیاں دیکھنا بہت پسند تھا۔ اس وقت میری تصوراتی دنیا آباد ہو جاتی اور میں ریل گاڑی سے اترے اپنے خیالی مہمانوں کا استقبال کرتی۔ بالکل امی کے لہجے میں ان کی احوال پرسی کرتی اور بہت سی اور باتیں بھی۔ یہ تمام مکالمے با آواز بلند ہوتے۔ ابراہیم میرے منع کرنے کے باوجود یہاں کھڑا ان باتوں پر مسکراتا رہتا، اور میں اس کی ڈھٹائی پر خوب تاؤ کھاتی۔ بابا کمال چشتی کا مزار ہمارے لیے ایک ''تفریحی مقام'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ مٹی کے ایک اونچے ٹیلے پر واقع وہ مزار ان دنوں گھاس پھونس کے چھپرے تلے بنی ایک قبر پر مشتمل تھا، جس کی سو سے زیادہ کچی سیڑھیاں ہمارے لیے نہایت ہی جاذب تھیں (اب یہ مزار پختہ ہو چکا ہے اور ان سیڑھیوں پر سنگ مرمر لگا دیا گیا ہے)۔ ہم اکثر وہاں جانے کی فرمائش کرتے۔ ابراہیم ہی ہمیں لے کر جاتا۔ ہم سیڑھیاں چڑھنے کا مقابلہ کرتے۔ میں پہلے ہی نہایت دھونس سے ابراہیم سے طے کر لیتی کہ یہ مقابلہ بھی وہ مجھ سے ہارے گا۔ کبھی کبھی ابو، ابراہیم کی معیت میں ہمیں بابا بُلھے شاہ کے مزار کی زیارت کو بھی بھجواتے۔ ہم تانگے کی سیر اور ارد گرد کے نظاروں سے تو خوب لطف اندوز ہوتے، لیکن ان مقامات کے تقدس سے نا آشنا تھے۔ ابراہیم ہر جگہ پاسبان عقل بن کر ہمارے ساتھ ہوتا۔ اسی نے ہمیں زیارت کے آداب بتائے۔ وہ ہمیں فاتحہ پڑھنا سکھاتا اور دعا مانگنے کو کہتا۔ میں نے ہر ایسے موقع پر چپکے چپکے ابراہیم کے مرنے کی دعا ہی مانگی۔

قصور میں ہی ہم تینوں نے اپنی زندگی کا پہلا روزہ رکھا اور پہلی نماز بھی یہیں ادا کی۔ ابو ہمیں تھانے کے احاطے میں بنی مسجد میں لے جاتے اور اپنے ساتھ نماز پڑھواتے۔ انھوں نے نماز پنج گانہ کا عادی بنانے کے لیے اعلان کیا کہ جو بچہ پانچ نمازیں پڑھے گا، اسے روز ایک روپیہ انعام ملا کرے گا۔ ان کی غیر موجودگی میں نماز پڑھوانے اور اس حساب کتاب کی ذمہ داری ابراہیم کے سپرد تھی، جس نے کبھی ڈنڈی نہ مارنے دی اور نماز کے اوقات پر ہمیں ہانک کر مسجد لے جاتا۔ کبھی کبھی ہم سب مل کر مسجد کی صفائی بھی کرتے۔ جھاڑو پھیرتے اور مٹی کے لوٹوں میں پانی بھر کر رکھتے۔ عشا کی نماز کے بعد ابراہیم کی رپورٹ پر ہی یہ انعام تقسیم ہوتا۔ جس دن مسجد کی صفائی کرتے، اس روز ہمیں آٹھ آنے اضافی ملتے۔ لیکن نماز نہ پڑھنے، یا ادھوری چھوڑ کر گھر بھاگ آنے پر چار آنے فی نماز کٹ جاتے۔ یہ وہ واحد معاملہ تھا جہاں وہ آنکھیں ماتھے

پر رکھ لیتا اور کبھی میری دھونس میں نہ آتا۔

ایک مرتبہ ابراہیم کو چند دنوں کے لیے کسی دوسرے شہر جانا پڑا۔ متبادل کے طور پر شامی نام کا ایک اور قلی اس کی ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے آیا۔ ابراہیم کے ہمہ وقت تسلط سے رہائی پر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اور شامی کی خاموش طبعی نے اس خوشی کو گویا چار کی بجائے آٹھ چاند لگا دیے۔ وہ میرا بستہ اٹھائے خاموشی سے چلتا رہتا۔ نہ گانے نہ باتیں نہ نصیحتیں۔ جہاں میں کہتی رک جاؤ، فوراً رک جاتا۔ جہاں کہتی بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاتا، بالکل کسی روبوٹ کی مانند۔ ان دو دنوں میں، میں نے جی بھر باغ کی سیر کا لطف لیا۔ وہ امرود توڑنے سے منع کرتا نہ پگڈنڈیوں پر چلنے سے۔ اپنا کھانا شامی کو بطور رشوت دے کر ہم جماعتوں کے ساتھ کھیتوں میں جا کر چپڑ بھی کھائے اور برف کے گولے بھی۔ شامی کی خاموشی سے حوصلہ بڑھا تو ایک روز طاہرہ کی گڑیا دیکھنے اس کے گھر بھی چلی گئی۔ دل کے ارمان پورے کرتے ابھی دو روز ہی گذرے تھے کہ ایک شام، شامی کی لاپرواہی کے سبب تو قیر بھائی امرود کے درخت پر چڑھنے کی کوشش میں نیچے گر کر زخمی ہو گئے۔ اسی روز ہی جانے کیسے میری ان ''سرگرمیوں'' کی خبر بھی ابو کو ہو گئی۔ انھوں نے اسی وقت شامی کو رخصت کیا اور ابراہیم کو ہنگامی بنیادوں پر واپس بلوا لیا۔ میری ہر نماز میں ابراہیم کے کبھی واپس نہ آنے کی نہایت خشوع و خضوع سے مانگی دعائیں شرف قبولیت نہ پا سکیں اور وہ میری خوشیوں کا غارت گر بن کر دو روز بعد ہی لوٹ آیا۔

۱۹۸۱ء میں ابو کا تبادلہ لاہور ہو گیا اور ہم قصور کی حسین یادیں دل میں سمیٹے پھر سے ریلوے کالونی کے جامن والے گھر میں آ بسے۔ ابو، ابراہیم کو بھی اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے اور اپنے کوارٹر کے عقب میں موجود خالی جگہ پر ایک چھوٹا سا کمرہ اس کے لیے تعمیر کروا دیا۔ اب میرا داخلہ بوگی روڈ پر واقع پاکستان ریلویز لیڈی گریفن سکول میں ہوا جو گھر سے دس منٹ کے پیدل فاصلے پر تھا۔ اکثر اوقات ابو مجھے خود سکول چھوڑنے جاتے۔ لیکن واپسی پر ابراہیم ہی لینے آتا اور یہ سفر حسب معمول اس کی باتوں اور گنگناہٹوں میں طے ہوتا۔ ابو نے سکول کے باہر پولیس کے دو سپاہی مستقل تعینات کر دیے، لہٰذا وہ اب سکول کے باہر نہیں بیٹھتا تھا۔ لیکن یہاں نہ کھیت تھے نہ چپڑ ڈھونڈ کے کھانے والی ہم جماعت لڑکیاں، نہ ہی لڈو پیٹھیاں اور برف کے گولے کی کوئی دکان، کہ ابراہیم کی غیر موجودگی مجھے خوش کرتی۔ دوپہر کو تفریح کے مقررہ گھنٹے میں آ کر ٹفن میں رکھا تازہ اور گرم کھانا ضرور دے جاتا، جو آیا کے توسط سے مجھ تک پہنچا دیا جاتا۔

ابراہیم کے ذمہ اب گھر کے باہر بیٹھنا اور ہمارا، یعنی بچوں کا خیال رکھنا تھا۔ وہ علی الصبح ہی دروازے پر کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا۔ دوپہر کو مجھے سکول سے واپس لانے کے بعد پھر سے اپنی نشست گنگناتے ہوئے سنبھال لیتا۔ گھر کا سودا سلف لانا ایک اور ملازم کی ذمہ داری تھا۔ ابراہیم صرف ہمارے لیے مخصوص تھا۔ ہمیں کوئی چیز درکار ہوتی تو قریبی دکان سے لا دیتا، ابو کو کوئی پیغام پہنچانا ہوتا یا ان کے پاس جانا ہوتا تو وہاں بھی لے جاتا۔ مولوی صاحب اور ماسٹر جی پڑھانے آتے تو

بیٹھک میں ہمارے ساتھ ہی موجود رہتا۔ کبھی کبھار ابو کی اجازت سے سٹیشن پر سیلون والے پلیٹ فارم کے ساتھ موجود بڑی مسجد کے حوض میں موجود رنگ برنگی مچھلیاں دکھانے بھی لے جاتا۔ گرمیوں میں دروازے پر ہی چارپائی بچھا کر لیٹ رہتا اور ہولے ہولے ''گنگناتا'' رہتا۔ اب چونکہ اس کی روک ٹوک میں کمی آ گئی تھی تو میری اس سے کچھ کچھ دوستی ہو چلی تھی۔ دسمبر ۱۹۸۱ء کے اواخر میں میرا چوتھا بھائی احسن لاہور کے اسی گھر میں پیدا ہوا۔ مجھے چونکہ بہن کی شدید آرزو تھی، لہٰذا میں اس غیر مطلوب اور ان چاہے بھائی کی پیدائش پر پھوٹ پھوٹ کر، بلکہ دھاڑیں مار مار کر روئی۔ یہی وہ موقع تھا، جب فیروز سنز سے میری پہلی آشنائی ہوئی، کیونکہ ابو نے اس ''جرم'' کی پاداش میں مجھے آنکھیں کھولنے بند کرنے والی من پسند گڑیا تو دلائی ہی، لیکن میری تنہائی کے مداوا کی غرض سے لاہور سٹیشن پر واقع فیروز سنز کے سٹال سے کہانیوں کی بہت سی کتابیں بھی دلائیں۔۔ ''دکھ'' کے اس موقع پر میرے آنسو پونچھنے والوں میں ابراہیم بھی شامل تھا، جس نے میرے مرغوب قصوری اندرسے لانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اب کے وہ قصور گیا تو واپسی پر امی کے لیے دیسی گھی اور میرے لیے اندرسے لایا، جنھیں دیکھ کر میرا رہا سہا غم بھی دور ہو گیا۔ میری خوشی دیکھ کر اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ جب بھی قصور جائے گا، اندرسے ضرور لایا کرے گا۔

لاہور ریلوے سٹیشن کی عقبی سمت واقع بڑی سی یہ ریلوے کالونی مجھے بالکل پسند نہ تھی کہ یہاں کوئی باغ نہیں تھا، نہ قصور جیسا سبزہ، اور نہ ہی ریل گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ تھا نہ، یعنی ابو کا دفتر بھی کالونی سے قدرے فاصلے پر ریلوے سٹیشن پر تھا۔ کالونی کے دیگر بچوں سے راہ و رسم بڑھانے کی کبھی اجازت ملی، نہ ہی کسی کے گھر جانے کی۔ سو ابراہیم ہی میرا ''سنگِ صبور'' بن گیا۔ میں اپنے سارے دکھ سکھ، از قسم: ابراہیم! میری کوئی بہن کیوں نہیں ہے؟، ابراہیم! میری کوئی سہیلی ہی نہیں ہے، ابراہیم! امی نے ڈانٹا ہے، ابراہیم! بھائی مجھے اپنے ساتھ نہیں کھلا رہے، وغیرہ اسی سے کہتی۔ وہ مجھے بہلاتا، میری دل جوئی کرتا۔ میرے کھیل کا ساتھی تو وہ تھا ہی، اب میری بہن اور سہیلی بھی بن گیا۔ میری گڑیا کی شادی میں، جس میں صرف میں اور ابراہیم ہی شریک ہوتے، گیت بھی گاتا:

بیلی بیلی سب جگ آکھے ، تے میں وی آکھاں بیلی
اس دن دا کوئی نئ جے بیلی ، جدوں نکلے جان اکیلی

میں اپنی عزیز گڑیا کی شادی پر ایسے بول سن کر متوقع بدشگونی کے خیال سے ہولا کر فوراً ہی اعتراض جڑ دیتی: ''ابراہیم! شادیوں پر ایسے گانے تھوڑی گاتے ہیں؟ اچھے اچھے گانے گاؤ نا، جیسے ماموں کی شادی پر خالہ نے گائے تھے۔'' تب میری خوشنودی کی خاطر وہ خود ساختہ پٹّے اور گیت سناتا اور میں اپنی گڑیا کے محفوظ مستقبل سے مطمئن ہو کر تالیاں بجاتی۔

۱۸ اپریل ۱۹۸۲ء کو ایک ٹریفک حادثے میں ابو کی اچانک وفات ہو گئی۔ ان کی تدفین ان کے آبائی شہر بھیرہ

میں ہونا تھی۔ ابراہیم ان دنوں قصور گیا ہوا تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ لپکتے جھپکتے بھیرہ پہنچا، لیکن اس وقت تک تدفین ہو چکی تھی۔ عمران بھائی نے بعد میں بتایا کہ وہ بہت دیر تک قبر پر بیٹھا روتا رہا اور گاتا رہا۔ ابراہیم کو ہمیشہ یہ قلق رہا کہ وہ اپنے ملک ہوریں کا آخری دیدار نہ کر سکا۔ اس سانحہ نے سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ امی نے کئی مرتبہ ابراہیم سے قصور لوٹ جانے کو کہا لیکن وہ نظریں جھکائے ہاتھ باندھے کھڑا ہو جاتا، اور اس کی آنکھیں چھم چھم نیر بہانے لگتیں۔ مجھے سمجھ نہ آتی کہ اپنے گھر جانے پر تو خوش ہوا جاتا ہے، یہ روتا کیوں ہے؟

ابراہیم کو نہ واپس جانا تھا، نہ گیا۔ اپنی ذمہ داریاں بدستور نبھاتا رہا۔ اب اس کی بسیار گوئی کم سخنی میں بدل چکی تھی۔ دن بھر خاموش، لیکن ہوشیار و مستعد گھر کے باہر بیٹھا رہتا۔ بڑے بھائیوں کو اپنی نگرانی میں سکول کے لیے تانگے پر سوار کرواتا۔ کاظم کو سنبھالتا، جو ابھی ڈھائی سال کا تھا۔ احسن، جو ابو کی وفات کے وقت محض ساڑھے تین ماہ کا تھا، کی رونے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچتی تو بے قرار ہو اٹھتا۔ گھنٹوں اسے گود میں لیے بیٹھا رہتا۔ کبھی ہم میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی بے چینی سوا ہوتی۔ نہایت دلسوزی سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا: ''یا میرے مولا! میرے یاراں دی تنگی دور کر چھڈ، میرا جی گھسدا پیا اے'' (یا میرے مولا! میرے پیاروں کی پریشانی دور کر دے، میرا دل ڈوب رہا ہے)۔ دروازے پر ہی بیٹھا رہتا کہ مبادا اس کی ضرورت پڑ جائے۔ رات دیر گئے کمرے میں سونے جاتا، اور صبح تڑکے ہی باہر آ کر اپنی نشست سنبھال لیتا۔ اس نے ہمیں یہ کہہ رکھا تھا کہ رات کو کسی بھی وقت کوئی کام ہو تو اس کے کمرے کے دیوار (جو ہمارے سونے کے کمرے سے متصل تھی) فوراً کھٹکھٹا دی جائے۔ وقتاً فوقتاً مجھ سے اور میرے بھائیوں سے پوچھتا رہتا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں یا ہمارا کچھ خاص کھانے کو دل تو نہیں چاہ رہا۔ صبح جب مجھے سکول چھوڑنے جاتا تو نہایت فکر مندی سے مجھ سے پوچھتا کہ میری کوئی کاپی، کتاب، پنسل، ربڑ کوئی چیز کم تو نہیں ہے؟ اب اس نے قصور جانا بھی بہت کم کر دیا۔ وہ جو ہر ہفتے قصور جانے کو بے تاب رہتا تھا، اب مہینے دو مہینے بعد جاتا بھی تو جلد ہی لوٹ آتا۔

خوب شکل محبوب اجیہا ، مشکل تروڑن یاری
سو سو واری راہ اوہدے تے بہتر ہے جند واری

میرے اور ابراہیم کے کشیدہ تعلقات تو پہلے ہی بہتر ہو چکے تھے، اب ہمارا موضوع گفتگو بھی مشترک ہو گیا۔ یعنی میرے ''ابو'' اور اس کے ''ملک ہوریں''۔ ہر شام ابراہیم کی چارپائی پر بیٹھ کر ہم ان کی باتیں کرتے اور ساتھ بیٹھ کر آنسو بہاتے۔ میں روتی تو ابراہیم فوراً کہتا: ''ناں ناں میرے باؤ، رونا نئی'' (نہ نہ میرے باؤ، رونا نہیں)۔ مجھے تو چپ کروا دیتا، لیکن خود روتا جاتا اور گاتا رہتا۔ اس کی سوئی پھر سے اٹک جاتی:

دکھیے دی گل دکھیے ہی جانن ، سکھیے نوں کی خبراں

سجن جنہاں دے موت نے مارے او روندے تک تک قبراں

کچھ مدت بعد ہم بہاول پور منتقل ہو گئے تو وہ واپس اپنے گھر قصور چلا گیا۔لیکن جب تک زندہ رہا، اپنے محدود وسائل کے باوجود قصوری اندرسوں کی سوغات لیے گاہے گاہے ملنے آتا رہا۔وہ یہاں ایک رات ضرور قیام کرتا اور اس کی خواہش ہوتی کہ اسے کوئی کام بتایا جائے یا کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے۔رات کو ہم پانچوں بہن بھائی اس کے گرد جمع ہو جاتے۔اس کا پسندیدہ موضوع ''ملک ہورین'' ہی ہوتا۔انھی کی باتیں یاد کرتا، آنسو بہاتا اور عمران بھائی کی فرمائش پر گانا بھی سناتا:

عیداں تے شبراتاں آسن روحاں جاسن گھر نوں
تیری روح محمد بخشا تکسی کیہڑے در نوں

ابراہیم اپنی ابدی سفر کو روانہ ہوا اتو اس کے بہاول پور کے اسفار بھی اختتام کو پہنچے۔جب کبھی وہ اندر سے یاد آئے، دنیا کی قیمتی ترین سوغات لگے۔کبھی آنکھوں میں آنسو آئے تو ایک ٹھیٹھ پنجابی آواز سماعتوں میں گونج اٹھی: ''ناں ناں میرے پیے باؤ، رونا نئی''۔زندگی نے کئی رنگ بدلے، روپ دھارے، اور تیور دکھائے. ابراہیم کے ان'' گانوں'' کی حقیقت آشکار ہوئی جو کبھی نالاں کرتے تھے، لیکن اب آنکھیں نم کرتے ہیں، اور ابراہیم کی طرح میری بھی سوئی اٹک جاتی ہے:

سدا نہ صحبت یاراں؛
میلے چار دناں دے؛
دنیا دار کمینے، دنیادار کمینے۔

☆☆☆

عامر رضا

دلِ بینا

[ریڈیو ڈراما]

کردار:

ساجد	:	دسویں جماعت کا طالبِ علم۔
رزاق	:	ساجد کا دوست اس کا ہم عمر۔
عبداللہ	:	(کمانڈر) پچیس سال۔
امی	:	ساجد کی والدہ عمر چالیس سال۔
ابو	:	ساجد کا باپ عمر پینتالیس سال۔
ریاض	:	ساجد کا ساتھی۔
اناونسر	اور	ایک یا دو ایکسٹرا آوازیں۔

[منظر:۱]

وقت	:	صبح	لوکیشن	:	ساجد کا گھر
کردار	:	ساجد، امی اور ابو	صوتی اثرات	:	(SFX)

[چڑیوں کے چہچہانے کی آواز سے فیڈ ان ہوتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ٹریفک کا شور کی ہلکی سی آڈیو فیڈ ان کرتے ہیں اور تھوڑی بعد واش بیس کی ٹوٹی سے پانی چلنے اور منہ دھونے کی آواز کے ساتھ فیڈ آوٹ کرتے ہیں۔ برتنوں کے کھنکنے کی آواز کے ساتھ روٹی بنانے کی آواز سنائی دیتی ہے]

ابو: ابھی تک میرا ناشتہ نہیں بنا۔دفتر سے پھر لیٹ ہو جاؤں گا اور یہ تمھارا لاڈلا کیوں نہیں اٹھا اب تک، اس نے سکول نہیں جانا (آواز تھوڑی اونچی ہے کیوں کہ وہ ڈائنگ روم میں کھڑا ہے اور بیوی کچن میں ہے، لہجے میں بے چینی اور تھوڑا غصہ نمایاں ہے جیسے دفتر سے واقعی لیٹ ہو رہا ہے۔)

امی: کیوں شور مچا رہے ہیں، لا رہی ہوں۔(لہجے میں ہلکی سی جھنجلاہٹ کا تاثر ہے۔)

ابو: ارے بھلی لوگ! کوئی اچار وغیرہ بھی دے دو۔اسے کیا ایسے ہی کھاؤں گا، چائے پراٹھا کا مزہ تو اچار کے ساتھ آتا ہے۔ (منہ میں اچار کا چٹخارہ لیتے ہوئے)

امی: اُف!! آپ تو جھنجھلا دیتے ہیں، وہ بھی لاتی ہے۔

ابو: اور تمھارا لاڈلا کیوں نہیں اٹھا ابھی تک، میں سکول نہیں ڈراپ کروں گا؟ پیدل جائے گا؟ (تھوڑا اونچا بولتے ہوئے جیسے بیوی دوسرے کمرے میں گئی ہے اس کو سُنانے کی کوشش کر رہا ہے۔)

امی: آپ ناشتہ کریں، میں اٹھاتی ہوں اُسے۔ (ٹیبل پر اچار کی بوتل رکھنے کی آواز آتی ہے۔)

ابو: اچھا ٹھیک ہے (کرسی گھسیٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔ امی کے جانے کی آواز آتی ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے۔)

امی: (ہلکا سا میوزک چند ثانیے کے لیے فیڈ ان ہو کر فیڈ آوٹ ہوتا ہے۔ ماں ایک آہ بھرتے ہوئے جیسے اُسے کمرے کی حالات پر افسوس ہوا ہے۔) پتا نہیں اس لڑکے کا کیا بنے گا؟ یہ کمرہ ہے یا کباڑ خانہ۔ جہاں دیکھو کتابیں اور کپڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ پتا نہیں یہ کب سدھرے گا؟ (تھوڑی اونچی آواز کے ساتھ بولتی ہے جس بیٹے کو جھنجوڑنے کا تاثر بھی شامل ہے۔) ۔۔ساجد۔۔ساجد۔۔سکول نہیں جانا۔ سات بج رہے ہیں۔ تمھارے ابو تیار ہو گئے ہیں۔

ساجد: (نیند کی خمار آلود آواز میں) آں۔۔۔اوں اُٹھتا ہوں امی! کیا ہے؟

امی: کیا ہے نہیں اُٹھ جاؤ، وہ چلے جائیں گے۔

ساجد: (بے نیازانہ ادا کے ساتھ) جانے دیں میں چلا جاؤں گا۔

امی: (پیار بھرے لہجے میں کہتی ہے۔) اُٹھ جا بیٹا، اُٹھ جا۔

ابو: (صحن سے آواز دیتا ہے۔) میں جا رہا ہوں اُسے کہنا کہ اب خود ہی سکول چلا جائے۔

امی: اچھا جی (آواز ہلکی سی اونچی ہوتی ہے)

(sfx: موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آتی ہے۔)

امی: اب خود ہی جانا۔

ساجد: اچھا امی۔

امی: تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ بناتی ہوں۔

(میوزک انٹرول کے ساتھ کٹ کرتے ہیں۔)

[منظر:۲]

لوکیشن : آوٹ ڈور کردار : ساجد۔۔رزاق

SFX: ٹریفک کا شور ان ہوتا ہے، فیڈ ہوتا ہے۔ ٹریفک کا شور ہلکا ہلکا بیک گراونڈ میں موجود رہے گا۔

رزاق: ساجد! ساجد! ساجد!(SFX: دور سے آواز دیتے ہوئے۔ساجد کے پیچھے بھاگتا ہوا آتا ہے۔)

ساجد: کیا ہوا کہاں سے بھاگا آرہا ہے؟

رزاق: یار کب سے تمھیں آوازیں دے رہا ہوں۔تم سنتے ہی نہیں (SFX: سانس بحال کرتے ہوئے)

ساجد: اچھا بتا کیا ہے؟

رزاق: کل میں نے تمھیں بتایا تھا، ایک دوست آرہا ہے اس سے ملنے جانا ہے۔

ساجد: ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن سکول کے بعد نہ چلے جائیں۔

رزاق: سکول کے بعد نہیں ابھی چلتے ہیں، پھر وہ چلا جائے گا۔

ساجد: لیکن گھر والوں کو پتا چل گیا تو (لہجے میں ڈرا اور فکرمندی ہے۔)

رزاق: کون بتائے گا؟

ساجد: ۔۔۔لیکن۔۔۔۔

رزاق: تو کوئی بہانہ بنا دینا، چل میرے ساتھ۔

(sfx: خاموشی کا پاز جس کے دوران میں ٹریفک کی آواز آتی رہی ہے)

رزاق: کیا سوچ رہا ہے چل بھی نا۔

ساجد: (گہرا سانس لیتے ہوئے) اچھا ٹھیک ہے لیکن جائیں گے کیسے؟

رزاق: رکشے پہ جائیں گے اور کیسے، ٹھہر جا میں روکتا ہوں۔۔۔رکشہ، رکشہ (رکشے والے کو پکارتا ہے۔)

(SFX: رکشے کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے، low لیول پر جاری رہتی ہے۔)

رزاق: چل بیٹھ۔

(SFX: رکشے کے جانے کی آواز بلند ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ ہوتی ہے)

[منظر:۳]

[کردار: ساجد۔۔رزاق۔۔عبداللہ (لہجہ تھوڑا سا سرائیکی ہوگا۔)

(SFX: دراز ے پہ دستک کی آواز آتی ہے۔دو سے تین بار۔)

عبداللہ: آتا ہوں، آتا ہوں، صبر کرو۔(دروازہ کھلنے کی آواز)

رزاق: السلام علیکم عبداللہ بھائی!

عبداللہ: وعلیکم السلام۔اتنی دیر کیوں لگا دی، یہ کون ہے؟

رزاق: عبداللہ بھائی! دوست ہے اپنا آپ سے ملوانا تھا۔

ساجد: السلام علیکم۔

عبداللہ: وعلیکم السلام۔ اندر آجاؤ۔

(SFX: دروازہ بند کرنے کی آواز آتی ہے)

رزاق: بیٹھو

ساجد: اچھا

عبداللہ: تم میری بات سُنو ادھر آؤ۔

(SFX: ایک اور کمرے کا دروازہ کُھلنے کی آواز آتی ہے۔)

عبداللہ: (سرگوشی کے انداز میں) یہ کس کو ساتھ لائے ہو۔

زراق: دوست ہے اسی کا تو میں بتا رہا تھا، اتنے دنوں سے اس کے ساتھ تو بات چل رہی تھی۔ (وہ بھی سرگوشی میں جواب دیتا ہے۔)

عبداللہ: دیکھ لینا کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

رزاق: نہیں عبداللہ بھائی کافی وقت لگا چکا ہوں، اس پر۔

عبداللہ: ٹھیک ہے، یہ کھانے پینے کا سامان اُٹھالو۔

(SFX: شاپروں اور پیکٹس کی آواز۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

عبداللہ: کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر رہے تھے۔

ساجد: کیوں تکلف کر رہے ہیں۔

رزاق: اس میں تکلف کیا ہے؟

عبداللہ: تو پڑھائی کے علاوہ کیا کرتا ہے، تمھارا دوست۔

رزاق: کرکٹ کا شوق ہے اسے۔

عبداللہ: اوئے ہوئے توبہ توبہ!! بس یہی خرابی ہے، آج کے نوجوانوں میں کوئی اچھا اور نیک کام کرتے نہیں ہیں۔

ساجد: نہیں میں نماز بھی پڑھتا ہوں پانچ وقت کی۔ (فوری طور پر کہتا ہے جیسے درستی کر رہا ہو۔)

عبداللہ: میرے بھائی صرف نماز کافی نہیں ہے اور پھر تمھیں کیا پتا کہ تمھاری نماز بھی قبول ہوتی ہے کہ نہیں؟

ساجد: کیا مطلب؟

عبداللہ: دین کا راستہ بڑا مشکل ہے، اتنا آسان نہیں ہے۔

رزاق: اسی لیے تو میں اسے یہاں لایا ہوں کہ آپ اسے سمجھائیں۔

عبداللہ: ٹھیک ہے میں تمھیں کچھ کتابیں دیتا ہوں، یہ پڑھنا پھر تمھیں پتا چلے گا۔ کتابیں پڑھو گے؟

ساجد: ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔

عبداللہ: ٹھیک ہے لیکن کسی کو دکھانا نہیں ہے اور نہ کسی کو بتانا ہے۔ (رازداری سے کہتا ہے۔)

(الماری یا ٹرنک کھلنے کی آواز)

عبداللہ: یہ لو کتابیں، یہ تمھیں بتائیں گی کہ اچھا مسلمان کیسے بننا ہے؟

ساجد: شکریہ۔

رزاق: ٹھیک ہے اب ہم چلتے ہیں۔

(میوزک سے ایک ٹائم لیپس لیتے ہیں)

[منظر:۴]

[کردار: ساجد اور امی]

(SFX: دروازہ پہ دستک کی آواز)

ساجد: کون ہے؟ دروازہ کھلا ہے۔

امی: یہ آج کل کہاں غائب رہتے ہو؟

ساجد: (گھبرائی ہوئی آواز میں کتابیں چھپانے کا تأثر دیتے ہوئے) ک۔ کہیں۔ نہیں۔

امی: یہ کیا چھپا رہا ہے؟

ساجد: کچھ نہیں کتابیں ہیں۔

امی: کس طرح کی کتابیں ہیں یہ۔ دکھا، دکھا۔

ساجد: امی! نہیں۔۔ نہیں۔

امی: دکھا چل دکھا۔

ساجد: یہ لیں۔

(کتابوں کے ورق الٹنے کی آواز کا وقفہ)

امی: یہ کس طرح کی کتابیں پڑھ رہا ہے؟ (لہجے میں تشویش کا عنصر شامل ہے۔)

ساجد: ایک اچھا انسان بننے کی۔

امی: لیکن یہ تو اچھا انسان بنانے والی نہیں ہیں۔ کس نے دیں تمھیں یہ کتابیں۔

ساجد: وہ ایک دوست۔

امی: خبردار! اگر آئندہ سے تم کسی بھی ایسے دوست سے ملے، سمجھے۔ تمھارا ابا بڑی مشکل سے کماتا ہے تاکہ تمھارے سکول کی فیس ادا ہوتی رہے اور تم کورس کی کتابیں پڑھنے کے بجائے یہ پڑھ رہے ہو۔ خبردار! اگر تم آئندہ کسی بھی ایسے دوست سے ملے۔

ساجد: اچھا نہیں ملتا۔ (قدرے ڈرے ہوئے لہجے میں۔)

[منظر:۵]

کردار۔۔امی۔۔ابو

صوتی اثرات

موٹر سائیکل کے رکنے کی آواز آتی ہے دروازہ کھلتا ہے

امی: آج کچھ زیادہ دیر نہیں لگا دی؟

ابو: ہاں تمھارے صاحبزادے کے استاد مل گئے تھے (آواز میں تھوڑی تھکاوٹ ہے)۔۔کہاں ہے وہ؟

امی: ابھی کھانا کھا کے سو گیا ہے۔ کیوں کیا ہوا ہے؟

ابو: حد کر دی ہے اس نے لڑکے نے وہ بتا رہے تھے کہ کئی دنوں سے سکول نہیں آیا۔

امی: کیا مطلب وہ تو روز جاتا ہے (تشویش بھرے لہجے)

ابو: نہیں جاتا اس لیے تو انھوں نے کہا۔۔روز لیٹ اٹھتا ہے میں کام پہ نکل جاتا ہوں اور یہ سکول سے بھاگ جاتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے تو اسے پڑھا رہا ہوں (غصے میں کہتا ہے)

امی: (تشویش سے بھرپور لہجہ)۔ اچھا بھلا تھا پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟

ابو: اسے اُٹھاؤ میں اس سے ابھی بات کروں گا۔ (غصے میں کہتا ہے)

امی: (ڈرے ہوئے لہجے میں) میں تو کہتی ہوں ابھی آپ بھی تھک ہوئے آئے ہیں صبح بات کر لیں گے۔

ابو: میں کہتا ہوں کہ اٹھاؤ اسے۔

امی: (منت سماجت سے) خدا کے لیے صبح بات کر لیں ابھی چھوڑ دیں رات کت وقت لوگوں کو سنائیں گے کیا

ابو: ٹھیک ہے لیکن صبح اس کی خبر لے کر ہی کام پہ جاؤں گا۔

[منظر:٦]

کردار۔۔ساجد۔ابو۔۔امی

SFX: چڑیوں کے چہچہانے کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے۔

ابو: اٹھا نہیں تمھارا لاڈلا ابھی۔آج پھر اس کا سکول سے بھاگنے کا ارادہ ہوگا۔

امی: اُٹھ گیا ہے۔بچہ ہے ذرا نرمی سے سمجھا دیں۔

ساجد: السلامُ علیکم ابو جی!

ابو: وعلیکم السلام، یہ آج کل جناب ہوتے کہاں ہیں؟

ساجد: کیا مطلب؟

ابو: سکول کیوں نہیں جاتے رات تمھارا استاد ملا تھا اس نے بتایا کہ کئی دنوں سے جناب سکول ہی نہیں گئے۔

ساجد: ابو!! وہ۔۔میں

ابو: کیا وہ میں لگا رکھی ہے جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔

ساجد: میں نے اب اس سکول نہیں جانا۔(ڈرے اور سہمے ہو لہجے میں)

ابو: کیا بکواس کر رہے ہو سکول کیوں نہیں جانا۔(بھرپور غصے میں کہتا ہے)

ساجد: وہ ہمیں کافروں کی تعلیم دے رہے ہیں۔

ابو: کیا کیا کہا۔۔سُن رہی ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔

امی: ساجد کیا بکواس کر رہے ہو۔یہ سب ان کتابوں کا نتیجہ ہے جو تم چھپ چھپ کے پڑھتے ہو۔

ابو: کتابیں کون سی کتابیں۔کیا ہو کیا رہا ہے اس گھر میں کوئی مجھے بھی بتائے گا۔

امی: پتا نہیں الٹی سیدھی کتابیں پڑھ رہا ہے ان دنوں، میں لاتی ہوں۔

ابو: کچھ بول کیوں نہیں رہے میں کیا پوچھ رہا ہوں؟

ساجد: میں نے کہا نا مجھے نہیں جانا سکول (لہجے میں تھوڑا خوف کم ہوتا ہے اور قطعیت آتی ہے۔)

امی: یہ کتابیں پڑھتا ہے۔ (تشویش ناک میوزک ساجد کا باپ کتابیں دیکھتا ہے)

ابو: یہ کہاں سے آئی کون دیتا ہے تمھیں بتاؤ (جھڑکتے ہوئے غصے میں)

ساجد: ہے میرا دوست وہ دیتا ہے مجھے۔

ابو: خبردار اگر آئندہ تم اس سے ملے یا پھر یہ کتابیں پڑھیں۔

ساجد: میں اُس سے ملوں گا بھی اور پڑھوں گا۔(اب لہجے میں کوئی خوف نہیں بلکہ مصمم ارادہ نظر آ رہا ہے)

ابو: زبان چلاتا ہے۔۔ٹھہر(غصے میں)

(مار پیٹ کرنے کی آوازیں)

امی: چھوڑ دیں جوان بچہ ہے ایسے مار پیٹ تھوڑی کرتے ہیں۔

ابو: میں کہتا ہوں تم ہٹ جاؤ آج میں اسے سیدھا کر کے چھوڑوں گا۔

امی: پیار سے بات کرتے ہیں۔میں سمجھاتی ہوں اسے۔

ساجد: میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو آپ مجھے سمجھائیں گی میں صحیح راستے پہ جا رہا ہوں۔

ابو: میں تمھیں لاتا ہوں، صحیح راستے پہ۔

دروازے تیزی سے بند ہونے کی آواز آتی ہے ابو کو کھانسی کا دورہ پڑتا ہے وہ کھانسنے لگتا ہے۔

امی: ساجد کے ابّا کیا ہو گیا آپ کو۔۔کیا ہو گیا میں پانی لاتی ہوں (کھانسنے کی آواز آتی ہے)

امی ابو کو پانی پلاتی ہے۔وہ گہرے گہرے سانس لیتا ہے۔دونوں کرداروں کی آوازیں فیڈ آوٹ کرتے ہیں۔

[منظر:۷]

کردار۔۔۔رزاق۔ساجد

(SFX: دروازے پہ تیز دستک کی آواز۔تین بار)

رزاق: آ گیا بھئی کیا ہوا۔(دروازہ کھلنے کی آواز)۔تم

ساجد: ہاں یار ابا نے مارا میں گھر سے بھاگ کے آیا ہوں۔

رزاق: کیوں انھوں نے کیوں مارا؟

ساجد: ان کو پتا چل گیا ہے کہ میں سکول نہیں جاتا اور جو کتابیں عبداللہ بھائی نے دی تھیں وہ بھی انھوں نے پکڑ لیں۔

رزاق: (تشویش سے بھرپور لہجے میں) تم نے بتایا تو نہیں کہ کس نے دی تھیں۔

ساجد: نہیں میں نے نہیں بتایا۔

رزاق: یہ اچھا کیا۔

ساجد: لیکن اب کرنا کیا ہے؟

رزاق: کچھ نہیں ابھی تم اندر آ جاؤ میں عبداللہ بھائی سے بات کرتا ہوں وہ جو کہیں گے ویسا ہی کریں گے۔

ساجد: وہ کہاں ہیں؟

رزاق: وہ تو واپس چلے گئے ہیں۔ میں ان سے فون پہ پوچھتا ہوں۔

ساجد: مجھے اب گھر واپس نہیں جانا میں تم لوگوں کے ساتھ مل کر خدمت کروں گا دین کی۔

رزاق: یہ کام اتنا آسان نہیں ہے بڑی مشکلیں ہیں اس کام میں۔

ساجد: میں اب ہر مشکل اٹھانے کو تیار ہوں۔

رزاق: اچھا پہلے تم اندر تو آؤ اس پہ بھی بات کرتے ہیں۔

دروازہ بند ہونے کی آواز۔

[منظر:۸]

کردار۔۔ابو۔۔امی

(SFX: موٹر سائیکل کھڑے رکنے کی آواز آتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے)

امی: کچھ پتا چلا؟ (تشویش بھرے لہجے میں)

ابو: (تھکے ہوئے لہجے میں) نہیں ہر جگہ دیکھ آیا ہوں کہیں کچھ پتا نہیں ہے۔

امی: ہائے اللہ پتا نہیں میرا بیٹا کہاں چلا گیا ہوگا (روہانسی آواز میں کہتی ہے) (افسردہ میوزک اور لیپ کرتے ہیں۔)

ابو: اب رونے کا کیا فائدہ پہلے مجھے بتا دیتی تو آج یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ (تھکے اور بھرے ہوئے لہجے میں)

امی: مجھے خود اسی دن پتا چلا تھا۔

ابو: پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں جو بچوں کے ذہن خراب کر رہے ہیں۔ ان کچے دماغوں کو شریعت اور مذہب کی کیا سمجھ ہے۔

امی: خدا ان لوگوں کو غارت کرے۔ (روتے ہوئے)

ابو: مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کریں۔

امی: میں تو کہتی ہوں کہ پولیس میں رپورٹ لکھوا دو۔

ابو: اب یہی کرنا پڑے گا صبح تک دیکھتے ہیں اگر نہ ملا تو پھر پولیس کو ہی رپورٹ لکھوائیں گے۔

امی: (روتے ہوئے) ہائے پتا نہیں میرا بیٹا کس حال میں ہوگا۔

ان کی آواز کو فیڈ آوٹ کرتے ہیں۔

[منظر:۹]

کردار۔۔ساجد۔۔رزاق

(SFX: ٹرین کی آواز ان ہوتی ہے سین میں ٹرین کی چلنے کی آواز بیک گراونڈ میں آتی رہے گی)

ساجد: ہم کہاں جا رہے ہیں؟

رزاق: میں تمھیں چھوڑ کے خود واپس آ جاوں گا ابھی ٹرین کے بعد بس میں سفر کرنا ہے۔

ساجد: تم واپس آ کے کیا کرو گے؟

رزاق: میں اپنی ڈیوٹی ادھر کروں گا

ساجد: تو میں آگے کیسے جاؤں گا

رزاق: ہمارے ساتھی ہیں وہ تمھیں آگے لے جائیں گے فکر کیوں کرتے ہو۔

ساجد: اچھا (لہجے میں پریشانی اور اداسی ہے)

رزاق: پریشان لگ رہے ہو؟

ساجد: میں فون کر کے گھر نہ بتا دوں۔

رزاق: نہیں نہیں ایسا نہیں کرنا ان کو پتا چل جائے گا وہ اور خفا ہوں گے۔

ساجد: اچھا ٹھیک ہے۔

رزاق: بس سفر کا نظارہ لو اور کیا۔

ٹرین کی آواز اوور لیپ ہوتی ہے۔

[منظر:۱۰]

کردار۔۔امی۔۔ابو

(SFX:امی کے رونے کی آواز ان ہوتی ہے)

ابو: کب تک ایسے روئے جاؤ گی چپ کر جاؤ (باپ کا لہجہ بتا رہا ہے کہ دکھ اور غم اسے بھی ہے)

امی: (روتے ہوئے) پتہ نہیں کس حال میں ہوگا میرا بیٹا۔اکلوتی اولاد ہے روؤں نہ تو کیا کروں؟تم کچھ کرتے کیوں نہیں۔

ابو: اور کیا کروں میں ہر جگہ دیکھ چکا ہوں رشتے داروں سے پوچھ چکا ہوں پولیس میں رپورٹ لکھوا چکا ہوں۔

امی: (روتے ہوئے) جس نے اسے کتابیں دی تھیں ان سے جا کے پوچھو۔

ابو: مجھے کیا پتا کس نے کتابیں دی تھیں۔اگر پتا ہوتا تو میں ایسا وقت آنے ہی نہ دیتا۔

امی: اب کیا ہوگا کہاں تلاش کریں اسے۔

ابو: بس یہ دعا کرو کہیں غلط لوگوں کے ساتھ نہ نکل گیا ہو۔

امی: یااللہ تو ہی ہماری مدد فرما۔

ابو: کاش مجھے پتا چل جاتا میں اسے روک لیتا۔کاش

ماں کے رونے کی آواز فیڈ آوٹ ہوتی ہے۔

[منظر:۱۱]

کردار۔۔رزاق۔عبداللہ۔۔ساجد

(SFX:اگر ممکن ہو سکے تو طالبان کے جہادی ترانے استعمال کرتے ہیں۔یا پھر بچوں کے کی نعرے لگانے کی آوازیں۔ ان کو فیڈ آوٹ کرتے ہیں۔)

رزاق:السلام علیکم،عبداللہ بھائی (گرم جوشی کے ساتھ)

عبداللہ:وعلیکم السلام۔پہنچ گئے، کیوں بھئی؟

ساجد:جی سر!

عبداللہ:سر تو کافر بولتے ہیں یہاں سر نہیں ہوتے،ہم سب بھائی ہیں،دوست ہیں۔

ساجد:جی عبداللہ بھائی (تھوڑا سا جھجکتے ہوئے)

عبداللہ:بہت کم لوگوں کو ایسا موقعہ ملتا ہے جو تم کو ملا ہے۔ایک تو تم کافر کی تعلیم سے بچ گئے ہو اور دوسرا تم نے حق کا راستہ چنا ہے۔

رزاق:میں نے اس کو سمجھایا ہے۔بس اب یہ شہادت ہی چاہتا ہے۔

عبداللہ:وہ تو ہم سب کا مقصد ہے۔ہم سب اس کے لیے ہی کوشش کر رہے ہیں۔

رزاق:یہ یہیں پہ رہے گا یا اس کو آگے بھیجیں گے؟

عبداللہ:ابھی اس کو ادھر ہی ٹریننگ دیں گے اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ اس کو فدائی بنانا ہے یا مجاہد۔

ساجد:میں اپنے گھر بات کر سکتا ہوں۔(درخواست گزارانہ لہجے میں)

عبداللہ:نہیں گھر بات کرو گے تو کمزور ہو جاو گے۔جس راستے پہ تم اب چل نکلے ہو اس میں کسی قسم کا کمزوری نہیں دکھاتے۔ تم باقی بچوں کے ساتھ بیٹھو۔رزاق تم میرے ساتھ آؤ۔

رزاق:اچھا ساجد!اللہ حافظ۔

ساجد:(ڈرتے ہوئے)اللہ حافظ

(SFX:رزاق اور عبداللہ کے قدموں کے چلنے کا ساونڈ افیکٹ)

عبداللہ: کسی کو شک تو نہیں ہوا کہ تم اسے یہاں لے کے آئے ہو۔

رزاق: نہیں عبداللہ بھائی کسی کو شک نہیں ہوا۔

عبداللہ: یہ لو پورے بیس ہزار ہیں۔ وعدے کے مطابق اور بچوں کو لاؤ تو اور پیسے ملیں گے۔

رزاق: شکریہ عبداللہ بھائی۔

عبداللہ: تم یہاں رات رکو گے؟

رزاق: میں نکلتا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔

عبداللہ: ٹھیک ہے اللہ حافظ۔

رزاق: اللہ حافظ۔

[منظر:۱۲]

کردار۔۔ساجد۔۔عبداللہ۔۔ریاض

(SFX: بچوں کے قرآن پڑھنے کی آواز ان ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر آواز چلتی ہے پھر لیول ڈاون ہوتا ہے)

عبداللہ: بس بھئی، سب لوگ خاموش ہو جاؤ۔ تم لوگوں نے یہاں ٹریننگ مکمل کر لی ہے۔ تعلیم بھی۔ اب تم لوگوں کو مزید ٹریننگ کے ایک اور کیمپ میں بھیجا جائے گا۔۔ تم میں کچھ لوگ جنت میں جائیں گے اور کچھ غازی بن جائیں گے۔ بس ایک یا دو دن کی بات اور ہے۔

ریاض: آپ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے عبداللہ بھائی؟

عبداللہ: میں اگر ساتھ جاؤں گا تو پھر اور لوگوں کو کون ٹریننگ دے گا۔ بس ایک دو دن میں تم لوگوں کے بارے حکم آ جائے گا ۔۔بس تم لوگوں اپنا سبق یاد کرو۔

(بچوں کے پڑھنے کی آواز پھر ان ہوتی ہے)

[منظر:۱۳]

کردار۔۔ساجد۔۔عبداللہ۔۔ریاض

(SFX: دروازہ کھلنے کی آواز۔ دونوں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔)

ریاض: ہمیں بلایا؟

عبداللہ: ہاں سب لوگ کل کیمپ میں چلے جائیں گے لیکن تم دونوں نہیں جاؤ گے۔

ریاض: کیوں ہم کیوں نہیں جائیں گے؟

عبداللہ: تم لوگوں کو ایک چیک پوسٹ پہ بھیجنا ہے بڑی اہم ذمہ داری ہے نگرانی کی۔

ساجد: لیکن عبداللہ بھائی ہم تو سامان باندھ چکے ہیں۔

عبداللہ: تو چیک پوسٹ بھی اوپر پہاڑوں میں ہے۔ وہاں تم لوگ اپنا سامان لے کے جاؤ گے۔

ریاض: ٹھیک ہے جیسے آپ کا حکم۔

عبداللہ: ہاں یہ لو۔

ریاض: یہ کیا ہے؟

عبداللہ: یہ ریڈیو ہے۔ اس پہ ایف ایم چلے گا۔ کمانڈر صاحب اسی ایف ایم سے خطاب کرے گا اور اسی سے تم لوگوں کو مزید تربیت ملے گا سمجھے۔ اس کو سنبھال کے رکھنا۔

ساجد: ٹھیک ہے۔

عبداللہ: اور ہاں کوئی اور ٹینشن لگانے کی کوشش نہیں کرنا سمجھے اگر پکڑے گئے تو بُرا حال ہوگا۔

ریاض: ٹھیک ہے عبداللہ بھائی۔

عبداللہ: بس اب تم دونوں جانے کی تیاری کرو۔ تم لوگوں کو اسلحہ اور بارود مل جائے گا۔

ساجد: اللہ حافظ۔

عبداللہ: اللہ حافظ۔

[منظر:۱۴]

(SFX: تیز ہوا کے چلنے کی آواز ان ہوتی ہے۔ اسی ہوا میں ساجد اور ریاض کے تاثرات ہیں جیسے وہ پہاڑ پہ چڑھ رہے ہیں ان کی سانس پھولی ہوئی ہے)

ریاض: پاؤں دھیان سے رکھنا۔ بڑا خطرناک راستہ ہے۔

ساجد: دیکھ رہا ہوں ابھی اور کتنا اوپر جانا ہے۔

ریاض: (سانس لیتے ہوئے) پتا نہیں میں بھی پہلی بار ہی جا رہا ہوں۔

ساجد: بڑی مشکل چڑھائی ہے۔

ریاض: وہ سامنے دیکھو مجھے تو لگتا ہے وہی ہے۔

ساجد: لیکن وہاں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا۔

ریاض: اگر کوئی آدمی ہوتا تو ہمیں کیوں بھیجتے۔ جو پہلے تھے وہ چلے گئے ہیں۔

ساجد: ہم وہاں سے اطلاع کیسے دیا کریں گے کہ فوج کے آدمی کیا کر رہے ہیں؟

ریاض: یہ فون تو دیا ہے انھوں نے۔

ساجد: لیکن اس کی بیٹری۔

ریاض: یہ آن ہی تب کرنا ہے جب اطلاع دینی ہے۔

ساجد: سنبھال کے۔ ہاتھ دو۔۔ (روز لگاتے ہوئے) آجاؤ!

ریاض: (گہرا سانس لیتے ہوئے) شکر ہے پہنچ تو گئے۔

ساجد: ہاں لیکن اس جھونپڑی میں چارپائی تو ایک ہی ہے۔

ریاض: ہم میں سے ایک سوئے گا اور ایک جاگے گا۔

ساجد: ٹھیک ہے۔

ریاض: ایسا کر تم تھوڑا آرام کرو میں ذرا سامان نکال کے سیٹ کر لوں۔

ساجد: ٹھیک ہے۔

میوزک کی بریک لیتے ہوئے سین ختم کرتے ہیں۔

[منظر:۱۵]

کردار۔۔ریاض۔۔ساجد۔۔کمانڈر کی آواز

(SFX: ایف ایم کی آواز ریاض چینل تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔۔ایف ایم کی خالی فریکوئنسی کا مدہم سا شور سنائی دیتا رہے گا)

ساجد: دو دن سے تمھارے سے چینل نہیں تلاش ہو رہا ادھر مجھے دو میں دیکھتا ہوں۔

ریاض: یہ ہے ہی خراب۔تو کیا کرلے گا۔

ساجد: ادھر دیکھا۔

ریاض: لے تو دیکھ لے۔

(ایف ایم کی فریکونسی بدلنے کی آوازیں آتی ہے۔ایک جگہ پہ رک جاتا ہے)

کمانڈر: اب ان دوستوں کے نام پیغام جنہوں نے تحریک کے لیے چندہ نہیں دیا۔وہ جتنی جلدی ہو اپنا اپنا چندہ پہنچا دے ورنہ جانتے ہیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔تحریک کے جو چندہ پیار سے نہیں دے گا ہم زبردستی بھی لے لے گا۔(لہجہ سواتی ہے)

شاں شاں کی آواز آنے لگتی ہے۔

ساجد: دیکھا تمھیں نہیں ملانا۔

ریاض: تو اب کیوں بند ہو گیا۔

ساجد: بس بات ختم ہو گئی ہے۔سب سے آخری میں تو چندہ ہی مانگتے ہیں۔

ریاض: اچھا۔دکھا مجھے کس نمبر پہ آیا تھا۔

ساجد: یہ دیکھ۔

ریاض: ٹھیک ہے اب میری سونے کی باری ہے تم جاؤ۔

ساجد: ٹھیک ہے جاتا ہوں۔

ریاض: یہ ریڈیو بھی لے جاو۔۔دوسرا خطاب سن لینا۔

ساجد: اچھا ٹھیک ہے۔

(SFX: پتھروں پہ چلنے کی آواز آتی ہے۔ٹھوکر لگنے اور گرنے کی آواز آتی ہے)

ساجد: اوہو۔۔یہ ریڈیو۔۔شاید ٹوٹ گیا ہے۔

(SFX: ریڈیو کے ٹیون ہونے کی آواز مختلف اسٹیشن کے ٹیون ہونے کی آواز آتی ہے۔۔اچانک نور جہاں کے گانے کی آواز آتی ہے (یہ ڈائریکٹر پہ منحصر ہے کہ وہ کونسا گانا چنتا ہے)۔

ساجد: لاحول ولاقوۃ۔۔

(SFX: ریڈیو کے ٹیون ہونے کی آواز۔ریڈیو بند کر دیتا ہے)

ساجد: مجھے لگتا ہے کہ یہ خراب ہو گیا ہے۔چلو دیکھتے ہیں

(SFX: پتھروں پہ چلنے کی آواز۔ایک ہیلی کاپٹر کی آواز فیڈ ان ہوتی ہے اور فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے)

[منظر:۱۶]

کردار۔۔ابو۔۔امی

(SFX: امی کے کھانسنے کی آواز۔مسلسل آتی ہے گلاس میں پانی ڈالنے کی آواز)

ابو: یہ لو پانی پی لو۔۔پانی

پانی پینے کی آواز۔

امی: آج کتنے ماہ ہو گئے میرے بیٹے کو گم ہوئے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا (بیمار لہجے میں تھوڑی سی کھانسی شامل رہے گی)

ابو: میں تو اب تھک گیا ہوں اسے تلاش کر کر کے۔اس کی تلاش میں تو نوکری بھی چلی گئی (لہجے میں تھکاوٹ ہے۔جسے کردار

کیری کرے گا)

امی: پتا نہیں کس حال میں ہوگا؟

ابو: کس حال میں کیا مطلب ابھی تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں۔

امی: کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔

ابو: تو اور کیا کروں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جیسے میری کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔

امی: پتہ نہیں کن ظالموں کے ہاتھ لگ گیا ہمارا بیٹا۔

ابو: اب میں کہاں کہاں بھاگوں۔تھانے کے چکر کاٹوں یا پھر روزگار کو دیکھو۔

امی: اب تو قسمت ہی اگر وہ واپس آجائے (رونے لگتی ہے)

ابو: حوصلہ کر۔ایسے رونے سے کیا فائدہ۔۔حوصلہ کرو۔

دونوں کی آواز فیڈ آوٹ ہوتی ہے۔

[منظر:۱۷]

کردار۔۔ساجد۔۔ریاض۔۔اناونسر۔ایک لڑکے کی آواز۔۔۔عبداللہ

(SFX: تیز ہوا کے چلنے کی آواز۔بادل کے گرجنے اور بارش کے برسنے کی آواز ان ہوتی ہے)

ریاض: بڑی تیز بارش ہے۔

ساجد: ہاں (لہجے میں اداسی ہے)

ریاض: اتنا اداس کیوں ہے۔

ساجد: بس ایسے ہی امی کی یاد آ گئی۔۔پتہ برسات میں مجھے پکوڑے اور چائے بنا کے دیتی تھیں۔

ریاض: ایسی کمزوری کی باتیں نہ کرو۔اب ہم جس مقصد کے لیے نکلے ہیں یہ ان کے لیے بھی ہے۔شہید کے ماں باپ بھی جنت میں جاتے ہیں۔

ساجد: کمزوری تو نہیں دکھاتا۔لیکن کیا کروں ماں کی یاد تو آ ہی جاتی ہے۔

ریاض: بارش تھوڑی کم ہو رہی ایسا کرتا ہوں میں کچھ لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتا ہوں۔تم ریڈیو چیک کر کمانڈر صاحب کے خطاب کا وقت ہے۔

ساجد: چیک کرتا ہوں ویسے گرنے سے لگتا ہے کہ خراب ہو گیا ہے۔

(SFX: ریڈیو کے ٹیون ہونے آواز۔ماں پہ کوئی گانا کسی فی میل آرٹسٹ کی آواز میں ان ہوتا ہے۔۔گانے کے دو بول

چلتے ہیں)

ساجد: لاحول ولاقوۃ (ریڈیو بند کرتا ہے۔۔خاموشی۔۔پھر ریڈیو کے آن ہونے کی آواز اور گانا چلنے لگتا ہے)

گانا ختم ہوتا ہے اور اناونسر کی آواز ان ہوتی ہے۔

اناونسر: ماں کا نرم و نازک پیار ہے ہی ایسا جسے ہر کوئی محسوس کرتا ہے۔اور جس کے ہاتھوں کی نرمی اور گرمی انسان کے اندر محبت کے لطیف جذبے کا جگاتی ہے۔آیئے آپ کو ماں کی ممتا اور پیار پر ایک اور گانا سناتے ہیں۔

گانا ان ہوتا ہے۔گانے کے تین بول چلتے ہیں۔ریاض کی آواز دُور سے آتی ہے۔

ریاض: یہ کیا کر رہے ہو؟

گانے کی آواز بند ہوتی ہے۔

ساجد: ایسے ہی غلطی سے چل گیا تھا۔ریڈیو خراب ہو گیا ہے۔

ریاض: اگر کسی اور نے سُن لیا ہوتا نا تو جان سے مار دیتا۔پتا نہیں یہ گانا بجانا حرام ہے۔اسے نہیں سنتے۔

ساجد: لیکن وہ تو صرف ماں کے بارے میں گانا تھا۔

ریاض: گانا تو تھا۔۔تم جانتے ہو ہمیں یہ ریڈیو کیوں دیا گیا ہے۔

ساجد: ہاں لیکن میں تو ایف ایم تلاش کر رہا تھا۔

ریاض: پھر بھی تم کو یہ نہیں سننا چاہیے تھا۔

ساجد: غلطی ہو گئی۔

ریاض: توبہ کرو اگر ایسا غلطی دوبارہ ہوا تو جان سے جاؤ گے۔

ساجد: ویسے اگر گانا ماں کے بارے ہو تو پھر بھی حرام ہے۔

ریاض: ہاں پھر بھی حرام ہے۔

ساجد: ٹھیک ہے۔

ریاض: تم ایسا کرو آگ جلاؤ میں نے ادھر فوج کی حرکت دیکھی ہے میں کمانڈر صاحب کو فون پہ بتا دوں۔

ساجد: ٹھیک ہے (لکڑیاں توڑنے کی آواز۔۔نوکیا فون کے آن ہونے کی آواز)

ریاض: ہیلو کمانڈر صاحب۔ہیلو۔۔ہیلو

(SFX: لکڑی کے ٹوٹنے اور آگ کے جلنے کی آواز ریاض کی آواز پہ اور لیپ ہو جاتی ہے۔چھوٹا سا میوزک گیپ دیتے ہیں۔پرندوں کے چہچہانے کی آواز ان ہوتی ہے)

ریاض: ساجد ساجد اٹھا جا اب تمھاری باری ہے میں ساری رات جاگا ہوں۔

ساجد: اوں۔۔اچھا اٹھتا ہوں۔

ریاض: سنبھل کے جانا۔

ساجد: اچھا اچھا تم سو جاؤ۔

ریاض: یہ ریڈیو کیوں اُٹھا رہے ہو؟

ساجد: تم تو سوئے ہو گے کمانڈر صاحب کا خطاب سُن لوں گا۔

ریاض: اچھا لے جاؤ۔

(SFX: ساجد کے قدموں کی آواز۔ پرندوں کے چہچہانے کی آواز۔ ہیلی کی آواز کے ساتھ مکس ہوتی ہے، آوازیں فیڈ ان ہوتی ہے۔ ریڈیو کے ٹیون ہونے کی آواز۔ مختلف چینلز کے تبدیل ہونے کی آوزیں آتی ہیں۔ پھر ایک گانے کی آواز پہلے زیادہ آڈیو لیول کے ساتھ پھر آڈیو لیول کم ہوتا ہے)۔

ساجد: کہیں ریاض کے کانوں میں پڑ گئی تو پھر لڑے گا آہستہ آواز سے ہی سُن لیتا ہوں۔

گانا ہلکی سی آواز میں چلتا ہے۔ گانے کی آواز ختم ہوتی ہے۔

اناونسر: ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں اب آپ دہشت گردی کا نشانہ بننے والے شہدا کے لواحقین کی خیالات پر مبنی پرگرام سنیں گے۔

ساجد: یہ کیا ہے (ریڈیو کے چینل تبدیل ہونے کی آواز۔ پھر ریڈیو پاکستان پہ واپس آتا ہے)

آواز: میرا نام شاہد ہے میرے ابو کا کوئی قصور نہیں تھا وہ تو نماز پڑھنے گئے تھے۔ پھر پتا نہیں کیوں ان لوگوں کے اللہ کے گھر میں دھماکہ کر دیا۔ میرے ابو سجدے کی حالت میں شہید ہوئے۔ اُن کی شہادت پہ مجھے فخر ہے۔ ایک نہیں ہم لاکھوں جانیں قربان کریں گے۔ (ریڈیو بند کرتا ہے)

ساجد: یہ کیا ہے مسجد میں دھماکہ لیکن یہ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ صرف شریعت لانے کے ایسا کر رہے۔ شریعت لانے کے لیے تو مسجد میں دھماکے نہیں کرنے پڑتے۔ کہیں میں غلط لوگوں میں تو نہیں آ گیا ہوں۔

ٹائم لیپس لیتے ہیں۔

ریاض: تم آ گئے واپس۔

ساجد: ہاں!

ریاض: کیا ہوا کچھ پریشان لگ رہے ہو؟

ساجد: یہ مسجد میں کون لوگ دھماکے کر رہے ہیں؟

ریاض: کیا مطلب کون لوگ دھماکے کر رہے ہیں؟

ساجد: مسجد میں دھماکے کرنے والے تو مسلمان نہیں ہو سکتے۔

ریاض: عجیب باتیں نہ کر۔آج عبداللہ صاحب آنے والے ہیں۔میں فون کیا تھا انھوں نے کہا ہے شام تک پہنچ جائیں گے کپڑے اور کھانا لیکر آ رہے ہیں۔۔تم بیٹھو میں چکر لگا کے آتا ہوں۔

ٹائم لیپس لیتے ہیں۔گاڑی کے چلنے کی آواز آتی ہے۔گاڑی چڑھائی چڑھتی ہوئے پہلے گیئر کی آواز آتی ہے۔گاڑی رکتی ہے لیکن انجن کے سٹارٹ رہنے کی آواز آتی ہے۔آواز کا لیول ڈاؤن ہوتا ہے۔

عبداللہ: آگے گاڑی نہیں جائے گی۔تم لوگ ادھر ہی انتظار کرو میں اوپر سے ہو کے آتا ہوں۔

عبداللہ کے پتھروں پہ چلنے کی آواز اس کا سانس پھولتا ہے تیز تیز سانس لینے کی آواز۔

ریاض: السلام علیکم عبداللہ بھائی!

عبداللہ: وعلیکم السلام (سانس لیتے ہوئے) بڑا اوپر بیٹھا ہے۔(سانس درست کرتے ہوئے)۔۔تمھارا ساتھی کہاں ہے؟

ریاض: وہ بھی ادھر ہے ابھی آ جاتا ہے۔

عبداللہ: تم دونوں کا کام ٹھیک جا رہا ہے۔بس ابھی تم کو الگ مشن پہ بھیجنا ہے۔

ساجد: السلامُ علیکم!

عبداللہ: وعلیکم السلام۔کیا حال ہے۔بس تم لوگوں کا کام یہاں سے جلدی ختم ہو جائے گا۔

ساجد: اچھا کمانڈر صاحب!

عبداللہ: تم لوگوں کا اب فدائی بننے کا باری آ گیا۔۔ایک بڑا مشن دینا ہے تم کو (لہجے میں ایک کھنک ہے جیسے کوئی بہت بڑا کام ان کو دینے جا رہا ہے)۔۔کیا ہوا تم خوش نہیں ہوا؟

ریاض: یہ خوش ہے عبداللہ بھائی (بناوٹی لہجے میں کہتا ہے)

عبداللہ: تم ٹھہر جاؤ اس سے بات کرنے دو۔کیوں لڑکے تم خوش نہیں ہو کیا؟

ساجد: ہم بے گناہ انسانوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں۔ان لوگوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے وہ تو مسجد میں نماز پڑھتے ہیں پھر ہم ان کو کیوں مارتے ہیں؟

عبداللہ: (غصے میں پھٹ پڑتا ہے) کیسی باتیں کر رہے ہو تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔جس مقصد کے لیے تم نے اتنی قربانی دی اب وہ نزدیک آیا ہے تو تم ایسی گمراہ کن باتیں کر رہے ہو۔

ساجد: مجھے لگتا ہے کہ یہ سب غلط ہو رہا ہے۔

عبداللہ: ریاض کیا ہوا ہے اس کو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے؟

ریاض: ایسے ہی بہک گیا ہے عبداللہ بھائی آپ اس کی فکر نہ کریں بس ٹھیک ہو جائے گا۔

عبداللہ: رزاق کا دوست ہے اس لیے چھوڑ رہا ہوں ورنہ بہت اچھے طریقے سے سمجھا سکتا ہوں اسے۔

ریاض: آپ بے فکر رہیں کہیں نہیں جائے گا۔

عبداللہ: جاؤ میرے لیے پانی لیکر آؤ۔

ساجد: اچھا!

عبداللہ: (سرگوشی کرتے ہوئے) اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔

ریاض: اچھا خاصا تھا پتا نہیں کیا ہوا۔

عبداللہ: اس پہ نظر رکھنا ہے سمجھے کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔

ساجد: یہ لیں پانی۔

ریاض: ہمیں پھر انتظار رہے گا۔

عبداللہ: ٹھیک میں چلتا ہوں بس جلد ہی تم لوگوں کی باری آنے والی ہے سمجھے ۔۔فی امان اللہ

ریاض: فی امان اللہ

عبداللہ کے قدموں کی آواز۔

ریاض: کیا تم کیا بات کر رہے تھے پتا ہے ایسی باتیں سوچنا اور کرنا گناہ ہے۔

ساجد: میں تو بس ذہن میں آنے والا سوال پوچھ رہا تھا۔

ریاض: ایسے سوالات نہیں پوچھا کرتے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔اب تم آرام کرو میں پہرہ دیتا ہوں۔

ساجد: ٹھیک ہے۔

[منظر:۱۸]

کردار۔۔ابو۔۔امی

(SFX: امی کے کھانسنے کی آواز اور لیپ ہوتی ہے۔تیز تیز سانس لینے کی۔موٹر سائیکل رکتا ہے۔۔ابو گھر میں داخل ہوتا ہے چارپائی پر بیٹھتا ہے لمبا سانس لیتا ہے)

امی: ہو آئے تم کیا کہتے ہیں تھانے والے؟

ابو: سیکورٹی اداروں نے کاروائی کر کے کچھ بچے بازیاب کروائے ہیں۔ میری ایف آئی آر تھی اس لیے مجھے بھی بلا لیا انھوں نے۔

امی: اپنے لڑکے کا کوئی پتا چلا؟

ابو: نہیں ان لڑکوں میں تو نہیں ہے میں نے لسٹ دیکھی ہے۔

امی: شاید کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہوا۔

ابو: کیا کہہ سکتا ہوں۔

امی: رو رو کے میری تو آنکھوں کی روشنی بھی چلی گئی ہے۔

ابو: حوصلہ رکھی ہماری پولیس اور ادارے کام تو کر رہے ہیں کہیں نہ کہیں پتہ ضرور چل جائے گا۔ حوصلہ رکھ۔۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔

[منظر:۱۹]

کردار۔۔ ریاض۔۔ ساجد۔۔ اناونسر

(SFX: ریڈیو کے ٹیون کرنے کی آواز آتی ہے)

اناونسر: یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ ابھی آپ دینی تعلیمات پہ پروگرام سنیں گے، (پروگرام کا نام ڈائریکٹر خود منتخب کرے)۔ پروگرام میں شامل تقاریر کا سلسلہ سنتے ہیں اسلام میں دہشت گردی کی ممانعت۔

(یہاں ایسا کوئی بھی پروگرام کا کلپ دیا جا سکتا ہے جو کہ اس موضوع کے مطابق ہو۔ کلپ کا اہم حصہ سُنواتے ہیں۔ لیول ڈاؤن کرتے ہیں سسپینس میوزک ان کرتے ہیں)

ریاض: اچھا تو یہ ہو رہا ہے تم یہاں کمانڈر صاحب کی تقاریر سننے کی بجائے ریڈیو پہ یہ چیزیں سُن رہے ہو!

ساجد: تم ایک بار سن کے تو دیکھو وہ کہہ کیا رہے ہیں۔

ریاض: میں نہیں سننا چاہتا۔ یہ جھوٹ اور کفر بولتے ہیں۔

ساجد: جھوٹ اور کفر تو کمانڈر صاحب بولتے ہیں۔ بے گناہ لوگوں کو ہلاک کر کے۔

ریاض: کیا کہہ رہے ہو؟

ساجد: ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب حکم ہو گیا کہ جنگ میں دشمن کے عورتوں بچوں جانوروں حتیٰ کہ درختوں تک کو نقصان نہیں پہنچانا۔ یہ تو پھر بھی انسان ہیں اور وہ بھی مسلمان۔

ریاض: مسلمان نہیں ہیں کافر ہیں۔

ساجد: تم کیسے جانتے ہو کہ یہ کافر ہیں۔ یہ تو اللہ جانتا ہے اور اس نے فیصلہ کرنا ہے

ریاض: ان کا دل کافر ہے۔

ساجد: ہم نے کون سا ان کے دلوں میں گھس کے دیکھا ہے؟

ریاض: تم گمراہ ہو رہے ہو۔

ساجد: گمراہ تو میں تھا لیکن اب راہِ راست پہ آ گیا ہوں۔۔تم ایک بار سُن کے تو دیکھو کہ یہ لوگ کہہ کیا رہے ہیں۔

ریاض: میں نہیں سننا چاہتا۔

ساجد: صرف ایک بار۔

(ریاض کی کشمکش پہ مبنی میوزک)

ریاض: اچھا ٹھیک ہے سناؤ۔

ساجد: سُنو!!

(ریڈیو کی تقریر کو کوئی دوسرا حصہ اس کا کلپ چلتا ہے۔ختم ہوتا ہے۔یہ ڈراما کے ڈائریکٹر پر منحصر ہے کہ وہ کونسا کلپ منتخب کرتا ہے)

ساجد: اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟

ریاض: میں کچھ نہیں جانتا تم میرے ساتھ چلو ورنہ میں تم کو گولی مار دوں گا۔۔اٹھو۔

گن کو لوڈ کرنے کی آواز۔

ساجد: یہ کیا کر رہے ہو؟

ریاض: چلو میرے آگے چلو سمجھے۔

ساجد: یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے۔

ریاض: میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔کوئی بھی ہوشیاری کی تو جان سے جاؤ گے سمجھے!

ساجد: میں کہتا ہوں یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے!!

ریاض: یہاں رک جاؤ۔وہ فون نکال کے مجھے دو تا کہ میں کمانڈر عبداللہ کو تمھارے بارے میں اطلاع کروں۔۔۔خبردار میں نے کہا نا کوئی چالاکی نہیں کرنی۔۔ہاں شاباش نکال۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔اب اسے آن کرو۔۔

ساجد: آن نہیں ہو رہا بیٹری ختم ہے۔

ریاض: ادھر بیٹھو میں دیکھتا ہوں۔۔وہ رسی میری طرف پھینکو۔۔(ریاض کے سانس لینے کی آواز)۔ہاتھ ہی باندھے ہیں

ابھی تمھارے اب آرام سے بیٹھو جاو اور سنو اگر ذرا بھی ہلنے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے ۔۔بیٹری کہاں ہے کمانڈر صاحب نے ایک اور بیٹری دی تھی۔کہاں گئی

ساجد: ذرا سوچو تو سہی ہمارا مذہب سلامتی اور بھائی چارے کا مذہب اس نے لوگوں کو انصاف بھلائی اور امن کا راستہ دکھایا ہے۔ہم کیسے بے گناہوں کو مار سکتے ہیں؟ ہمیں تو یہ کہا گیا ہے کہ اگر ہم نے ایک انسان کو قتل کیا تو وہ پوری انسانیت کا قتل ہو گا۔۔اور یہ لوگ یہ تو سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں کا قتل کر چکے ہیں۔اگر ان کی ساری باتیں ٹھیک بھی ہیں تو صرف یہ غلط ہے کہ ہم کسی دوسرے کو اس لیے ماردیں کہ وہ ہم اتفاق نہیں کرتا۔

ریاض: چپ کر جاو۔ مجھے نہ ورغلاؤ چپ!!

ساجد: ذا سوچو تو سہی جس طرح ہماری ماں نے ہمیں پالا ہے مصیبتیں اُٹھا کے اسی طرح جن کو یہ لوگ قتل کرتے ہیں وہ بھی تو کسی کے بچے، بھائی اور دوست ہیں۔

ریاض: میں نے کہا نا چپ ہو جاؤ۔۔یہ بیٹری کہاں گئی (اس کا لہجہ ایسے ہے جیسے وہ ساجد کی بات سمجھ گیا لیکن اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش میں ہے لیکن اندر سے ٹوٹ گیا ہے)

ساجد: ذرا سوچو تو سہی جہاں یہ لوگ دھماکے کرواتے ہیں وہاں اگر ہمارا والد بھائی یا اماں ہو تو ہمارے دل پہ کیا گزرے گی؟

(تھپڑ کی آواز۔خاموشی۔ریاض کے رونے کی آواز)

ساجد: کیوں رو رہے ہو؟

ریاض: تم ٹھیک کہتے ہو۔لیکن ہم ان لوگوں کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔اگر ہم دونوں یہاں سے چلے گئے اور ان کو پتا چل گیا تو مارے جائیں گے۔

ساجد: پھر

ریاض: ایسا کرو تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔

ساجد: لیکن تمھارا کیا بنے گا؟

ریاض: میں ان کو بتا دوں گا کہ تم بھاگ گئے ہو اور ان کو غلط راستے پہ ڈال دوں گا۔

ساجد: تھوڑی دور فوج کے لوگ ہیں ان کو بتا دیتے ہیں۔

ریاض: آج وہ لوگ ہمیں لے جانے کے لیے آنے والے ہیں۔وہ راستے میں ہوں گے تم نکل جاؤ۔

ساجد: لیکن تم بھی میرے ساتھ چلو۔

ریاض: نہیں تم جاؤ۔ابھی اور ٹائم ضائع کرو گے تو پکڑے جاؤ گے۔بھاگ جاؤ۔

ساجد: لیکن!!

ریاض: میں نے کہا نا بھاگ جاؤ۔

ساجد: میں تمھارے بنا نہیں جاؤں گا۔

ریاض: دیکھو ضد مت کرو ہم میں سے ایک نکل سکتا ہے اور تم نکل جاؤ میرا کیا میری ماں تو بچپن میں مر گئی تھی لیکن تمھاری تو ہے نا اس کی خاطر تم جاؤ گے۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔۔۔ چلے جاؤ

ساجد۔۔ اچھا۔۔ اچھا

(SFX: ساجد کی روز روز سے سانس لینے اور بھاگنے کی آواز تھوڑی دیر تک اس کے بھاگنے کی آواز اور سانس کی آواز آتی ہے۔ دور سے گن شاٹ کی آواز آتی ہے)

ساجد: (بھولی ہوئی سانس کے ساتھ) انھوں نے مار دیا ریاض کو انھوں نے مار دیا ریاض کو ظالموں نے مار دیا ریاض کو

ساجد کی آواز فیڈ آوٹ ہوتی ہے۔

نیریشن:

ساجد بچ کے نکل گیا اور ریاض مارا گیا۔ ساجد نے خود کو سکیورٹی اداروں کا حوالے کر دیا۔ اس کی نشان دہی پہ کارروائی کرتے ہوئے بہت سے بچوں کا بازیاب کروالیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی پکڑے گئے جو کہ بچوں کو ورغلاتے تھے۔

ساجد اب بحالی کے مرکز میں ہے وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی نظم: ''خدا کرے کہ مری ارضِ پاک پر اترے'' اوور لیپ کرتے ہوئے فیڈ کرتے ہیں

☆☆☆

امین راحت چغتائی

سیرِ گریباں

[نوتصنیف خودنوشت کا ایک حصّہ]

روزنامچہ:

بہرحال میرا روزنامچہ دسمبر ۱۹۶۰ء کے اوائل تک جاری رہا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۶۰ء کو میری شادی ہوگئی۔ یہ انبالہ سے ہجرت کر کے آئے ہوئے ایک شیخ خاندان میں ہوئی تھی۔ اپنے اقربا میں سے کوئی نزدیک تھا نہیں اور ابا جان ۱۹۵۵ء میں وفات پا چکے تھے ورنہ وہ اپنے خاندان سے باہر شادی ہرگز نہ ہونے دیتے۔ اس سلسلے میں وہ متعصب تھے۔ میں بھی اسی پس منظر اپنی ہونے والی بیوی کے نظریات اور مزاج سے یکسر ناواقف تھا۔ شادی سے دو ہفتے قبل اپنی شش و پنج کی حالت کو ختم کرتے ہوئے میں نے کم و بیش اٹھارہ سال تک لکھا ہوا روزنامچہ جو کئی مجلد کاپیوں پر مشتمل تھا، نذرِ آتش کر دیا۔ روزنامچہ ضائع کرتے وقت مجھے کوئی قلق نہیں تھا۔ میں نوجوان تھا۔ خوب رُو تھا۔ اس وقت بھی معروف شاعر، ادیب اور صحافی تھا۔ وسیع المطالعہ اور آزاد خیال تھا۔ ۱۹۵۴ء میں جب روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی سے جاری ہوا تو میں اس کا پہلا نیوز ایڈیٹر تھا۔ اگر کوئی قاری نیوز ایڈیٹر کے فرائض سے آگاہ ہے تو اسے معلوم ہوگا کہ روزنامے کو چلانے والا تو نیوز ایڈیٹر ہوتا ہے۔ ایڈیٹر تو پالیسی دیتا ہے اور اداریہ لکھ کر قارئین کو ملک کے داخلی و خارجی احوال سے آگاہ کرتا ہے۔ نیز ہر صبح، نیوز ایڈیٹر اور مینجنگ ایڈیٹر کے ساتھ مشاورت کے بعد اداریے کا موضوع طے کرتا ہے۔ ہمارے عہد میں حمید نظامی مرحوم ایڈیٹر، شیخ حامد محمود مینجنگ ایڈیٹر اور ظہور عالم شہید اخبار کے لاہور ایڈیشن کے نیوز ایڈیٹر ہوتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان کی اردو صحافت نے ان سے بڑا نیوز ایڈیٹر بھی پیدا نہیں کیا۔ ہم سب انھیں کا اتباع کرتے تھے۔

ہاں تو بات اپنا روزنامچہ جلانے کی ہو رہی تھی۔ میں نے اسی میں عافیت جانی۔ کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ میری بیوی بھی میرے خیالات کو میرے نقطہ نظر سے دیکھتی اور ایسا ہی ہوا۔ بیوی نے ساری عمر میرے مزاج اور خیالات سے مفاہمت نہیں کی۔

میرا بڑا بیٹا محمد ظل ہمایوں میرزا میری شادی کے بارہ سال بعد بفضلہٖ ۱۹۷۲ء میں اور چھوٹا بیٹا محمد شاہ رخ میرزا ۱۹۷۵ء میں یعنی شادی کے پندرہ سال بعد پیدا ہوئے اور دنوں کے تاریخی نام نکلے۔ ایک بات اور دونوں کے دائیں کولہے پر پیدائش کے وقت ایک ہلکا سا نیلا نشان تھا جیسے چوٹ کے باعث نیل سا پڑ گیا ہو۔ میری بیوی نے جب یہ نشان دیکھا تو بہت گھبرائی اور مجھے دکھایا۔ میں مسکرا دیا وہ مزید حیران ہوئی۔ اس پر میں نے بتایا کہ یہ رب العزت کی طرف سے ہمارے مغل ہونے کی نشانی ہے۔ اسے Mongol Spot کہا جاتا ہے اور یہ مغل بچے کی پیدائش سے لے کر تقریباً ڈیڑھ سال تک رہتا ہے پھر خود ہی مٹ جاتا ہے۔ چین اور جاپان میں اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اب ہمارے پاس

بھی مغل ہونے کی ایک یہی نشانی رہ گئی ہے۔

اپنے عہد کے ممتاز نعت گو اور صحافی حافظ مظہر الدین مرحوم (۱۹۱۷ء تا ۱۹۸۱ء) میرے بہت گہرے اور بزرگ دوستوں میں سے تھے۔ روز نامہ کوہستان راولپنڈی کے ابتدائی عہد (۱۹۵۴ء) میں ہم دونوں اسی اخبار سے وابستہ تھے۔ وہ دینی صفحے پر کام کرتے تھے اور میں نیوز سیکشن میں سب ایڈیٹر تھا۔ اخبار کے چیئر مین نسیم حجازی تھی جو حافظ صاحب کے بہنوئی تھے۔ حافظ صاحب میرے ہم مزاج بلکہ ہم دل تھے اور بذلہ سنج تھے۔ نصف صدی سے نعت کہہ رہے تھے۔ درس نظامی پڑھے ہوئے تھے۔ عنفوان شباب کا زمانہ ریشمی لاچا پہن کر گھوڑ سواری میں بسر کیا ہوا تھا اور اب پھٹی ہوئی قمیص اور گھسی ہوئی شلوار پر شیروانی پہن کر قلم کی مزدوری کرتے ہوئے گزار رہے تھے۔ واضح رہے کہ قیام پاکستان کے بعد اردو صحافت میں دینی کالم حافظ صاحب نے ہی روز نامہ تعمیر (قومی کتب خانہ لاہور والوں کا راولپنڈی سے شائع ہونے والا پہلا مکمل اخبار) سے متعارف کروایا تھا۔ حافظ صاحب اسی اخبار میں ''پھول اور کانٹے'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ نشیلی آنکھیں، سرخ و سپید رنگت، ست کوہی پیرزادگی کی اداؤں سے آراستہ کھرے پیرزادے تھے اور پیرزادوں پر جب جوانی آتی ہے تو مغل زادوں کی طرح یہ بھی جس پر مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر خیر یوں آیا کہ ایک روز ان کی نشست گاہ میں میرے علاوہ ان کے دو بے تکلف ارادت مند بھی بیٹھے ہوئے تھے اور اسی کافر عہد کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ بیچ میں حافظ صاحب بھی کہیں کہیں لقمہ دیتے جاتے تھے۔ اس پر ان دونوں میں سے ایک نے قدرے شوخی سے پوچھا۔ حافظ صاحب آپ بھی؟ حافظ صاحب کب چوکنے والے تھے۔ فوراً ان سے مخاطب ہو کر بولے ''حضرت جی (یہ ان کا تکیہ کلام تھا) آپ کا کیا خیال ہے، یہ ڈیڑھ مشت کی سفید داڑھی کیا بچپن سے ہی میرے چہرہ زیبا پر سجی ہوئی تھی؟ پھر داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور روئے سخن ان کی طرف پھیر کر کہنے لگے۔ ''قبلہ! اب بھی اس ریش کے پیچھے کچھ مہاسے اور داغ موجود ہیں''۔ اس پر بڑا بامعنی، بھرپور قہقہہ گونجا۔

سو میں بھی یہی کہتا ہوں کہ میری سفید ریش پر مت جاؤ۔ اپنے ہی دل کی گواہی لے لو۔ یا میرا پہلا مجموعہ کلام ''بھید بھنور'' پڑھ لو۔ ہر نظم ایک سچے مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے۔ میرا تو نقطہ نظر ہی یہ ہے کہ شاعر کچھ چھپاتا ہی نہیں۔ وہ تو بقول ساحر لدھیانوی

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں

اسی طرح مولانا گرامی نے تو یہ کہہ کر میری مشکل اور آسان کر دی:

بود و نبودِ ما ہمہ ، ہیچ است اے حکیم
یعنی بشاخِ شعلہ بود آشیانِ ما

لیکن گرامی نے بھی مشکل آسان تو کر دی، ختم نہیں کی۔ ویسے مشکلات میں اضافہ کر کے خوش ہونے والا ایک شخص محمد حسن

عسکری تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، ادب اور ادیب دونوں کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہا۔ میری تو جوانی کے ابتدائی زمانے میں دلی کے جو ادبی رسائل میرے زیر مطالعہ رہے۔ ان میں حکیم محمد تقی دہلوی کا ماہنامہ ''مشہور'' اور دوسرا سید کاظم علی کا ماہنامہ ''کہکشاں'' تھا۔ موخرالذکر ماہنامہ قیام پاکستان کے بعد لاہور منتقل ہوگیا تھا۔ مگر بوجہ اپنی اشاعت جاری نہ رکھ سکا۔ سردست یہی رسالہ زیر بحث ہے۔ ''کہکشاں'' نے اپریل ۱۹۴۷ء میں دلی سے آپ بیتی ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اس میں جہاں نواب خواجہ محمد شفیع دہلوی، سہیل عظیم آبادی، رئیس امروہوی، خیام الہند استاد حیدر دہلوی، پریم پجاری ایسے مشہور ادیبوں کی آپ بیتیاں شامل تھیں، وہیں ایک مضمون محمد حسن عسکری ایم اے کا بھی تھا (ان دنوں عسکری صاحب کے نام کے ساتھ ایم اے بھی لکھا جاتا تھا) عسکری صاحب کے مضمون کا نام تھا ''خودنوشت آپ بیتی میں سچ اور جھوٹ'' ایک تو انھوں نے آغاز ہی میں قارئین کو یہ کہہ کر آپ بیتی پڑھنے سے بھگا دیا کہ ''پرانے زمانے میں ہندوستانی گھرانوں میں کہانیاں سناتے ہوئے عورتیں کہا کرتی تھیں کہ کہنے والے کا بھلا، سننے والے کی ناک میں ڈلا'' اب بتایئے کوئی آپ بیتی کاہے کو پڑھے گا۔ اپنی ناک کسے عزیز نہیں ہوتی۔ عسکری صاحب مزید کہتے ہیں کہ آپ بیتی میں روسو تک نے ڈنڈی ماری۔ لہٰذا اس کا کیا ثبوت کہ لکھنے والا سچ اور سچ لکھ رہا ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ عسکری صاحب، ادب اور ادیب دونوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے شائق ہیں۔ لیکن انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ آگے چل کر پھر کہتے ہیں کہ 'نئی نفسیات نے انسانی دماغ اور اس کے عمل کی جو تشریح کی ہے، اس کی رو سے تو آپ بیتی میں جو تھوڑا بہت سچ باقی رہ جاتا ہے وہ بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی لکھنے کا ایک نقصان یہ بھی بتایا ہے کہ ''ہزار روکنے کے باوجود خودنمائی کے رجحانات بروئے کار آ ہی جاتے ہیں۔''

لہٰذا طے پایا کہ آپ بیتی جتنی مختصر ہو اتنی جھوٹ سے کم ملوث ہوگی مگر اصل مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے کہ پھر کیا لکھا جائے۔ جوش صاحب اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کریں تو وہ جھوٹ گردانا جائے۔ احسان دانش، پنجاب یونی ورسٹی اولڈ کیمپس کی تعمیر کے دوران میں اپنے اینٹ گارا ڈھونے کا ذکر کریں تو وہ مبالغہ ٹھہرے۔ امین راحت چغتائی ہوشیار پور میں اپنے افلاس اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں گھر میں فاقہ کشی کا ذکر کرے تو وہ افسانہ سمجھا جائے (یہ طعنہ میری ایک سوانحی تحریر پر ڈاکٹر صفدر محمود نے دیا تھا) لہٰذا جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ فرض کر لیجیے کہ سچ ہے۔

میرا ددھیال سہارن پور کے چغتائی، برلاس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ برلاس اور چغتائی دو الگ الگ قبیلے سمجھے جاتے ہیں لیکن دونوں سگے عمزاد ہیں۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ تومنہ خان کے دو بیٹے تھے۔ ایک قبل خان، دوسرا قاچولی بہادر، اول الذکر کی اولاد میں چنگیز خان پیدا ہوا اور ثانی الذکر کا بیٹا اور ایروجی برلاس کہلایا۔ لہٰذا قاچولی بہادر کے بیٹے کے نام سے یہ قبیلہ برلاس موسوم ہوا۔ ایروجی کا پوتا، امیر قاچار، امیر الامرا تھا اور چنگیز کے بیٹے چغتائی کا سپہ سالار تھا۔ اس طرح تخت و تاج قبل خاں کی اولاد میں منتقل ہوگیا۔ اسی امیر قاچار کی اولاد میں آگے چل کر امیر تیمور پیدا ہوا۔

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسی چغتائی کا پوتا مبارک شاہ خاندان چغتائیہ کا پہلا مسلمان مغل تھا۔ وہ

چغتائی کے بیٹے قراہولا گو اور شہزادی بورقینہ کا بیٹا تھا اور امیر تیمور اپنے وقت پر برلاس ہونے کے باوجود آل چغتائی کے جانشین کے طور پر سریرآرائے سلطنت ہوا۔

بہرحال سہارن پور میں چغتائیوں اور برلاسوں کی آپس میں اتنی گہری اور قریبی تعلق داری تھی کہ انھیں دو الگ قبیلے سمجھنا دشوار تھا۔ مثلاً میری پھوپھی کریم النسا برلاس قبیلے میں بیاہی گئی تھیں چنانچہ میرے دونوں پھوپھی زاد بھائی میرزا حسین بیگ اور میرزا اعظم بیگ، برلاس کہلائے اور دونوں نے پاکستان ہی میں آ کر وفات پائی۔ میرے دادا میری پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ ان کا نام میرزا امام بیگ تھا مجھے بتایا گیا تھا کہ ہمارا خاندان مغل فوج کے لیے گھوڑوں کی تربیت اور فروخت کا کام کرتا تھا۔ میرے ابا جان بتاتے تھے کہ جب وہ کنبے کے پانچ جوان (چار سگے اور ایک پھوپھی زاد) گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تو لوگ از راہ خوش دلی کہا کرتے تھے کہ بھئی ایک طرف ہو جاؤ، میرزا کا رسالہ آ رہا ہے۔ خاندان کے اکابرین نے حسبِ توفیق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا تھا جو انگریز بہادر کو اب تک کھٹکتا تھا۔ دھیرے دھیرے کاروبار متاثر ہوا تو جینے کے لالے پڑے۔ فیصلہ ہوا کہ بیک وقت سب افراد سہارن پور کو خیر باد نہ کہیں۔ انفرادی طور پر مختلف شہروں میں جا کر قسمت آزمائی کریں۔ میرے ابا جان، دلی پہنچے، دادا جان، حکیم اجمل خان کے بڑے بھائی، صادق الملک حکیم عبدالمجید خان سے صاحب سلامت رکھتے تھے۔ ان کے حوالے سے ملے۔ پانچ سال تک ان کے طبیہ کالج میں خاموشی سے طب کی تعلیم حاصل کی۔ زبدۃ الحکما کی سند لی۔ وہیں تربیت پائی۔ دلی میں طبابت کا آغاز کیا۔ ہولے ہولے اتنا کمانے لگے کہ شادی کا خیال آ گیا۔ چپکے سے شادی کر لی لیکن نباہ نہ ہو سکا۔ طلاق دے دی۔ چند سال مزید گزار کر رنگون جانے کی ٹھانی۔

مجھ سے سہارن پور کا ذکر عموماً نہیں کرتے تھے۔ مگر کبھی کبھی غیر ارادی طور پر اس کا تذکرہ ان کی زبان پر آ جاتا تو آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی۔ انسان کتنا ہی چھپائے اپنے وطن کو بھلانا آسان نہیں ہوتا۔ جہاں بچپن اور شباب کا زمانہ گزارا ہو، جہاں مشہور ''مظاہر العلوم'' ایسی دینی درس گاہ ہو، جو علوم و فیوض کا سرچشمہ ہو اور جس سرچشمے سے خود بھی حسب توفیق علم حدیث حاصل کیا ہو، جہاں مولانا محمد زکریا کاندھلوی شارح موطا و بخاری کا فیض جاری ہو، وہ جگہ کیسے بھلائی جا سکتی تھی۔ یہیں شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن کیمبل پوری علم حدیث سے طلبہ کو آراستہ کرتے تھے۔ آج ان مبارک ہستیوں کے نام زبان پر آتے ہیں تو روح سرشار ہو جاتی ہے جن طلبہ نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر فیض پایا ہوگا ان کے درجات کی بلندی کا کیا عالم ہوگا۔ ان کا ذکر ابا جان کی زبان پر آتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ ان کی روح تڑپ رہی ہے۔ بحیثیت مجموعی سہارن پور اور اس کے قصبات ہمیشہ سے علما و صلحا کے مسکن رہے ہیں۔۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں مسلمانوں کی تعداد خاصی طاقت ور تھی پھر سکھوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں مغلوب و پامال بھی ہوئی۔ یہاں دلآویز آب و ہوا نے ہمیشہ مسخر کیا۔ ملکہ نور جہاں نے موضع نور نگر میں ایک محل تعمیر کروا رکھا تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں بھی یہاں ایک محل تعمیر ہوا۔

میرے آباؤ اجداد کے شہر کا ذکر آیا ہے تو اس کی کچھ تاریخی تفصیل بھی سن لیں کہ میرے بعد پاکستان میں ممکن ہے پھر ضرورتاً بھی کوئی شاید ہی بیان کرے۔ سہارن پور آج بھی جب کہ میں بفضلہٖ اٹھاسی برس کی عمر میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، اتر پردیش کا ایک اہم شہر ہے۔ ایک ہزار چار سو نوے مربع میل رقبے پر مشتمل ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً پینتیس (۳۵) لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ پورا ضلع جمنا گنگا دوآب کا حصہ ہے۔ آثار قدیمہ کے سروے کے مطابق یہاں برس ہا برس پرانی آبادیوں کی نشان دہی ہوئی ہے۔ ضلع کے جن مختلف حصوں میں کھدائی ہوئی ہے ان میں امبا کھری، بارگاؤں، بلاس، نصیر پور اور ضلع ہردوار کا علاقہ بہادر آباد شامل ہے۔ پوری تحقیقات کے دوران میں پتلا چلا ہے کہ یہ مقامات ہڑپہ تہذیب کے مماثل تھے۔ نیز موجودہ ضلع مظفر نگر کے بعض علاقے مہابھارت کی جنگ بھی دیکھ چکے ہیں۔ ادھر پرانوں میں سہارن پور کا قدیم نام ''سدھارن پور'' درج ہے۔

اسلامی دور میں (یعنی سلطان شمس الدین ایلتتمش ۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء کا عہد) یہ علاقہ دہلی کی سلطنت کا حصہ تھا۔ مگر جنگوں اور دلدلوں پر مشتمل تھا۔ دو چھوٹے دریا پاؤں دھوئی اور دھمولا اور گندانالہ یہاں سے گزرتے تھے۔ بعدازاں محمد بن تغلق کا دور (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) آ گیا۔ اس نے ۱۳۴۰ء میں یہاں کے راجاؤں کی عملداری ختم کی۔ انھیں شوالک کے راجا کہا جاتا تھا۔ شوالک یہاں کے بھی پہاڑ کا نام ہے جس میں بائیس درے ہیں۔ جانے یہ پہاڑ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ ہوشیار پور (مشرقی پنجاب، تبت کا دامن) سے سات میل پیچھے تک جو پہاڑ پھیلا ہوا ہے اسے بھی کوہ شوالک ہی کہا جاتا ہے۔ اسی پہاڑ پر حضرت شاہ نور جمال کی خانقاہ ہے جس پر ہر سال اپریل کے آغاز میں ایک بہت بڑا میلا لگتا تھا جس میں ہوشیار پور کے دیہی مسلم کلچر کی بھرپور نمائندگی ہوتی تھی۔ میں نے یہ میلا دیکھا ہوا ہے۔

بہرحال محمد بن تغلق کو اپنی مہم کے دوران میں 'پاؤں دھوئی دریا' کے کنارے ایک صوفی بزرگ کی موجودگی کا علم ہوا جن کا نام شاہ ہارون چشتی تھا۔ چنانچہ ان کی زیارت کے بعد اس نے اس علاقے کا نام شاہ ہارون پور رکھ دیا۔ یہی بعد میں سہارن پور بن گیا۔ اب ان بزرگ کا سادہ سا مگر محفوظ مقبرہ سہارن پور شہر کی پرانی آبادی میں موجود ہے۔ یہ مالی گیٹ، بازار دنیا ناتھ اور حلوائی ہٹّا کے درمیان واقع ہے۔ چودھویں صدی کے اواخر میں سلاطین دہلی کا اقتدار ختم ہو رہا تھا۔ ادھر وسطی ایشیا سے امیر تیمور نے ۱۴۰۵-۱۳۳۶ء کے درمیان حملہ کر دیا۔ وہ ۱۳۹۹ء میں سہارن پور کے علاقے سے گزرا اور دلی تک کا علاقہ تباہ و برباد کرتا چلا گیا۔ بعدازاں مغل بادشاہ بابر نے ۱۵۳۱-۱۴۸۳ء کے درمیان اسے فتح کر لیا۔ وہ وادیِ فرغانہ (موجودہ ازبکستان) کا رہنے والا تھا اور امیر تیمور کے ورثا میں سے برلاس مغل تھا اور اب پورے ہندوستان، موجودہ پاکستان، افغانستان اور بنگلہ دیش سمیت پورے علاقے کا حکمران کہلایا۔ یہ حکمران ترک منگول نسل سے تعلق رکھتے تھے اور فارسی زبان بولتے تھے۔ بعدازاں اکبر کے عہد میں (۱۵۴۲ء تا ۱۶۰۵ء) سہارن پور، ایک جاگیر قرار دے کر خزانچی سہ رینو یر سنگھ اگروال کے سپرد کی گئی جس نے یہاں فوجی چھاؤنی ختم کر کے آج کے سہارن پور کی بنیاد رکھی۔ یہ اس زمانے میں شیخ پورہ اور ملہی پور کی آبادیوں کی ہمسائیگی میں واقع تھا۔ اب سہارن پور، چہار دیواری میں گھرا ایک شہر تھا جس کے چار

دروازے تھے یعنی سرائے دروازہ، مالی دروازہ، بوریا دروازہ اور مکھی دروازہ شہر مختلف علاقوں میں بٹا ہوا تھا جن کے نام یہ تھے۔ نخاسا بازار، شاہ بہلول، رانی بازار مذکورہ صدر مکھی دروازہ اور شاہ رن ویر سنگھ کا پرانا قلعہ (آثار) محلّہ چودھریاں میں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بڑے امام باڑے سے زیادہ دور نہیں۔ رن ویر سنگھ نے محلّہ چودھریاں میں ایک جین مندر بھی بنوایا تھا جسے آج کل دیگر جین پنچائتی مندر کہا جاتا ہے۔

میں ۱۹۴۵ء میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ سہارن پور گیا تھا لیکن ابا جان برما سے راولپنڈی آنے کے بعد سہارن پور نہیں گئے۔ رنگون میں قیام کے دوران میں بھی بھائیوں سے رابطہ معطل ہی رہا۔ انھیں رنگوں میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں نے انھیں لاپتہ قرار دے کر جائیداد آپس میں بانٹ رکھی ہے۔ کسی عزیز نے انھیں اطلاع دے کر اکسایا تھا کہ آپ مقدمہ کر کے اپنا حصہ واپس لے سکتے ہیں۔ اس پر ابا جان کا جواب تھا ''مقدمہ کس پر کروں؟'' اپنے بھائیوں پر؟ اور خاموش رہے اور پھر عمر بھر رابطہ نہیں ہو سکا۔ سہارن پور میں اپنی پھوپھی کے پاس ٹھہرا تھا۔ تایا اور چچا حضرات سے بھی ملا۔ سب بظاہر خوش دلی سے پیش آئے لیکن بالواسطہ تاثر یہ تھا کہ میں جائداد کی ٹوہ لینے آیا ہوں۔ بہر حال میں سب کے ساتھ بصد ادب مل کر لوٹ آیا۔ میں ان دنوں ڈینز ہائی سکول راولپنڈی میں زیر تعلیم تھا اور جماعت نہم کا طالب علم تھا۔ بعد میں پھر دو سال ہوشیار پور میں گزارے۔ مجھے سہارن پور بھیجنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اپنے طور پر یہی مقصد اخذ کیا کہ دیکھ لو جائداد کے اپنے حصے کا وارث اور اس کی اولاد دونوں زندہ ہیں۔

سہارن پور شہر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ ''دھرم تلاندی'' کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور زرخیزی کا یہ عالم ہے کہ گندم، باسمتی، چنا، باجرہ، مکئی، گنا پونڈا (پنجابی پونا) کپاس، لوکاٹ اور آم کی عمدہ ترین فصلیں پائی جاتی ہیں اور یہاں کا پونڈا تو سارے ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

یہاں کی مغل نو آبادیوں کے رہنے والے اپنے آپ کو بابر کے ہمراہیوں کی اولاد در اولاد بتاتے ہیں۔ برطانوی عملداری سے پہلے مرہٹوں اور روہیلوں کے ٹکراؤ نے علاقے کا سکون برباد کیے رکھا۔ ۱۸۰۳ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج نے مرہٹوں کو شکست دے کر سہارن پور کو برطانیہ کے زیر نگیں علاقوں میں شامل کر لیا۔

ابا جان سہارن پور کے مشہور مدرسہ مظاہر العلوم سے شرح حدیث کی خصوصی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ یہاں سے ہر سال تقریباً ایک ہزار طلبا دنیات کے مختلف شعبوں سے تعلیم پا کر نکلتے تھے۔ نقش بندی سلسلے کے مشہور مرشد حضرت حافظ عبدالکریم ایک بار تبلیغی دورے پر رنگون آئے تو ابا جان نے بھی نقش بندی سلسلے میں ان سے بیعت کی تجدید کی اور جب حضرت صاحب کو بتایا کہ وہ شیخ الحدیث کی سند بھی رکھتے ہیں تو مرشد نہ صرف خوش ہوئے بلکہ برما میں تبلیغ کے لیے نہ صرف انھیں خلافت عطا کی بلکہ بیعت کی اجازت بھی دی۔ ابا جان کی شخصیت بڑی وجیہہ اور متاثر کرنے والی تھی۔ حسن اتفاق کہ نباض بھی بہت اچھے ثابت ہوئے اور پھر طبابت اور تبلیغ دونوں میں شہرت پائی۔ اب میرے بڑے بیٹے محمد ظل ہمایوں کی آواز ماشاء اللہ اپنے دادا کی آواز سے ہو بہو ملتی جلتی ہے اور نیک شہرت کا حامل ڈاکٹر ہے اور آرمی میڈیکل کور

میں اس وقت (جنوری ۲۰۱۸ء) لیفٹیننٹ کرنل ہے۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد Medicine اور Chest کے امراض کی تشخیص کے لیے ایف سی پی ایس کی ڈگری رکھتا ہے۔ چنانچہ دادا اور پوتا دونوں ماہر نباض اور تپ دق کے بڑے معالج ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابا جان اس وقت بھی اوّل دو درجوں کی حالت میں تپ دق کا علاج کر دیا کرتے تھے۔ جب تپ دق ابھی قابل علاج مرض تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ابا جان غالباً ۱۹۴۰ء سے اس مرض کا علاج کرتے چلے آئے تھے۔ جب کہ بین الاقوامی سطح پر شاید ۱۹۵۶ء میں تسلیم کیا گیا تھا کہ تپ دق کا علاج ممکن ہے۔ راولپنڈی آنے کے بعد (۱۹۳۹ء میں) ابا جان کا گھر اور مطب اصغر مال پر عیدگاہ چوک میں واقع تھا۔ وہاں سے ٹی بی ہسپتال تقریباً ایک فرلانگ پر واقع تھا۔ جب مریض کی حالت بگڑنے لگتی تو ڈاکٹر حضرت مریض کے لواحقین کو ابا جان کے مطب کا پتا دے دیتے تھے اور بفضلہٖ پہلی دو حالتوں میں مریض صحت یاب ہو جاتا تھا۔ ان دنوں یوں بھی راولپنڈی شہر میں تین نباض مشہور تھے۔ ایک حکیم امیر علی دوسرے حکیم موتی رام اور تیسرے میرے ابا جان۔ اتفاق یہ کہ تینوں آپس میں کبھی نہیں ملے۔ سماجی تقریبات میں بھی تینوں کم آمیز تھے۔ ایک اہم بات اور میری صحیح تاریخ پیدائش تو ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۰ء ہی ہے لیکن ہوشیار پور کے سکول میں میرے گارڈین نے قیاساً یکم جنوری ۱۹۲۹ء درج کروادی۔ اس وقت تو کسی نے توجہ نہ دی۔ بعد میں یہی میری سرکاری تاریخ پدائش قرار پا گئی اور اب یہی ہر مقام پر میری سرکاری تاریخ پیدائش لکھی جاتی ہے۔ صرف میری تصنیفات پر صحیح تاریخ کا اندراج ہوتا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ رنگون میں ایک نیک دل بزرگ سورتی تاجر سیٹھ سلیمان ہوّز تھے۔ ان کا ریشمی لنگی (سامنے سے سلی ہوئی دھوتی جو برما میں عام پہنی جاتی ہے۔) اور زردوزی کے کام والی مسلمانوں کی گول ٹوپی بنانے کا کاروبار تھا۔ سیٹھ سے مراد کوئی بہت بڑا کاروباری شخص مراد نہ لیں۔ وہاں ہر چھوٹے بڑے تاجر کو سیٹھ ہی کہا جاتا تھا بلکہ اب بھی بھارت کے بڑے شہروں میں عام دکان دار کو بھی از راہ ادب سیٹھ کہہ دیا جاتا ہے۔ سیٹھ سلمان اکثر ضعیفی کے امراض میں مبتلا رہتے تھے جو بفضلہٖ ابا جان کے زیر علاج رہنے سے صحت یاب ہو گئے۔ جس کے باعث رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ سیٹھ صاحب کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا جو سیٹھ ستار ہوّز کہلاتا تھا اور اپنے ابا میاں کے کاروبار میں شریک تھا۔ شادی شدہ تھا اور دو چھوٹے بچوں کا باپ تھا۔ دوسری بیٹی تھیں جن کا نام حشمت ہوّز تھا۔ ابا جان کی ان سے شادی ہو گئی اور میری والدہ کہلائیں اور یوں سیٹھ سلیمان ہوّز میرے نانا اور ستار ہوّز میرے ماموں بن گئے۔ نانی اماں وفات پا چکی تھیں لیکن میں اپنی امی کو بھی دیکھ نہ پایا۔ میں چھے سال کا تھا کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ ادھیڑ عمر میں زچگی کے امراض سے نجات نہ پا سکیں۔ ماموں نے میری پرورش کے لیے پیش کش کی لیکن ابا جان نہ مانے۔ میرزا عبدالرحمٰن اور ان کی بیگم فضل النسا دونوں رنگون میں ابا جان سے نقش بندی سلسلے میں بیعت ہوئے تھے۔ ان کے چار بچے تھے۔ ایک بیٹی اور تین بیٹے لیکن بیٹی عین جوانی میں وفات پا گئی اور منجھلا بیٹا بھی وہیں انتقال کر گیا۔ میرزا صاحب نے ابا جان سے بچے کی نگہداشت کی پیش کش کی جو انھوں نے یوں منظور کر لی کہ وہ اور ابا جان ہمسائے بھی تھے اور خود بھی چوبیس گھنٹے میری دیکھ بھال کر سکتے

تھے۔ ہوشار پور میں میرزا صاحب اوران کی بیگم کو میں بھی ان کی اولاد کی طرح بالترتیب ابا جی اور بی بی جی کہنے لگا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں نے مجھے اتنی محبت اور شفقت دی کہ ان کے عزیز واقارب مجھے بھی انھیں کا بیٹا سمجھنے لگے۔ ابا جی تو اپنے ٹھیکیداری کے کام میں مصروف رہتے لیکن بی بی جی نے ماں بن کر دکھایا۔ دینیات کا گہرا مطالعہ رکھتی تھیں۔ گلی محلے کی خواتین ان سے دینی مسائل پوچھنے بھی آتی رہتی تھیں۔ مختلف خواتین کو بیرونی شہروں میں بسلسلہ کاروبار مقیم شوہروں اور بیٹوں کے لیے خط بھی لکھ دیتی تھیں۔ محلے کی بچیوں کو قرآن مجید بھی پڑھا دیتی تھیں۔ کچھ لڑکیاں صبح کے پہر میں اور کچھ تیسرے پہر پڑھنے آتی تھیں یوں کم وبیش سارا دن گھر قرآن مجید کی تلاوت سے گونجتا رہتا تھا۔ بی بی جی کی ایک اور شہرت تھی ''لوٹا پھیرنے'' کی۔ جس خاتون کا قیمتی زیور یا کوئی اور قیمتی چیز گم ہوجاتی وہ مشتبہ افراد کے نام لے کر آجاتیں۔ بی بی جی نے مٹی کے ایک کورے لوٹے کے چاروں طرف چاروں فرشتوں کے نام قلم اور سیاہی سے لکھ رکھے تھے۔ لوٹے میں مشتبہ نام کی پرچی ڈال دی جاتی۔ ایک طرف لوٹے کے کنارے کے نیچے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت رکھ لیتیں۔ دوسری طرف مجھے بٹھا کر اسی طرح شہادت کی انگلی رکھنے کے لیے کہتیں اور پھر سورۃ یٰسین اوّل سے بارہویں آیت تک پڑھتیں۔ اگر لوٹا مذکورہ نام پر گھوم جاتا تو متاثرہ خاتون کو بتا دیتیں۔ بہ صورت دیگر دوسرے مشتبہ نام کی پرچی ڈال کر پھر سورۃ یٰسین پڑھتیں۔ اگر لوٹا اس پر گھوم جاتا تو اس خاتون کو مطلع کر دیا جاتا۔ اگر لوٹا نہ گھومتا تو اگلی پرچی ڈال کر یہی عمل دہرایا جاتا۔ اگر کسی پرچی پر بھی لوٹا نہ گھومتا تو متاثر خاتون کو ساری پرچیاں لوٹا دیتیں اور بتا دیتیں کہ کسی پر بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان دنوں میں ابھی نابالغ تھا۔ شاید اس لیے لوٹے کی دوسری جانب مجھے بٹھایا جاتا تھا۔ بعدازاں میں نے ازخود لوٹا اپنی دونوں شہادت کی انگلیوں پر رکھ کر وہی عمل کیا اور حیرت ہوئی کہ میری انگلیوں پر اگر لوٹے نے گھومنا ہوتا تو بہت تیزی سے گھومتا۔

پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ میں اب گورڈن کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ ایف اے کا سالانہ امتحان بھی پنجاب یونیورسٹی ہی لیتی تھی۔ میرے مضامین میں اکنامکس (Economics) کا مضمون بھی شامل تھا جو مشکل محسوس ہوا۔ مجھے سالہا سال کے بعد لوٹا یاد آ گیا۔ میں نے اپنے اکنامکس کے پروفیسر سی، اے، پیٹرز کے مشورے سے چند سوالوں کا گیس (Guess) تیار کیا۔ اس میں سے پانچ سوال لوٹے میں ڈال کر گھمانے کے لیے منتخب کیا۔ لوٹا گھمایا وہ ان سوالوں پر گھوم گیا۔ بہت خوش ہوا۔ سالانہ امتحان کی تیاری کے وقت ان سوالوں پر خاص توجہ دی لیکن جس روز اکنامکس کے پرچے کا امتحان تھا، پرچہ سامنے آیا تو ان میں سے ایک سوال بھی پرچے میں درج نہیں تھا۔ نتیجتاً اکنامکس میں فیل ہوگیا۔ بہت ندامت ہوئی۔ کسی کو بتایا بھی نہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ Supplemant Exam. کی سہولت ہوتی تھی۔ اس میں بیٹھ کر اکنامکس کا مضمون پاس کر لیا۔ میں بعد میں اپنے طور پر سوچتا رہا کہ بی بی جی بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ کچھ سوجھ بوجھ مجھ میں بھی پیدا ہوچکی تھی۔ پھر ہم سے ایسی بات کیوں سرزد ہوئی۔ بہت عرصہ بعد ایک دن ڈاکٹر خالد مسعود سابق صدر نظریاتی کونسل سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ ابا جان سے اس بارے میں پوچھنے کی

نوبت ہی نہیں آئی ورنہ فارسی میں ڈانٹ پڑتی مگر وہاں سے ڈانٹ کیا پڑتی۔ وہ تو مجھے اداس دیکھ کر اکثر کہہ دیتے تھے کہ ''تم اپنے سارے غم مجھے دے دو اور خوش رہا کرو۔''

آمدم برسرِ مطلب مجھے بتایا گیا کہ میں ۱۵؍اکتوبر ۱۹۳۰ء کو بروز چارشنبہ صبح ساڑھے چار بجے رنگون میں پیدا ہوا۔ قرآنی فال سے میرا نام امین تجویز کیا گیا۔ میرے دادا جان میرزا امام بیگ میری پیدائش سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ ان کے اجداد پہلے مغل شہنشاہ بابر کی فوج میں شامل ہو کر ہندوستان آئے تھے پھر یہیں بس گئے تھے۔ مغل افواج کو تربیت یافتہ گھوڑے فراہم کرنے کا کام ان کے سپرد تھا۔ ''گھوڑے پال'' مربعے طے ہوئے تھے اور مجھے بتایا گیا کہ انگریزوں کی عملداری سے پہلے آسودہ زندگی بسر ہو رہی تھی۔ مغل اپنے سپاہی اور اپنے گھوڑے سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغل سپاہی میدان کارزار میں مغل پرچم کو نیچے گرنے نہیں دیتا تھا اور اپنے گھوڑے کو مرنے نہیں دیتا تھا کہ یہ ایک خاص تربیت حاصل کیے ہوئے ہوتا تھا۔ جب دشمن کی فوج براہ راست سامنے آتی تھی تو یہ لگام کے اشارے پر اپنی آگے کی دونوں ٹانگیں یوں اوپر اٹھا کر حملہ آور ہوتا تھا کہ دشمن اپنی شمشیر یا تیر کمان چلانا بھول جاتا تھا اور مغل گھوڑا پل جھپکنے میں اس کا کام تمام کر دیتا تھا اور مغل سپاہی کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ شکست کیا ہوتی ہے۔ پشت پھیر کر بھاگنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ سپاہی چوری کے نام سے ناآشنا تھا اور بے وفائی کا لفظ اس کی سماعت سے کبھی ٹکرایا ہی نہیں تھا۔ یہ تھیں ابتدائی عہد کے مغل سپاہیوں کی خصوصیات۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے کچھ احوال اپنی جنم بھومی کا۔ معروف تاریخ کے مطابق برما یعنی موجودہ مائنمار کا وجود تیرہ ہزار سال پرانا ہے۔ برطانیہ نے ۱۸۸۶ء میں برما کو ہندوستان کا صوبہ قرار دے کر رنگون کو اس کا دارالحکومت بنا دیا۔ پھر رنگون بھی وقت گزرنے کے ساتھ ''ینگون'' میں تبدیل ہو گیا اور ۲۷؍مارچ ۲۰۰۶ء میں وہاں کی ''ملٹری جنتا'' نے ینگون کی جگہ نی پی ایڈو (Naypyidaw) کو نیا دارالحکومت قرار دے دیا، جس کا معنی ہے ''سپاہیوں کا شہر'' میری پیدائش کے وقت رنگون کی کل آبادی چار لاکھ چار سو پندرہ افراد پر مشتمل تھی، ان میں برمی آبادکار ایک لاکھ اکیس ہزار نو سو اٹھاون تھے اور مسلمانوں کی تعداد ستر ہزار سات سو اکانوے تھی۔

واضح رہے کہ ۱۶۳۵ء تک برما کا دارالحکومت ''پیگو'' تھا۔ پھر ''اوا'' منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد رنگون/ینگون اور اب نے پی ایڈو دارالحکومت قرار پایا ہے۔ بہرحال ''رنگون'' اب بھی ''برما'' کی سب سے بڑی اور بارونق بندرگاہ ہے۔

روایت ہے کہ رنگون کے بڑے پگوڑے (بدھ معبد) شیوڈاگون (Shive Dagon) کی بنیاد مہاتما بدھ کی زندگی میں ہی رکھی گئی تھی بعد ازاں مہاراجا اشکوک نے اس کی مرمت بھی کروائی۔ یہ عظیم الشان پگوڈا ۳۶۸۱ فٹ بلند ہے۔ اس کی مخروطی عمارت سب کی سب چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور اس پر نیچے سے اوپر تک سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں۔

رنگون میں مسلم طرزِ تعمیر کی قدیم ترین عمارت سورتی سنّی جامع مسجد ہے جو شوئی بونتھا سٹریٹ

(Shwebontha st.) میں واقع ہے، اسے مغل سٹریٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ۱۸۳۶ء میں ان سورتی تاجروں کے مالی تعاون سے تعمیر کی گئی تھی جو برما میں آباد ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں اینگلو برمی جنگ کے دوران میں یہ شہید ہو گئی تھی مگر سورتی سیٹھوں کے جوش ایمان نے اسے ۱۸۷۱ء میں پھر تعمیر کر لیا۔ اس کا اسلامی طرز تعمیر بھی منفرد ہے۔ اس کے دو مینار ہیں جن میں ترچھی راہداری بنی ہوئی ہے۔ درمیان میں محرابی دروازے کے اوپر گنبد بھی جداگانہ طرز تعمیر رکھتا ہے جو نگاہوں کو بھلا لگتا ہے۔ مسجد کے طرز تعمیر کو ایک جملے میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ ''بہت خوش خط عمارت ہے'' یہاں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ بھی مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی میں جاری رہا۔ وہ بھارت سے بطور خاص بلائے جاتے تھے۔

اب ایک نظر میری والدہ مرحومہ کے آبائی شہر سورت پر بھی جو قدیم ترین ہندو ریاست گجرات کاٹھیاوار کا مشہور بندرگاہی کاروباری شہر ہے۔ نیز بھارت کے تین صاف ترین اور آٹھ بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ ہیروں، سوتی اور ریشمی کپڑے کی تجارت کے لیے مشہور ہے۔ اسے تین عظیم الشان لائبریریوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ لذیذ کھانوں کے لیے بھی یہ آپ اپنا جواب ہے۔ اسی لیے ایک گجراتی کہاوت مشہور ہے کہ ''کھاؤ سورت میں، مرو کاشی میں'' یعنی (سورت نوجمان آنے، کاشی نومرن)

سورت اپنی کئی خصوصیات کے باعث غیر معمولی شہرت کا تاج اپنے سر پر سجائے ہوئے ہے۔ اسے موجودہ بھارت کا تیزی سے پھیلتا ہوا آٹھواں بڑا شہر بھی سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے نوے فیصد ہیروں کی تراش اور پالش کا کام بھی یہیں ہوتا ہے۔ اسی لیے ہیروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ سورت کو سلکی کپڑے کے کارخانوں کے باعث بھی شہرت حاصل ہے۔ چنانچہ یہ Silk city of India کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہاں کے زردوزی کے کام کو بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ عجوبہ روزگار شہر ہے۔ قدیم سنسکرت رزمیہ داستانوں (مہابھارت) میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ پارسی بھی یہاں آٹھویں صدی عیسوی سے آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ایک شخص گوپی ناتھ نے بسایا تھا اور اس کا نام سوریاپور (سورج کا آباد شہر) رکھا تھا۔ پھر ۱۵۳۰ء تک پہنچتے پہنچتے اس کا نام سورت مشہور ہو گیا۔ سولہویں صدی کے اختتام تک یہ پرتگال حکمرانوں کے قبضے میں بھی رہا اور وہ یہاں کی بحری تجارت پر قابض رہے۔ آج کل یہاں ہندو آبادی ۸۷ فیصد ہے اور مسلم آبادی قدرتی طور پر گھٹ کر سات فیصد رہ گئی ہے۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے، یہاں ابتدا ہی سے گجراتی، سندھی، مارواڑی، تامل، تلگو اور اُڑیا زبانیں بولی جاتی ہیں۔

میرے نانا سلیمان ہوّز اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ ''ہوّز'' ایک چھوٹا سا عرب قبیلہ تھا جو ایک عرصے سے یہاں آباد تھا۔ تجارت پیشہ تھا لیکن محدود کاروبار تھا۔ اس لیے رنگون چلا آیا۔ ریشمی لنگیاں (سامنے سے سلی ہوئی دھوتیاں) بنانے اور زردوزی کے کام میں کچھ وسعت پیدا ہو گئی۔ فیکٹری چل نکلی تو قدرے آسائش میسر آ گئی۔ نانا کی دو ہی اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹے کا نام ستار ہوّز تھا جو میرے ماموں تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ مجھے بہت چاہتے تھے۔

جب میں اپنے گارڈین خاندان کے ہمراہ ہوشیار پور جانے کے لیے جہاز میں سوار ہو رہا تھا تو مجھے بندرگاہ تک چھوڑنے آئے اور تحفتاً سونے کی انگوٹھی اور ایک نہایت قیمتی ریشمی رومال دے گئے جو ایک طویل عرصے تک میں ہر عید پر اپنی امی اور ماموں کی یادگار کے طور پر بالترتیب پہنتا رہا اور کوٹ کی بیرونی جیب میں سجاتا رہا اور اپنے نانا کی فیکٹری کی بنی ہوئی زردوزی کے کام سے آراستہ گول اونچی دیوار والی ٹوپی پہن کر میری اتری ہوئی تصویر تو اب تک میرے پاس موجود ہے۔

ایڈورڈ ژسٹریٹ رنگون میں میرے ابا جان میرزا کریم بیگ غلام شبیر کا ''دواخانہ فیض الکریم یونانی'' واقع تھا۔ ہمارے خاندان میں ایک رسم چلی آ رہی تھی کہ جب کوئی فرد شادی کرنے کے بعد خود مختار زندگی کا آغاز کرتا تھا تو وہ نقش بندی سلسلے میں بیعت کی تجدید کرتا تھا۔ حضرت حافظ عبدالکریم نقش بندی سلسلے کے ایک مرشد تھے۔ وہ ایک بار راولپنڈی سے مسلک کی تبلیغ کے سلسلے میں رنگون آئے۔ ابا جان جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے رنگون ہی میں شادی کر چکے تھے۔ لہٰذا انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے بیعت کی تجدید کر لی۔ جب انھیں پتا چلا کہ ابا جان سہارن پور کے مدرسہ مظاہر العلوم سے ''شیخ الحدیث'' کا کورس پڑھے ہوئے ہیں اور رنگون میں اپنے طور پر خاموشی سے تبلیغی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ انھیں اپنا خلیفہ نامزد کر دیا اور تبلیغ کی بھی اجازت دے دی۔ اس طرح دواخانہ بھی چل نکلا اور تبلیغ کا کام بھی منظّم پیمانے پر شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ رب العزت کے پیغام سے برما کے چند دوسرے اہم شہر یعنی مانڈلے، مولمیز، پیگو، باسین اور پروم بھی متعارف ہوئے۔ مگر بعد کے ایام میں حکومت وقت کی طرف سے تبلیغ کی ممانعت کر دی گئی۔

ہندوستان سے رنگون یا مانڈلے جا کر بسنے والوں کو اکثر ایک تکلیف دہ مگر دل چسپ صورت حال پیش آتی تھی۔ ایک تو برمی باشندے انھیں ''زیر آبادی'' کہتے تھے لیکن زیر آبادی کا تلفظ اس طرح کرتے تھے کہ وہ مہاجرین کو ''زہر آبادی'' سنائی دیتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ اس تلفظ پر چونک اٹھتے تھے پھر رفتہ رفتہ عادی ہو گئے پھر جن محلوں میں برمیوں اور ہندوستانیوں کی ملی جلی آبادی تھی وہاں پکوان پر فساد ہو جاتا تھا۔ برمی آبادی ''نپھی مچھلی'' بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ جب برمیوں کے گھروں میں وہ تلی جاتی تو اس سے ایسی بدبو اٹھتی جو ''زہر آبادیوں'' کے لیے ناقابل برداشت ہوتی اور اس پر لڑائی مار کٹائی تک کی نوبت آ جاتی۔ ادھر ہندوستانی جب اپنے ہاں پکی ہوئی دالوں کو بگھار دیتے یا کوئی چیز تلتے تو دیسی گھی استعمال کرتے۔ اس کی بو ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی اور وہ اپنے 'دا'' (گوشت کاٹنے کے چپٹے چھرے) لے کر باہر نکل آتے اور محلے میں فساد کی صورت حال پیدا ہو جاتی۔ غالباً ہمارے ہندوستان لوٹ آنے کے بعد کوئی مفاہمت پیدا ہو ہی گئی۔ کیونکہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے دوران برمی مہاجرین کو بھی محفوظ ترین علاقہ سمجھ کر ہوشیار پور ہی میں بسایا گیا تھا اور وہاں اس نوع کا کوئی فساد نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں دونوں بنا سپتی (وناسپتی) گھی ایجاد ہو گیا تھا جو سات آنے سیر بکتا تھا۔ دیسی گھی ایک روپے سیر تھا۔ یہ اس عہد کے اوزان تھے جو ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی کچھ عرصے تک جاری رہے۔ ایک روپے میں چونسٹھ پیسے یا سولہ آنے ہوتے تھے۔ ایک آنہ

چار پیسوں کا تھا۔ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے۔چار آنھوں کی ایک چونی اور آٹھ آنوں کی ایک اٹھنی کہلاتی تھی۔ ہمارے لڑکپن سے ذرا پہلے ایک پیسے میں دو دھیلے اور تین پائیاں ہوتی تھیں لیکن پائیاں متروک ہو چکی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہوشیار پور بہت تنگ دستی کا شکار رہا۔ ایک تو کرنسی غائب گئی۔ عام خرید وفروخت کے لیے ڈاک کے پوسٹ کارڈ، لفافے اور ٹکٹ استعمال ہونے لگے۔مثلاً حجام کی دکان پر بال کٹوانے کے لیے جانا ہو تو ہم قمیض کی بیرونی جیب میں دو آنے مالیت کے دو لفافے رکھ کر چلے جاتے تھے۔بکری کا گوشت چار آنے سیر تھا۔ایک سیر میں چار پاؤ ہوتے تھے۔ایک پاؤ گوشت ایک آنے یا ڈاک کے ایک لفافے کے عوض خریدا جا سکتا تھا۔

اسی اثنا میں پرچون کی دکانوں سے گیہوں کا آٹا غائب ہو گیا۔مکئی یا باجرے کا آٹا دستیاب تھا۔عام شہری مستقل طور پر یہ آٹا نہ کھا سکتا تھا۔لیکن چار و نا چار کھانا پڑا۔ پھر مکئی کا آٹا بھی غائب ہو گیا۔قریبی دیہات سے کبھی گیہوں یا مکئی کا آٹا دستیاب ہوتا تھا۔ایک روپے کا پندرہ سیر گیہوں کا آٹا اٹھا کر گھر لانا محال تھا۔انھیں دنوں بی بی جی کے چھوٹے بھائی کے تین بچے یعنی دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی برما سے مہاجرت کر کے بی بی جی کے پاس ہی آ گئے تھے۔اب ان کی پرورش اور پرداخت کا بوجھ بھی ابا جی اور بی بی جی پر آن پڑا تھا جو سہنا پڑا۔ بی بی جی کا ایک بھانجا میری عمر کا تھا۔اسے ساتھ لے کر ہم دونوں آٹے کی تلاش میں ادھر ادھر نکلتے۔ہم دونوں عمر کے لحاظ سے بارہ تیرہ سال کے تھے۔آٹے کا بوجھ بمشکل برداشت کر سکتے۔ ہمارے سوا اور گھر میں یہ کام کرنے والا کوئی نہ تھا۔اس لیے خاموشی سے برداشت کرتے۔ادھر ابا جی اور ان کا بڑا بیٹا جسے ہم بھائی صاحب کہتے تھے کام پر جاتے ہندو لالاؤں کی حویلیوں کے رنگ وروغن کا کام کم سے کمتر ہوتا جا رہا تھا۔ ٹھیکیداری سکڑتی جا رہی تھی۔ پھر بعض ایام ایسے بھی آئے کہ آٹا یکسر نایاب ہو گیا۔اس کا حل بی بی جی نے یہ نکالا کہ کابلی چنے اچھی طرح پکا لیے جاتے اور انھیں گھی کا بھگار دے کر کھا لیے جاتے۔مگر بی بی جی کے چھوٹے بھانجے کو ایک روز کابلی چنے ہضم نہ ہو سکے، قے ہو گئی۔اس عزیز نے یوں کابلی چنے کبھی کھائے نہیں تھے۔ پھر ایک روز کابلی چنوں کو بگھارنے کے لیے گھی بھی ختم ہو گیا اور گھر کی مالی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو گئی۔ بی بی جی نے اچار والا مرتبان دیکھا۔اس میں اچار بھی ختم ہو چکا تھا۔مصالحہ ملا تیل باقی تھا۔بی بی جی نے اسی کا بگھار دے دیا۔اس کی خوشبو اور ذائقے نے کابلی چنوں کو وہ لذت عطا کی کہ آج بھی وہ ایام یاد آتے ہیں تو پکے ہوئے کابلی چنوں کو آم کے اچار کا بگھار لذت کام و دہن پیدا کر دیتا ہے۔

پھر یہ دور بھی گزر گیا۔میری ابتدائی تعلیم کا زمانہ بھی ہوشیار پور ہی میں گزرا۔انگریزوں کے عہد میں چوتھی جماعت تک تعلیم لازم تھی۔میونسپل پرائمری سکول میں تعلیم مفت تھی۔ابا جی یعنی میرے گارڈین مجھے کئی روز سے رغبت دلا رہے تھے لیکن میں سکول میں داخلے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ایک دن بی بی جی نے مجھے تیار کر دیا لیکن میں لاڈ پیار میں پرورش پا رہا تھا۔ بی بی جی کا ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگ گیا۔گھر کے سامنے کھلا میدان تھا۔اس میں بھاگنے لگا۔ابا جی میرے پیچھے بھاگے لیکن میں ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔انھوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں میری زبان سے کوئی گستاخانہ جملہ نکلا جس پر ابا جی نے ایک تھپڑ رسید کیا۔ مجھے پہلی بار مار پڑی تھی۔خوب رویا۔ بہرحال سسکیاں بھرتا سکول

روانہ ہوگیا۔ پہلی جماعت میں داخل کرادیا گیا۔ سکول میں بھی کافی دیر تک روتا رہا۔ بہت بعد کے ایام میں احساس ہوا کہ بچوں سے محبت کو نظم وضبط میں لانے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ بعدازاں گھر سے تو کبھی ڈانٹ ڈپٹ تک کی بھی نوبت نہ آئی لیکن سکول میں دوسری جماعت کے اساتذہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ابتدا میں یہ سکول ایک لالا کی نیم تاریک حویلی کی نچلی منزل میں تھا۔ اوپر کی منزل میں کوئی کرایہ دار خاندان آباد تھا۔ نیچے ہی صحن میں ایک طرف خاصی اونچی دیوار کے گھیرے میں بنا ہوا ایک کنواں تھا جو احتیاطاً اوپر سے بھی ڈھانپ کر رکھا گیا تھا۔ خواتین ڈول سے پانی کھینچ کر مٹکوں میں بھر بھر اوپر لے جاتی رہتی تھیں۔

ادھر پہلی جماعت کا کمرہ غالباً روشنی سے مصلحتاً دور رکھا گیا تھا۔ اس کے استاد کا نام لچھمن داس تھا۔ درمیانے قد کا آدمی تھا۔ سر پر ہلکے ہلکے بال اور ان میں ایک بدنما ''بودی'' تھی۔ ایک نیلی دھاری والی قمیض اور ہندوانہ تراش کا خاکی سا پاجاما غالباً ان کا مستقل لباس تھا جس کی دھلائی چنداں ضروری نہیں تھی۔ وہ کمرے میں آ کر دیسی جوتی اتارتے اور کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے۔ قاعدہ آنکھوں کے قریب لا کر پڑھاتے۔ آنکھوں کا میل صاف نظر آتا۔ منہ سے بدبو آتی، جس بچے سے سبق سننا مقصود ہوتا، اسے بدبو بھی سہنا پڑتی اور ماسٹر صاحب سے کان بھی کھنچوانا پڑتے۔ وہ عجیب مخنی سی شے تھے۔ پاس جاتے ہوئے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ دوسری جماعت میں پہنچے تو نسبتاً روشن کمرا ملا۔ کمرا کیا پشت کی سڑک کی جانب کھلنے والا ایک کشادہ گیراج تھا۔ پنڈت دیا شنکر ہمارا استاد تھا۔ جوان آدمی تھا صاف لباس پہنتا تھا یعنی سفید کرتا اور ویسا ہی ہندوانہ تراش کا پاجامہ۔ سر پر پیلی پگڑی باندھتا کھلتی ہوئی رنگت تھی لیکن ماتھے پر لمبا سا زعفرانی قشقہ بڑی باقاعدگی سے کھینچ کر سکول آتا تھا۔ قشقہ بھی عجیب طرح کھینچتا تھا کہ سارے ماتھے پر پھیلا ہوا ہوتا تھا جس سے اچھے بھلے چہرے کا ستیاناس کر دیتا تھا۔ اس نے اپنے پاس رولر رکھا ہوا ہوتا تھا۔ نصف چھٹی کے بعد تختی پر پہاڑے لکھنے اور زمانے سنانے کا پریڈ ہوتا تھا۔ پون اور ڈیڑھ کا پہاڑا سناتے وقت اس کے ڈنڈے سے بچنا محال تھا۔ ابھی ہم دسری جماعت میں ہی تھے کہ پرانے سکول سے ذرا فاصلے پر میونسپل کمیٹی نے نیا سکول بنا دیا اور پورا سکول اس میں منتقل ہوگیا۔ کشادہ سکول، روشنی بھی تھی اور ٹاٹ بھی نئے تھے لیکن ایک نقصان بھی ہوا۔ سابقہ سکول میں ہمارے دوسری جماعت کے کمرے کے پہلو میں ایک اور بڑا سا گیراج نما کمرہ تھا جس میں خشک پوستوں سے بھری ہوئی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر اوپر کے حصے میں ٹین لگا ہوا تھا اور نچلے حصے میں سلاخیں تھیں جن میں سے ہمارے چھوٹے چھوٹے ہاتھ آسانی اندر جا سکتے تھے۔ بوریوں کے منہ پر رسیاں (سیبا) بندھی ہوتی تھیں۔ ہم نصف چھٹی کے وقت وہاں جاتے۔ رسیوں کا ایک حصہ کھول لیتے اور خشک پوست باہر نکال کر انھیں توڑ لیتے۔ وہ خشخاص سے بھرے ہوتے۔ خشخاص نکال کر کھا لیتے اور پوست وہیں نالی میں پھینک دیتے۔ یہ مشغلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ حویلی کے مالک کا غالباً پوست بیچنے کا کاروبار تھا۔ وہاں رکھی ہوئی بوریاں بک جاتی اور ان کی جگہ نئی بوریاں آ جاتیں۔ حویلی کا مالک کوئی فراخ دل تھا۔ چند بوریوں سے خشخاص ضائع ہونے کی اسے پروا نہیں تھی۔

نئے سکول میں ہر جماعت کے دو دو تین سیکشن بنا دیے گئے۔ وہاں ہم پنڈت دیا شنکر کے ''سایہ عافیت'' سے محروم ہو کر ماسٹر شیر سنگھ کے ''سایہ شفقت'' میں آ گئے۔ چھے فٹ کا گٹھے ہوئے جسم والا جوان تھا۔ اسے ساتھ آٹھ کے بچوں کو رولر سے مارنا گوارا نہیں تھا۔ وہ سزا کے طور پر اپنا مکہ استعمال کرتا۔ مکے کے ابھار والی ہڈیاں جب طالب علم کی پیٹھ پر پڑتیں تو ایک ثانیے کے لیے سانس رک جاتی۔ سبق بھول جاتا اور ماسٹر شیر سنگھ سزا دینے کا لطف لیتے ہوئے کہتا۔'' ڈھیمبر گیا! ڈھیمبر گیا'' اس کا انگریزی میں ترجمہ درکار ہو تو: Bewildered " کیا جا سکتا ہے۔ پھر مجھے C سیکشن میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک اور ماسٹر حفیظ ہماری گوشمالی کے لیے موجود تھے۔ وہ پہلے ایک غلیظ سی گالی ارشاد فرماتے پھر ماسٹر شیر سنگھ کی ہی پاور سے مکہ پیٹھ پر مارتے۔ حسب سابق سانس رک جاتی۔ حالت سنبھلتی تو احساس ہوتا کہ موت آئی تو اس سے زیادہ اذیت ناک کیا ہوگی۔ میں بھی دوسرے بچوں کی طرح گھر جا کر ابا جی یا بی بی جی سے قطعی ذکر نہ کرتا۔ نالائق تو نہ تھا لیکن ان اساتذہ کرام کی بلاوجہ سزاؤں کے خوف سے سبق اور پہاڑے بھول جاتا۔ نتیجتاً دوسری جماعت کے سالانہ امتحان میں فیل ہو گیا۔ گھر میں کوئی غیر معمولی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ دوسری جماعت دُہرائی گئی اور پھر تیسری جماعت میں پہنچے جس کے سربراہ ماسٹر اسمٰعیل تھے۔ وہ شکل وصورت سے ہی کرخت سے نظر آتے تھے۔ وہ بچوں کو سزا دینے کے لیے خالصتاً دیسی طریقے سے کام لیتے تھے یعنی ''جوتا کاری'' سے۔ وہ اس بات سے قطعی بے نیاز تھے کہ ایک آٹھ سال کے طالب علم کی بھی کوئی عزتِ نفس ہوتی ہے۔ ''طوعاً و کراہاً'' ان کی کارکردگی بھگت کر چوتھی جماعت میں پہنچے جسے ہیڈ ماسٹر احمد دین پڑھاتے تھے لیکن ماسٹر اسمٰعیل کی کارکردگی کا ایک ثبوت یعنی املا کا کاپی ایک صفحہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔ میری املا کے صفحے پر ان کے دستخط بھی موجود ہیں اور میری لکھی ہوئی غلط املا بھی جوں کی توں ہے۔

☆

مارگریٹ ایٹ ووڈ/ارشد محمود

انجام بخیر

[مارگریٹ ایٹ ووڈ ۱۹۳۹ء میں اوٹاوہ میں پیدا ہوئیں۔آپ کے تیس سے زائد شاندار ناول،نظمیں،مضامین اور کہانیاں شائع ہو کر آپ کی ادبی حیثیت منوا چکے ہیں۔بطورِ ایک اہم نقاد کے انھوں نے معاصر کینیڈین ادب کو متعارف کرانے اور اس کی حدود متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔شمالی امریکہ اور اس سے باہر بھی خواتین تخلیق کاروں میں امتیازی شہرت رکھتی ہیں۔

آپ کو کئی دوسرے اعزازات کے علاوہ گلر Giller پرائز،بکر Booker پرائز سے بھی نوازا گیا۔مارگریٹ نے اپنی تجرباتی کہانی "Happy Endings" انجام بخیر،خوشگوار اختتام کے متعلق لکھا کہ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ یہ کس قسم کی تخلیق تھی۔نہ تو یہ نظم تھی نہ ہی شارٹ اسٹوری،نہ ہی یہ تلخیص تھی نہ تبصرہ اور نہ ہی کوئی سوالنامہ اس کے اندر اخلاقی حکایت،ضرب المثل یا پھر قولِ محال جیسی کوئی خوبی یا خصوصیت بھی نہیں تھی۔مروجہ روش سے ہٹ کر بس الگ ہی قسم کی کوئی چیز تھی۔اسے تحریر کرتے ہوئے مجھے باطنی نشاط اور شادمانی کا کچھ ایسا احساس ہوا جسے کہ میں سب سے آنکھ بچا کر صاف دیوار پر کچھ مبہم لکیریں ڈال رہی ہوں۔پھر وہ کہتی ہیں کہ مجھے یہ جان کر کچھ مایوسی ہوئی کہ کچھ دوسرے لوگوں نے اسے میٹا فکشن (Metafiction) سے موسوم کر رکھا تھا اور اس کے قواعد وضوابط بھی متعین کیے جا چکے تھے۔]

جان (John) اور میری (Mary) کی ملاقات ہوتی ہے۔

پھر کیا ہوتا ہے؟

اگر آپ خوشگوار انجام کے متمنی ہیں تو پھر پلاٹ اے (A) کو آزمایئے۔

اے (A)۔ جان اور میری محبت میں گرفتار ہوتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔اُن دونوں کی زندگی بڑی بامصرف ہے کیوں کہ اُن کے پاس بہترین نفع بخش ملازمتیں ہیں وہ ایک خوبصورت مکان خریدتے ہیں۔پراپرٹی کی قیمتیں بڑھنے سے وہ اور خوشحال ہو جاتے ہیں۔آخر کار جب وہ اس قابل ہوتے ہیں تو اُن کے ہاں دو بچوں کی پیدائش ہوتی ہے۔اُن کے بچے بہت ہی خوبصورت اور پیارے ہیں وہ بھی بچوں کے شیدائی ہیں۔جان اور میری کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہے اُن کے وفادار دوست ہیں وہ اکٹھے چھٹیاں گزارنے لمبی سیر کو نکلتے ہیں۔دونوں کے مشاغل بھی زندگی سے بھرپور ہیں۔زندگی میں کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہے۔آخر کار اُن کا انتقال ہو جاتا ہے اور یہی ہے اس کہانی کا اختتام۔

بی (B)۔ میری جان سے یک طرفہ محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے مگر جان میری کے لیے ایسے جذبات نہیں رکھتا۔وہ اپنی انا

کی تسکین اور ذاتی خوشی کے لیے صرف اس کا جسم استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کے اپارٹمنٹ کے ہفتے میں دو بار چکر لگاتا ہے وہ اس کے لیے پُر تکلف ڈنر کا اہتمام کرتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اُسے تو اس کے محبت کے خمیر سے تیار کیے ہوئے کھانوں کی بھی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں وہ شکم سیر ہونے کے بعد اس سے جسمانی لذت کشید کر کے گہری نیند سو جاتا ہے جبکہ اس دوران مَیری سارے گندے برتن صاف کرتی ہے تاکہ جان یہ تاثر نہ لے کہ وہ سُست اور پھوہڑ ہے اور سارے گندے برتن اردگرد جمع کیے بیٹھی ہے۔ برتن دھونے کے بعد وہ لپ اسٹک ہونٹوں پر تازہ کرتی ہے تاکہ وہ اچھی دکھائی دے۔ مگر جب وہ بیدار ہوتا ہے تو وہ اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اپنے کپڑے زیب تن کرتا ہے، ٹائی درست کرتا ہے جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر جاتا ہے اور جب وہ دوبارہ میری کے پاس جاتا ہے تو وہ پھر کچھ اسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرتی ہے کہ گویا وہ اس کے فراق میں مری جا رہی ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جنسی لذت کے حصول کی خواہش مند ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ اگر اکثر اوقات باہم ملاقاتیں کرتے رہے تو جان اس کا یوں عادی ہو جائے گا کہ آخر کار وہ شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے لیکن جان کا رویہ اس کے برعکس یوں ہے کہ وہ بغیر شب بخیر کہے دروازے کو زور سے بند کرتے ہوئے رخصت ہو جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر اس کی طرف ایک نگاہِ محبت بھی نہیں ڈالتا۔ تین یوم کے بعد جب وہ چھ بجے دوبارہ آتا ہے تو سارا معمول دہرایا جاتا ہے۔

مَیری کی حالت دگرگوں ہے، سب لوگ جانتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ زیادہ رونا اس کے چہرے کو خراب کر دے گا۔ اس حقیقت کا علم تو اسے بھی ہے مگر کیا کرے کہ روئے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے دوست اُسے بتاتے ہیں کہ جان تو ایک چوہا ہے وہ ایک سور اور کتے کی طرح ہے۔ وہ اس کے لیے مناسب اور اچھا آدمی ہرگز نہیں ہے لیکن اس کا دل ان سب باتوں پر یقین کرنے کو آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس جان کے اندر کوئی دوسرا جان چھپا ہوا ہے جو کہ نہایت ہی عمدہ انسان ہے اور یہ ایسے ہی اندر سے برآمد ہوگا جیسے خول سے ریشم کا کپڑا، صندوق سے جیک یا پھر خشک آلوچے سے گٹھلی نکلتی ہے۔

پھر ایک شام جان اس کے تیار کیے ہوئے کھانے پر ناک بھوں چڑھاتا ہے یہ خلاف معمول ہے کیوں کہ اس سے پہلے تو کبھی اُس نے کھانے کی شکایت نہیں کی تھی، آج مَیری کا دل زخمی ہو گیا۔

اُس کے دوست ایک دِن اُسے اطلاع دیتے ہیں کہ جان کو ایک دوسری عورت کے ساتھ ہوٹل میں دیکھا گیا ہے جس کا نام میج (Madge) ہے۔ جان میری کو تو کبھی ہوٹل نہیں لے کر گیا تھا۔ مَیری تمام خواب آور اور اسپرین کی گولیاں جو اسے ملتی ہیں اکٹھی کرتی ہے اور ساتھ ہی آدھی بوتل شیری کی بھی اُٹھا لیتی ہے۔ آخری وقت بھی اُس نے وہسکی کو ترجیح نہیں دی اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی عورت تھی۔ وہ جان کے لیے ایک پیغام چھوڑتی ہے۔ اُسے

قوی امید ہے کہ وہ اس کے عمل سے آگاہ ہو کر اُسے فوراً بروقت اسپتال لے کر جائے گا اور اپنے طرزِ عمل پر اظہارِ ندامت بھی کرے گا اور یوں ان کی شادی بھی ہو جائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

جان اور میج رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ باقی سارے معاملات پلاٹ اے جیسے ہی ہیں۔

سی (C)۔ جان ایک عمر رسیدہ شخص ہے، مَیری کے ساتھ گرفتارِ محبت ہوتا ہے اور مَیری جس کی عمر ابھی صرف بائیس برس ہے اُس کے لیے ہمدردی محسوس کرتی ہے کیوں کہ وہ اپنے بالوں کے تیزی سے جھڑنے کی وجہ سے بہت پریشان ہے اگرچہ وہ اس کے ساتھ محبت نہیں کرتی مگر پھر بھی اس کے ساتھ ہم بستری کرتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ مصروفِ کار رہتی ہے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اس کی محبت کسی اور کے لیے ہے جس کا نام جیمز ہے جو کہ اس کا ہم عمر ہے اور ابھی تک متاہل زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں ہے اس کے برعکس جان طویل عرصے سے معاملاتِ زندگی میں پیوست ہے۔ یہی بات اس کے لیے پریشانی کا باعث ہے جان کے پاس معقول اور قابلِ احترام ملازمت بھی ہے اور وہ اپنے حلقۂ عمل میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن میری اس سے بالکل بھی متاثر نہیں ہے وہ تو بس جیمز سے متاثر ہے جس کے پاس موٹر سائیکل ہے اور موسیقی کا حیرت انگیز ذخیرہ بھی۔ جیمز جب فری ہوتا تو اکثر اپنے موٹر سائیکل پر دور جزیروں پر نکل جاتا۔ مگر لڑکیوں کو تو ایسی آزادی میسّر نہیں ہوتی۔

میری نے صرف جمعرات کا دن جان کے لیے وقف کیا ہوا ہے اور وہ جمعرات کی شام جان کے ساتھ بسر کرتی ہے۔

جان ایک خاتون کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتا ہے جس کا نام میج ہے اُن کے دو بچے ہیں ایک خوبصورت گھر جو کہ اُنھوں نے اس وقت تعمیر کر لیا تھا جب زمینوں کی قیمتیں ابھی زیادہ نہیں بڑھی تھیں۔ اُنھیں جب بھی فارغ اوقات میسر آتے ہیں تو وہ نشاط انگیز عملی مشاغل میں محو ہو جاتے ہیں۔ جان میری کو اکثر یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ مگر بلاشبہ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ نہیں سکتا کیوں کہ ذمہ داری بہرحال ذمہ داری ہے اور وہ اس پر ضرورت سے زیادہ ہی زور دیتا ہے۔ میری کے لیے یہ سب کچھ بیزار کن ہے لیکن یہ بوڑھا آدمی اُسے لمبے عرصے تک سنبھال سکتا ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ خوشگوار وقت بسر کرتی ہے۔

ایک دن جیمز اپنے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر بادِ نسیم کے جھونکے کی طرح آنکلتا ہے اور اپنے ساتھ اعلیٰ درجے کی کیلیفورنیا وہسکی بھی لے آتا ہے۔ جان اور میری آپ کی سوچوں سے بھی زیادہ بلندیوں کو چھوتے ہیں جب کہ وہ بستر پر دراز ہوتے ہیں۔ ہر چیز خوشگوار محسوس ہوتی ہے لیکن اسی دوران دروازہ کھلتا ہے اور جان اندر داخل ہوتا ہے کیوں کہ اس کے پاس میری کے فلیٹ کی چابی موجود ہے وہ انھیں مدہوشی کے عالم میں آپس میں بیل کی طرح لپٹے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ میج کا سوچتے ہوئے بمشکل ہی خود کو حسد یا رقابت کی حالت میں پاتا ہے۔ تاہم تنہائی میں وہ اس کیفیت پر قابو پا لیتا ہے آخر

کا روہ ایک ادھیڑ عمر آدمی ہے اور آئندہ برسوں میں اس کا سر ایک انڈے کی طرح صاف ہو جائے گا۔ مگر وہ اس پر قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ کہتے ہوئے ایک بندوق خریدتا ہے کہ اسے نشانہ بازی کی مشق کے لیے اس کی ضرورت ہے..... یہ اس کے منصوبے کا سب سے کمزور حصّہ ہے لیکن اس سے تو بعد میں نمٹا جا سکتا ہے..... اور پھر وہ ان دونوں کو شوٹ کر کے خود کو گولی مار لیتا ہے۔

میج تھوڑے عرصے کے سوگ کے بعد ایک سمجھدار آدمی جس کا نام فریڈ ہے اُس کے ساتھ شادی کر لیتی ہے اور ہر چیز اسی طرح رواں دواں ہے جس طرح کہ پلاٹ (A) میں تھی۔ پس تبدیلی ہے تو صرف ناموں کی!

ڈی (D)۔ فریڈ اور میج کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں۔ اُن کی گزر بسر خاصے اچھے طریقے سے ہو رہی ہے اور وہ مستقبل میں آنے والی کسی بھی مشکل سے نمٹنے کے لیے اچھی طرح تیار ہیں۔ مگر اُن کا خوبصورت مکان ساحلِ سمندر سے ہمکنار ہے پھر ایک دِن خوفناک سمندری طوفان اُن کے مکان کی طرف بڑھتا ہے۔ جائیدادوں کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ باقی کہانی کا تعلق اس سمندری لہر کی تباہی سے ہے اور اس بات سے کہ وہ اس سے کیسے بچتے ہیں۔ اس طوفانِ بلا خیز میں ہزاروں غرقاب ہوتے ہیں مگر فریڈ اور میج کی خوش قسمتی ہے کہ آخر کار ایک اونچے ٹیلے پر وہ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے اس حالت میں پڑے ہوتے ہیں کہ وہ بھیگے ہوئے ہیں۔ پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں اور وہ اپنے بچ جانے پر شکر گزار ہیں۔ باقی سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ (A) اے میں ہوتا ہے۔

اِی (E)۔ جی ہاں! سب کچھ ٹھیک ہے مگر فریڈ دل کا مریض ہے اس کے بعد کی کہانی یہی ہے کہ وہ کیسے آپس میں محبت اور اتفاق سے زندگی بسر کرتے ہیں یہاں تک کہ فریڈ کا انتقال ہو جاتا ہے پھر میج خود کو خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ اُس وقت تک کہ جب تک پلاٹ (A) والے انجام سے اُس کا سامنا نہیں ہو پاتا۔ اگر آپ پسند کریں تو آخر میں یہ میج ہی ہو سکتی ہے۔ ''سرطان زدہ''، ''قصوروار اور پریشان'' اور پرندوں کو دیکھتے ہوئے!

ایف (F)۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ یہ سب نہایت ہی ادنیٰ اور متوسط درجے کے لوگ ہیں تو جان کو ایک انقلابی باغی تصور کیجیے اور اس کے مقابلے میں میری کو جاسوسی کرنے والی سراغ رساں اور پھر دیکھیے کہ یہ آپ کو کہاں تک لے جاتے ہیں مگر یاد رکھیے یہ کینیڈا ہے۔ اس کہانی کا انجام بھی اے (A) جیسا ہی ہوگا۔

اگرچہ درمیان میں آپ کو پُر جوش وابستگی والی، پُر شہرت، غل غپاڑے اور چیخ و پکار سے بھرپور رزمیہ داستاں مل سکتی ہے اور ایک ایسی سرگزشت جو کسی حد تک ہمارے اپنے عہد سے مشابہت بھی رکھتی ہو۔

آپ جیسے چاہیں زندگی کو تراشیں۔ آپ کو اس صورت حال کو سامنا ضرور کرنا پڑے گا کیوں کہ انجام تو سب کا ایک جیسا ہی ہے۔ کسی بھی دوسری قسم کے انجام کے جھانسے میں مت آنا۔ وہ سب جعلی ہیں یہ الگ بات ہے کہ یا تو جان

بوجھ کر اُسے اپنی کینہ پرور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اُسے نقلی روپ میں ڈھالا گیا ہے یا پھر اپنی حد سے بڑھی ہوئی رجائیت پسندی کی وجہ سے ایسی ترغیب دی گئی ہے اگر وہ مکمل طور پر مغلوب الحالی کی کیفیت نہیں ہے

''صرف ایک ہی مستند اور معتبر انجام یہاں پیش کیا جاتا ہے:

جان اور میری کا انتقال ہو گیا۔

جان اور میری فوت ہو گئے۔

جان اور میری دنیا سے منہ موڑ گئے''۔

انجام کے لیے اتنا سب کچھ مگر آغاز تو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوا کرتا ہے اور حقیقی صاحبِ نظر اور نکتہ شناس ان دونوں کے مابین اعتدال اور وسعت کی سہولت سے بھی آگاہ ہوتے ہیں مگر کسی بھی چیز کو کام میں لانا نہایت کارِ دشوار ہے۔ ان تمام پلاٹوں کے متعلق جو کہ بہر حال ایک کے بعد ایک وقوع پذیر ہوتے ہیں، تقریباً یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ اب کیا ہوتا ہے اس کے بعد کیا اور پھر اس کے بعد کیا؟.....

مگر اب کیسے اور کیوں کو بھی تو آزمایئے!

☆

پروین ملک/ زاہد حسن

میں نے انھیں کیوں مارا؟

[پروین ملک (۸/اگست ۱۹۴۶ء) پنجابی اور اردو کی مشہور کہانی کار ہیں۔ ان کی پنجابی کہانیاں ''کیہ جاناں میں کون؟'' اور '' نکے نکے دکھ'' کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ اردو ناول ''آدھی عورت'' جب کہ ارون دھتی رائے کے ناول کا ترجمہ ''سسکتے لوگ'' کے نام سے سامنے آیا۔ حال ہی میں ''کسیاں دا پانی'' کے نام سے ان کی آپ بیتی چھپی ہے۔ زیر مطالعہ کہانی بالکل منفرد موضوع پر لکھی گئی ہے۔ جسے عام طور پر لکھنے والے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نہایت باریک بینی تجزیہ ہے۔]

مصالحہ بھونے جانے کی خوشبو سے میری ہلکی بھوک اب تیز ہو چلی تھی۔ خود پکا کر کھنا ہو تو کئی بار بھوک برداشت کرنا پڑتی ہے۔ میں تیز تیز چمچ ہلا رہی تھی۔ اچانک میرے سامنے سے ایک سایہ سا لہراتا ہوا گزر گیا کہ مجھے ایک زرد سے رنگ کی جھلک ہی دکھائی دی میرا ہاتھ وہیں رک گیا۔ جلد سے بائیں طرف دیکھا تو اس نے دیوار کے پاس پہنچ کر پھر میری طرف رخ کر لیا تھا۔ لیکن اب اس کی اڑان اونچی تھی۔ چھت کے ساتھ اُڑتے اُڑتے اس سے نیچے ہو کر کھڑکی کے شیشے سے ٹکر ماری اور ذرا سا لڑکھڑانے کے بعد اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں نے جلدی سے ہانڈی میں پانی ڈال کر ڈھکنا دیا اور سوچا کہ ایسے باہر نکال دوں۔ اِدھر اُدھر دیکھا جب کچھ اور نہ ملا تو اخبار گول کر کے ڈنڈا سا بنا لیا۔ کھڑکی کی طرف بڑھی تو پتہ چلا کہ وہ تین تھے۔ دو نے کھڑکی کی نکڑ میں ڈیرا لگایا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ سر جوڑ کر کسی صلاح مشورے میں لگے ہیں۔

۔۔ ہیں۔۔۔ یہ یہاں چھتا تو نہیں بنانے لگے۔ یہی وقت ہے انھیں روکنے کا نہیں تو پھر انھوں نے قریب نہیں آنے دینا۔ مجھے خیال آیا تو ایک قدم آگے بڑھی۔ وہ سروں کو گول گول گھمارے، پھر ان کی اگلی ٹانگیں مشین کے مانند چلنے لگتیں جیسے کوئی شئے سیدھی کی جا رہی ہو۔ پھر بیٹھے بٹھائے پروں کو اتنی تیزی سے گھماتے کہ ''بھیں'' کی ہلکی سی آواز چاروں جانب پھیل جاتی۔ کچھی دیر بعد وہی گھومتے سر۔۔۔

میں ہاتھ میں اخبار کا ڈنڈا پکڑے یہ تماشا دیکھتیں جا رہی تھی اچھا تو یہ چھتے کی بنیادیوں مضبوط کرتے ہیں کہ اندھی طوفان بھی اس کی بنیاد نہ ہلا سکے۔ یوں دیکھنے میں نازک سی شاخ پر کھلے پھول سا چھتا۔ دور سے لگے ذرا سا پھونک مارو تو گر پڑے گا لیکن جب گرانے لگے تو کتنا زور لگانے پر وہ شاخ وہین کی وہیں رہ جائے۔ پر اسے گرانے کے لیے پہلے نز ہر بھرے ڈنگ رکھنے والوں سے نبٹنا پڑتا ہے جو معمولی سے شک کی صورت مین تیر کے مانند سیدھے آپ پر جھپٹ پڑتے ہیں اور پھر آپ کا ناک منہ، سر، ہاتھ جو عضو بھی سامنے آ جائے اس کی خیر نہیں، کئی بار تو ڈنگ وجود میں کھٹبھا رہ جاتا ہے اور ڈنک مارنے والا

تو اپنی جان سے جاتا ہی ہے آپ کے وجود میں گھتے دنک کا زہر لہراتا پھیلنے لگ پڑتا ہے۔ مجھے بچپن میں سہے ڈنک یاد آ گئے اور ایک بجھارت بھی۔

آر کی دو پار کیں
بٹیاں بڑی سردار کیں
دانت سے بیٹھ کشیدہ کریں
سوٹیاں ماریں قہر بھریں

یہ زہری کب سے ہمارے ساتھ ہیں پیچھے پرت کر دیکھیں تو انسان کے معلوم کی حدوں تک ان کی موجودگی کی خبر ملتی ہے۔

وہ دونوں سر جھکائے اپنے کام میں لگے تھے اور تیسرا جیسے شیشے سے چمٹ گیا ہو نہ ہل نہ جل۔

''اس اکیلے کو مارنا آسان لیکن اسے ماروں تو دوسرے دونوں نہ مجھے کاٹنے دوڑ پڑیں، میں سوچ رہی تھی۔ ایک خیال یہ آئے یہ دنگ بھرے ہیں۔ ان کے تو پیدائشی ہی ڈنگ ہوتے ہیں۔ انھیں محنت مشقت کے لیے ہی پیدا کیا جاتا ہے۔''

پھیر ایک پرانی بیتی یاد آ گئی۔ بہار آ چلی تھی۔ نئے پھوٹتے پتوں کی ہریالی سے سارا ماحول چمکتا دکھائی دیتا۔ بیری کا درخت پور سے لدا ہوا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کچھ اڑتیں۔ اڑ کر باہر چلی جاتیں۔ اور ان کی جگہ دوسری آ جاتیں۔ لگتا بیری پر ان کا کوئی میلہ لگا ہوا ہے۔ ہم سبھی بچے سہمے سہمے سے ان کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ یہ کسی سے چمٹ جائیں تو وہ بھلا بچ سکتا ہے؟ میں نے ماں سے پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ ''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ان سبھی کے ڈنک بھر چکے ہیں۔ اور یہ انے چھتے کے لیے میٹھا جمع کر رہے ہیں'' یہ مجھے پتہ تھا کہ بیری کے بور کا پھول چاٹو تو میٹھا لگتا ہے۔ لیکن ان بھرے ڈنکوں والوں نے اس کا کیا کرنا ہے اس کا پتہ بعد میں چلا۔ اس وقت تو یہ ہوا کہ ایک دنگ بھرا تھکا ماندا میرے ہاتھ پر آن بیٹھا۔ میں نے ہاتھ جھٹکا تو دنک میرے وجود میں کھبھ گیا تو مجھے سمجھ آ گئی کیہہ بیچ بیچ ڈنکوں والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کے جمع کیے گئے میٹھے کی خبر یوں ملی کہ ایک روز دو تین بچوں نے نمار دھڑ کر کے چھتا گرایا۔ اس کے ادھے سے زیادہ خانے بند تھے میں پاس سے گذری تو ایک نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بی بی مصر مشری کھاؤ گئی؟۔

''آپ کہاں سے لائے ہیں مشری؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا تو وہ بتانے لگے، چھتے میں سے ملتی ہے۔

''چھتے میں سے؟'' میں حیران ہو کر بولی۔

ایک بچے نے بند خانے کی سیل توڑی اور مشری کی جو کے برابر کی ایک قلم میری زبان پر رکھ دی، اس میں زہر نہ

ہو‘ مین چکھتے ہوئے جھجھک رہی تھی۔ کھاؤ ناں جی، بہت میٹھی ہوتی ہے‘‘ مشری دینے والی نے میری ہمت بڑھائی تو میں نے وہ قلم زبان پر رکھ لی۔ بہت بڑھیا مشری تھی۔ لطف آ گیا لیکن یہ سوال اپنی جگہ چھتے میں مشری کا کیا کام؟

آج ڈنک بھروں کو مارنے کے لیے ڈنڈا پکڑے کھڑی میں جانتی تھی چھتا بنانے کا کام ختم کر کے ڈنک بھرے پھولوں میں سے میتھا اکھٹے کرنے چل پرتے ہیں اور لا کر خانے بھرتے جاتے ہیں پھر مادہ سبھی خانوں میں انڈے دیتی چلی جاتی ہے اور یہ اسے سیل کیے جاتے ہیں۔ انڈوں مین سے لاوہ سے نکل کر مشری کھا کھا کر برے ہوتے رہتے ہیں۔ جب ان کے پر پھوٹ پرتے ہیں تو زور لگا کر بند خانے کی چھت پھر کر چھوٹے دنک بھرے باہر نکل آتے ہیں۔ اندے دینے والی مادہ کے پاس دنک بھی ہوتا ہے۔ اور اختیار بھی، کہ اُس کے انڈوں میں سے کتنے ڈنک بھرے نکلیں گے اور کتنے ڈنک والے اس کا صرف اسے ہی پتہ ہوتا ہے دنک بھرے کامے تو محض کام کیے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر وہ وقت آتا ہے جب مشری سے بھرے بند خانے اور ان مین اپنی تقدیر کے منتظر محض انڈے رہ جاتے ہیں تو مادہ دنک مار مار کے اپنی دانست مین اضافی ڈنک بھروں کی زندگی ختم کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ تو کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اب ان کی کیا ضرورت کتنے کام رکھنے اور کتنے کامے مارنے، یہی چھوٹی سے مادہ کے دماغ میں کہیں محفوظ ہوتا ہے۔ کام کرنے والوں کا کیا اور پیدا ہو جائیں گے۔ بند خانوں میں سے نکالے کاموں کو ایک ہی برنمشری کا کھانے کو ملتی ہے، پھر کام ہی کام اور آخیر کار موت۔

ہانڈی پک گئی تھی، میں نے چولھا بند کر دیا۔ ڈنک بُھرے بھی لگتا کام ختم کرنے کے بعد اُڑنے کی تیاری میں تھے۔ میں نے اچانک دونوں اکٹھے بیٹھے ڈنک بھروں پر وار کیا۔ ایک نے تو خاموشی سے موت قبول کر لی اور اس کی نعش نیچے آن گری، دوسرا تڑپتا ہوا کھڑکی کی جالی سے آن لگا اور ایک ہی ضرب سے وہ بھی مر گیا۔ تیسرا جو پہلے یوں کچن میں اُڑتا پھرتا تھا اور پھر شاید شیشے کے ساتھ چمٹا کام کرنے والوں کی نگرانی کر رہا تھا، سب اُڑانیں بھول بھال شیشے کے اوپر اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ اسے شاید یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کے پر بھی ہیں۔ کیا پتا ڈنک بھی ہو۔ میں اسے چوکوں کی نکروں اور سلاخوں میں چھپنے سے روک رہی تھی کہ وہ میرے نشانے پر آ جائے۔ اس کی بھاگ دوڑ دیکھ کر مجھے ترس آنے لگا کیوں نہ اسے زندہ کو باہر نکال دوں۔ میں نے ایک پل کے لیے سوچا، لیکن وہ ڈنک بھرے بھی تو ان کے لیے چھتا بناتے ہیں، ہڈی توڑ مشقت کر کے ان کے لیے مصری کی کوٹھیاں بھرتے ہیں ان کو کوئی ہوش نہیں وہ نہ ہوں تو یہ ڈنک والے کیا کریں؟‘‘

مضبوط من سے میں نے ایک ہی ضرب لگائی اور اس نے دوسرا سانس نہ لیا۔

☆☆☆

ولیم شیکسپئیر رسعید اکرم

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

[All the world is a stage]

یہ زندگی اسٹیج ہے
یاں مرد ہوں یا عورتیں، سارے فقط کردار ہیں
آتے ہیں اِک ہی راستے اور کھیل اپنا کھیل کر
سب دوسری جانب کے دروازے سے جاتے ہیں نکل
اِس کھیل کے دوران، ہر کردار وقفے بعد اپنا
رنگ لیتا ہے بدل
اس سات رنگے کھیل میں،
آغوشِ مادر میں پڑا، پہلے وہ نومولود اِک
روئے کبھی، گہ منہ بسورے
دودھ ہونٹوں سے لگائے اور پھر وہ دے نکال
تب وہیں پہ دیکھتے ہی دیکھتے
معصوم، اِک بچہ وہی
اسکول جاتا، چاند چہرہ
چھوٹے سے کندھے پہ بستہ
ڈرتا اپنے ماسٹر سے، پھول گالوں پر کئی موتی لیے
قدرت کا شہ کارِ حسیں _____! تو
آنکھ تب میچی نہیں کہ اب وہی گبھرو جواں
سینے میں شعلے آگ کے
بھٹی میں، گویا عشق کی جلتا، کسی محبوب کو آواز دیتا
آہ بھرتا _____ اس کی آنکھوں کی غزل کہتا ____
وہ بُت صورت اداس ____ اب

دیکھیے اسٹیج پر اس کے بجائے
سینہ تانے اِک سپاہی فوج کا
اپنے وطن کے واسطے جان و بدن کا حلف دیتا
ایک چیتا غیظ کے عالم میں منھ کھولے کھڑا
توپ سے بھی آج ٹکرا جائے گا
عزت و ناموس اور شہرت کا خواہاں
دیکھیے اب تازہ منظر
جب وہی کڑیل جواں، پل میں
ادھیڑ عمری کی چادر اوڑھتے اسٹیج پر موجود ہے
تھوڑا سا ابھرا ہوا پیٹ اور وہ ایک غنچے کی طرح ریشِ تراشیدہ لیے
ڈھیلی سی اِک پتلون میں
جیسے وہ منصف ہو کوئی اور عقل و دانش کی کوئی تصویر ہو ___ تو
پھر ادھیڑ عمری وہی
اِک عالمِ پیری کی سرتاپا جھلک، وہ
آنکھ کے آگے سے گرتی، ناک پر آ کر رُکی عینک
وہ پل پل کانپتی ٹانگیں، نحیف و ناتواں آواز
آخر دیکھیے اس عالمِ پیری کے اندر سے نکل آتا ہے پھر
ایک ضِد کرتا ہوا بچہ ___ وہی
ہر بڑے چھوٹے سے لڑتا
ایک ڈھانچا ہڈیوں کا
دانت غائب، آنکھ غائب
آتی جاتی سانس سے بھی بے خبر ___ اور
کون جانے کب گرے پردہ
کہاں یہ کھیل ہو جائے تمام

☆

نیما یوشیج / عارف نوشاہی

(۱)

میر داماد

میر داماد کے بارے میں، میں نے سنا ہے
کہ جب اسے خاک وطن میں دفن کیا گیا
تو قبر کا فرشتہ اس کے سرہانے آیا اور پوچھا
''من ربّک، من؟'' [تمہارا ربّ کون ہے، کون؟]
میر نے دیدۂ بینا کھولا
اور بڑی فضیلت سے جواب دیا
''استطقس'' ہے.
''اسطقسات'' اس نے اور زیادہ یقین سے کہا
فرشتے کو یہ سن کر حیرت ہوئی
اور ریہ واقعہ خدا کے حضور لے گیا
کہ تمہارا یہ بندہ قبر میں
کسی اور زبان میں جواب دیتا ہے
پیدا کرنے والا مسکرایا اور کہا
''تم میرے اس بندے سے بات نہ کرو
اس نے اس دنیا میں بھی، جب وہ زندہ تھا
ایسی باتیں کیں کہ میں بھی نہ سمجھا''

(۲)

دیہاتن

سوے شہر آئی وہ دیہاتی عورت
اور اِدھر اُدھر گھومنے لگی
زمین پر گرا اس نے ایک آئینہ دیکھا
اور کہا: ہاں یہی گوہرِ یکتا ہے.
اسے اٹھایا، دیکھا

یہ تو اپنا ہی عکس تھا
آئینہ پھینک دیا اور سہم کر کہا:
''میری بہن معاف کر دینا،
بخدا مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ موتی تمہارا ہے
ہم وہی دیہاتی عورتیں ہیں
سادہ لوح، بھولی بھالی، کچھ نہ چھپانے والی
جو آئینۂ جہان میں
سب سے زیادہ اپنے لیے ہی اجنبی ہیں.

✦✦✦

سرائیکی: جُرم بہاولپوری

اُردو: سید ضیاء الدین نعیم

کافی

کیا نہیں کوئی بھی یہاں ایسا
جو اُسے میرے پاس لے آئے
وہ جو درماں ہے میرے ہر دکھ کا ....
آج مایوس ہے بہت مرا دل
ڈوب جاتا ہے، ایک لمحے کو
اور پھر جیسے اگلی ساعت میں
اک تڑپ، اُس کو آن لیتی ہے
میرے غم بارے مجھ سے مت پوچھو
یہ محبت جو ہے، اذیّت ہے...

.....

آ گئی دیکھو پھر سے برکھا رُت
ہاں، وہی رُت کہ جس میں پینگھوں کے
اونچے پیڑوں پہ رسے بندھتے ہیں
جس میں گاتی ہیں مل کے سب سکھیاں
میٹھے گیت اور پیار کے نغمے
تُو نہیں ہے یہاں، تو یہ سب کچھ
کر کے رکھ دیتا ہے مجھے بے کل

.....

دور خوشیوں کا لوٹنے کو ہے پھر
دل کی کلیاں بنیں گی پھول سبھی

ہاں... مگر ایک شخص، جس کا راج
میری سوچوں پہ ہے، وہی تو ہے
چاند میرا، مرا ہلال عید !

.....

ان گنت اور نو بہ نو خوشیاں
ہیں بکھرنے کو، ہر جگہ، ہر سُو
تم چلے آؤ... آؤ نا...
دوستوں کو بھی ساتھ لانا ضرور
شانت رکھے گا تم کو اُن کا سنگ
لطف شاید تمھیں ملے دُونا

.....

آ گئے تم ...
تمھیں، لگے مری عمر!
شان تم نے بڑھا دی اس گھر کی
میرا آنگن سجا دیا تم نے
بخت پھر میرے جگمگانے لگے
میرا گھر، پھر سے ہو گیا ہے گھر !!

☆

ظفر حسین ظفر

''حرفِ شوق'' از مختار مسعود

''آوازِ دوست'' کے دیباچے میں مختار مسعود (پ:۱۹۲۶ء م:۲۰۱۷ء) نے تحریر کیا ہے کہ ''اِس کتاب میں صرف دو مضمون ہیں: ایک طویل مختصر اور دوسرا طویل تر۔ ان دونوں مضامین میں فکر اور خون کا رشتہ ہے۔ فکر سے، مراد فکرِ فردا اور خون سے خونِ تمنا۔ ''حرفِ شوق'' اُس فکرِ فردا کی تعمیر و تشکیل اور نمو کی حکایت ہے جس کی خشتِ اول سر سید احمد خان نے رکھی اور جسے تاریخ نے علی گڑھ کے نام سے تاابد محفوظ کر لیا ہے اور خونِ تمنا اُن خوابوں کا جو تشنۂ تعبیر رہے اُن کی ایک جھلک ''حرفِ شوق'' میں موجود ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں سر سید اور علی گڑھ کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ تحریر کیا گیا، لکھنے والوں میں مسلم و غیر مسلم سب ہی شامل ہیں۔

الطاف حسین حالی کی ''حیاتِ جاوید'' سے لے کر تارا چند کی ''فریڈم موومنٹ ان انڈیا''، آر۔سی لوجمدار کی ''ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا'' اور رام گوپال کی How India Struggle for Freedom سمیت بے شمار کتب ہیں، جن میں برِ عظیم کی تحریکِ آزادی، سر سید تحریک اور مسلمانوں میں Anti Hindu اور Anti Congress رجحانات کا تجزیہ کیا گیا ہے، سر سید اور علی گڑھ تحریک کی علمی اور فکری خدمات پر کئی جامعات میں سندی مقالات لکھے جا چکے ہیں اور رسائل کے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے جیسے: سہ ماہی ''فکر و نظر'' علی گڑھ جس میں ان نامور ان علی گڑھ کا مفصل تذکرہ کیا گیا، جنھوں نے برِ عظیم کی سیاست، تہذیب و معاشرت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اِس نادر اور قیمتی ذخیرے میں ''حرفِ شوق''، اپنے منفرد، اچھوتے اور دلکش طرزِ تحریر کے باعث ایک انفرادی پہچان کا حامل تذکرہ بن گیا ہے۔

برِ عظیم میں مسلمانوں کے عہدِ زوال اور پھر اِس سے نکلنے کے لیے کی گئی تدابیر میں سر سید اور علی گڑھ کے کردار کو جس عمدگی اور جامعیت کے ساتھ مختار مسعود نے بیان کیا ہے۔ سچ یہ ہے: انھی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔ ''حرفِ شوق'' میں علی گڑھ کے سنگ و خشت کا ذکر بھی اس عمدگی سے کیا گیا ہے کہ وہ زبانِ حال سے اپنی داستان آپ ہی سنا رہے ہیں: جیسے اسٹریچی ہال کی تعمیر کے مختلف مراحل اور پھر اُس کثیر المقاصد ہال کے مصرف کا بیان ایک ایسی داستان ہے کہ پڑھتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ یہ دراز ہوتی رہے۔ زیرِ نظر کتاب چار مضامین پر مشتمل ہے۔ ''ماضی کے ساتھ ایک نشست'' سب سے طویل مضمون ہے، جس میں مصنف نے علی گڑھ کی فضاؤں میں گزرے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ایام کو آواز دی ہے یہ محض آپ بیتی نہیں بل کہ اس میں علی گڑھ کے نام ور اساتذہ، نمایاں طلبہ، تعلیمی ماحول، یونین

سرگرمیوں، باہر سے آنے والے قائدین کے خطابات؛ مباحثوں اور تقریری مقابلوں کی روداد اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ یہ کسی فرد کی داستان نہیں بل کہ مسلم تاریخ ایک عہد کا روشن حوالہ بن گئی ہے۔ علی گڑھ اولڈ بوائز کی یادیں رسائل و جرائد میں اکثر اشاعت پذیر ہوتی رہتی ہیں، لیکن مصنف نے ایسی منظر کی ہے کہ قاری بھی عہد سرسید میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ شاید واحد تعلیمی ادارہ ہے جس کے وابستگان کے لیے آج بھی سب سے بڑا اعزاز ''علیگ'' ہونا ہے۔ جس طرح رومی امپائر کے عروج کے زمانے میں اہل روما کے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ ''میں رومی شہری ہوں'' اِس طرح سرسید کے علی گڑھ سے وابستہ افراد کے لیے ساری زندگی یہی بات باعث فخر رہی کہ میں ''علیگ'' ہوں، مصنف نے کئی علیگ دوستوں کا تذکرہ گاہے تفصیل گاہے اجمال سے کیا ہے لیکن اپنے مضمون کا اختتام تین نامور علیگ دوستوں کے ذکرِ خیر پر کیا ہے، جنھوں نے تعلیم و تحقیق کے میدان میں غیر معمولی نام کمایا:

اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر زوار حسین زیدی اور ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔

یہ تینوں ہم عصر اور ہم طالع، اچھے طالب علم اور مثالی اور کامیاب معلّم، اگر نسل نو کے لیے رول ماڈل نہیں ہوں گے تو پھر کون ہوگا؟

کتاب کے دوسرے طویل مضمون کا عنوان ہے: سرسید کون تھے؟

یوں تو لاکھوں آئیں گے اس نجد میں اور جائیں گے
سیّد احمد سا جنوں ساماں مگر آئے گا کون؟

مختار مسعود نے اپنی کتاب کے ۱۲۳ صفحات بطور خاص اس سوال کے جواب کے لیے مختص کیے اگر چہ پوری کتاب میں علی گڑھ اور سرسید کی حکایتِ لذید کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔ مصنف کے بقول انھیں سرسید کے بارے میں لکھنے کے لیے بعض واقعات نے تحریک دی۔ کوئی عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کا ایک وفد بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے ملا اور سرسید کا تذکرہ چلا تو وائس چانسلر نے بڑی معصومیت سے پوچھا: یہ سرسید کون ہیں؟

دوسرا واقعہ انھوں نے تحریر کیا کہ اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں سرسید احمد خان کی یاد میں ایک بھرپور جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے اختتام پر تمدنِ مغرب میں غرق ایک نوجوان نے ڈاکٹر وحید الزمان، ڈائریکٹر ہسٹاریکل اینڈ کلچرل انسٹی ٹیوٹ سے یہ سوال کیا:

sir, Are the works of the oldman available in the market?

سوال پوچھنے والے سرسید احمد خان کے پوتے (سر راس مسعود) کے پوتے تھے۔ بڑا سوالیہ نشان آبا سے نسبت کا تھا۔

وقت کا گھوڑا تیز رفتاری سے تاریخ کے کئی نشیب و فراز طے کر چکا ہے اج کی نئی نسل کو کیا معلوم کہ اگر سرسید نہ ہوتے اور علی

گڑھ ہماری تاریخ کا ایک سنگ میل نہ ہوتا تو پھر برصغیر کے مسلمان آج کہاں کھڑے ہوئے؟ پھر شبلی سے اقبال اور جناح تک مسلم تشخص کے علمبرداروں کی ایک کہکشاں کیسے وجود میں آتی۔ سرسید جب مطلع تاریخ پر طلوع ہوئے اس وقت برعظیم کے مسلمان اپنے زوال کی اخری حدوں تک پہنچ چکے تھے۔ مشہور انگریز کا مورخ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اپنی تصنیف: Our Indian Musalmans (ہماری ہندوستانی مسلمان) میں تفصیل کے ساتھ 1857ء کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے؟

بقول ہنٹر: ایک سو ستر سال پہلے ایک خاندانی مسلمان کا نادار ہونا ناممکن تھا۔ آج (۱۸۷۱ء) اس کا خوش حال ہونا ناممکن ہے اور سال (۱۸۷۱ء) میں (صدر مقام کلکتہ) میں کوئی سرکاری دفتر ایسا نہ تھا جہاں کسی مسلمان کو یہ امید ہو کہ وہ قلی، نائب قاصد، سیاہی کی دوات بھرنے والے یا قلم تراش سے بہتر درجہ ملازمت میں حاصل کر سکتا ہو۔ ایک ہزار سال تک حکومت اور اقتدار کی مالک قوم سات سمندر پار سے آئے ہوئے دکانداروں سے شکست پہ شکست کھائے جا رہی تھی۔

عیسائی مبلغین پوری آزادی کے ساتھ اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے اور مسلمانوں کے ہم وطن (ہندو) نہایت چالاکی کے ساتھ انگریزوں سے تعلقات استوار کرتے ہوئے زمین حقائق کا مقابلہ کرنے کے لیے صف بندی کر رہے تھے۔ مسلمانوں کا اجتماعی ضمیر سویا ہوا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا کا زمینی۔

ان حالات میں سرسید میدان میں اترے اور ایک ایسی علمی اور فکری تحریک کی بنیاد رکھی جس کے اثرات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کو اس نے متاثر نہ کیا ہو۔ مصنف نے لکھا کہ: قدرت بعض معاملات میں بڑی بے لحاظ ہوتی ہے موقع ملے تو افراد ہی نہیں بل کہ قوموں اور ملکوں کے کپڑے بھی اتر والیتی ہے اگر حافظہ اور حوصلہ ساتھ دے تو ۱۶/دسمبر ۱۹۷۱ء کو یاد کر لیں۔

سرسید نے زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک راستہ تجویز کیا، جس کی مخالفت ہوئی مخالفین کے دلائل بھی کم وزنی نہ تھے مصنف کے بقول سرسید دو شخصیتوں کا نام اور دو مخالفتوں کا عنوان ہے۔ ایک سرسید تعلیم والا اور دوسرا تفسیر والا۔ (ص ۲۵۸) لیکن برعظیم کے مسلمانوں کے اجتماعی شعور نے سرسید کی تعلیمی فکر کو راست جانا۔ تفسیر کا جرم شاید قابل معافی نہ ٹھہرا۔

سرسید نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بنائی جس کے بطن سے مسلم لیگ پیدا ہوئی۔ سرسید کا زمانہ علوم وفنون کے احیا اور تجدید کا زمانہ تھا۔ اِس دور میں ہندی مسلمانوں کی ذہنی اور فکری تشکیل اِس انداز سے ہوئی جس نے بعد کے ادوار میں سیاسی آزادی کی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ سرسید کے دیئے ہوئے شعور کا نتیجہ تھا کہ مسلمانانِ ہند مخلوط انتخابات کی مخالفت، مسلم یونیورسٹی کے مطالبے،

اردو زبان کے تحفظ، ملازمتوں میں تناسب کے حصول وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی، ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں نمائندگی اور قائداعظم کے چودہ نکات جیسے مطالبات سے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے۔ خطبہ الٰہ آباد سے ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ کی قرارداد اور پھر ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء تک پہنچے۔

سرسید کون تھے؟ دراصل اِس کتاب کی روح ہے، ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے درست لکھا ہے کہ سرسید احمد خان پر لکھی جانے والی سیکڑوں تحریروں میں سرسید کو ایسا محبت بھرا دفاع شاید اِس سے پہلے کبھی نہیں ملا۔۔ اِس تحریر میں مصنف ایک نثر نگار سے زیادہ محقق اور مبصر دکھائی دیتا ہے تاہم جہاں جہاں اس کے باطن کا نثر نگار جاگتا ہے تو ''آواز دوست'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے (ماہنامہ الحمرا اکتوبر ۲۰۱۷، ص ۲۳)

مصنف نے اس مرحلے پر درست طور پر یہ استفسار مؤرخ کے لیے چھوڑا ہے کہ کیا سرسید نے کبھی سوچا ہوگا۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ کا سنگ میل عبور ہوگا یا سرسید کے زمانے میں انگریز نے ہندوستان چھوڑنے کا کبھی خیال کیا ہوگا؟

''تیسرا مضمون ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک مورخ اور سوانح نگار کی طرح واقعات کی فہرست بھی ہے اور ان پر ایک دانشورانہ رائے بھی۔ اِس مضمون میں توقعات اور امکانات کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کے نقوش بھی اُبھرتے ہیں۔ مصنف کی شخصیت و آثار پر کام کرنے والے محققین کے لیے اِس باب میں تحقیق و جستجو کے کئی عنوانات موجود ہیں۔

بچپن، لڑکپن، علی گڑھ کے روز و شب، ہجرت، پاکستان سول سروس میں شمولیت، مختلف علاقوں میں تبادلے، نیز سنیئر، بیوروکریٹس کے پند و نصائح، ان سب کے تناظر میں مصنف اپنے تجربات اور مشاہدات کو داستان در داستان بیان کرتے ہوئے کبھی تحقیق و تنقید کی وادیوں میں نکل جاتا ہے، پھر اچانک اس کے اندر کا صاحبِ طرز نثر نگار انگڑائی لیتا ہے تو ''آواز دوست'' اور ''سفر نصیب'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مصنف نے بڑے جچے تلے انداز میں مسلم ہندوستان کی تاریخ کے بعض ایسے واقعات کا تجزیہ کیا ہے۔ جن کے اثرات سے اب بھی چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ پلاسی کے میدان میں محض دو ہزار انگریز سپاہیوں سے سراج الدولہ کی پچاس ہزار فوج کی شکست اور فورٹ ولیم کالج کے قیام میں بباطن چھپی ہوئی مسلم دشمنی جیسے واقعات کا تجزیہ اس جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا گماں گزرتا ہے۔

مضمون کے آخر میں افتخار عارف کے سوال: اچھی نثر کی کیا پہچان ہے؟ کے جواب میں مصنف نے اُردو کے آغاز و ارتقا، اسلوب طرز اور دل و دماغ پر اثر ڈالنے والی نثر کی جو خوبیاں بیان کی ہیں مصنف کے اپنے لفظوں میں درج کی جاتی ہیں، پڑھیے اور حظ اُٹھائیے۔

☆ اچھی کتاب کی علامتی پہچان یہ ہے کہ اسے رکھنے کو جی نہ چاہے اور جب رکھیں تو گوشۂ ورق کو موڑ دیں تا کہ جہاں چھوڑا وہاں سے دوبارہ شروع کر سکیں۔(ص ۴۹۸)

☆ وہ لوگ جو مشق کو بیگار کہتے ہوں اور محنت کو بے دانش لوگوں کی ضرورت اور بار برداری کے جانوروں کی مجبوری سمجھتے ہوں ان سے کمال فن کی توقع رکھنا عبث ہے۔

☆ میرا مشورہ یہ ہوگا کہ آج کا کام آج ہی ختم کریں کل پر اسے ہرگز نہ ٹالیں۔آج سے مراد زندگی اور کل سے مراد موت ہے۔

☆ اچھی نثر میں حذف واضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

☆ ہر وہ نثر جو آزردگی، دل تنگی اور ناخوشی کا موجب ہو وہ خراب ہے۔

☆ نثر میں آزار دینے والی خامیاں ہیں: مبہم اور گنجلک، جذباتی اور موضوعی، بے تحقیق اور ہوائی، طوالت وتکرار، بناوٹ وتصنع، فکر کا فقدان اور الفاظ کی بہتات، جملہ اکھڑا اکھڑا اور باتیں اکھڑی اکھڑی۔

☆ اچھی نثر کی پہچان یہ ہے کہ اس میں حسن، زرخیزی اور خیر ہو: حسن عبارت کا، زرخیزی فکر کی اور خیر جوان دونوں کا حاصل ہے۔(ایضاً)

کتاب کا آخری مضمون ''مرحوم کے نام ایک خط'' ۵۴ صفحات کو محیط ہے۔مرحوم نسیم انصاری تھے جو پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر اور مصنف کے بچپن کے دوست تھے، وہ ہندوستان ہی میں رہے اور پھر امریکہ چلے گئے۔انھوں نے ''آواز دوست'' کے ''جواب میں جواب دوست'' ۱۴ برس بعد لکھی جو ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی، مختار مسعود نے اپنے دوست کی وفات سے دس سال بعد اس کا جواب لکھا۔

جس میں مرحوم کے ترقی پسندانہ نظریات پر نقد وچھیڑ چھاڑ، حیات بعد الموت، اور دیگر شخصیات کے حوالے سے بھی گفتگو اچھی نثر قاری کو اِس لیے آزار نہیں دیتی کہ اس کا سارا آزار اور عذاب مصنف کی قسمت میں لکھا جاتا ہے۔ (ص ۵۰۴)

۵۶۱ صفحات کی یہ کتاب حرف بہ حرف پڑھنے کے بعد زیرِ نظر تبصرے کا اختتام بھی مصنف کے اس جملے پر کیا جاتا ہے: عمر عزیز ایسی تحریروں کو پڑھنے سے عزیز تر ہو جاتی ہے۔

☆

بی بی امینہ

''انارکلی'' از مرزا حامد بیگ

''انارکلی'' کے عنوان سے جنوری ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا ایک ناول منظرِ عام پر آیا ہے جو اکتیس سال کے طویل عرصے میں تحریر کردہ ایک دستاویزی ناول ہے۔ یہ ناول تقریباً اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے جسے اولاً ایک ہزار سے زائد صفحات پر لکھا گیا تھا۔ بعد ازاں اس کی کاٹ چھانٹ کی گئی اور کمال مہارت سے اڑھائی سو صفحات میں چار سو اٹھارہ سالہ تاریخ ہند کو سمو دیا گیا۔ تاہم ناول نگار کے مطابق ناول کے اصل مسودے کو بھی محفوظ رکھا جائے تاکہ شائقین ادب خود ملاحظہ کر سکیں کہ یہ ناول کیسے تحریر کیا گیا۔

ناول ''انارکلی'' میں مرزا صاحب نے اٹل حقیقت اور ایک اہم زمینی واقعے کو زیرِ بحث لانے کے لیے کہانی کا سہارا لیا ہے اور یہی ان کا اصل فن ہے کہ موضوع سے متعلق وہ تمام پہلو جنھیں نظرانداز کر دیا گیا یا مسخ کرنے کی کوشش کی گئی، وہ ان تمام باتوں کو سامنے لے آئے اور آخر میں فیصلہ قاری پر چھوڑتے ہوئے ان پر اپنی رائے مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انھوں نے ناول کو تحقیقی مقالہ نہیں بننے دیا بل کہ تمام تر معلومات کو کہانی کا حصہ بنا کر اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے اور حقائق کے ساتھ ان کے حوالہ جات کو بھی کہانی کے اندر ہی، اس قدر چابک دستی کے ساتھ گتھم کر دیا ہے کہ تحریر میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ یا کمی محسوس نہیں ہوتی۔

ہر ناول کی تحریر کا کوئی بنیادی مقصد ہوتا ہے جو ناول کی تحریر کا باعث بنتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس ناول کا مقصد میل شاؤنزم اور اس کی بنیاد پر ہونے والی ناانصافیوں کو سامنے لے کر آنا ہے جس کی ایک نمایاں صورت مرزا صاحب کے نزدیک ''غیرت کے نام پر قتل'' بھی ہے جو مذکورہ ناول کے حوالے سے انارکلی کا قتل ناحق ہے۔ اگرچہ یہ مغلیہ دور اور بالخصوص لاہور کا کوئی واحد قتل نہیں۔ اس سے پہلے اور بعد میں بھی اس طرح کے واقعات پیش آتے رہے ہیں لیکن تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو سب سے زیادہ معروف یہی ہے۔ علاوہ ازیں بات صرف قتل پر ہی ختم نہیں ہوتی بل کہ انارکلی پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان اس قدر طویل ہے کہ چار سو اٹھارہ سال بعد بھی نہ تو اس سے قتل کا کوئی فیصلہ ہو سکا اور نہ ہی ایک سو چھپن سال سے اپنی قبر سے محروم انارکلی اپنے مدفن میں واپس جا چکی ہے۔ یہی ناول نگار کا بنیادی قضیہ ہے جس کی تائید خود ناول کے انتساب سے بھی ہو جاتی ہے جو اکبر اعظم کے نام کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''جنھوں نے شہزادہ لوہ کے ہاتھوں قلعہ لاہور میں جلایا چراغ بجھنے نہ دیا اور ایک ننھا سا دیا پھونک مار کر بجھا دیا۔''

چناں چہ تحقیق و تفتیش نے انھیں اس قدر مضطرب کر دیا کہ انھوں نے مغلیہ عہد کی عمارات کی مضبوط فصیلوں کو توڑ کر ان کی خستہ حالی دیواروں میں موجود رازوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ نہ صرف کامیاب رہے بل کہ عہد

اکبری سے لے کر زمانہ حال تک کی معاشرتی اور سماجی تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ میں بھی ایسی ایسی ناانصافیوں اور سرقوں کی نشان دہی کر گئے جن کا بروقت ادراک نہ ہونے اور وقت کی دھول کی دبیز تہوں کے نیچے چھپ جانے کے سبب ادب کے قارئین اور محققین بل کہ تمام شائقین ادب ہوا میں معلق تھے اور جھوٹ کو ہی سچ مان بیٹھے تھے، لیکن حقائق کی جمع آوری کے بعد اب وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ مذکورہ معاملات پر اعتماد سے بات کر سکیں اور ان سے متعلق اپنا فیصلہ صادر کر سکیں۔ مرزا صاحب کی مساعی نے جن اہم حقائق کی بازیافت کو ممکن بنایا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ اکبر کے عہد اور بعد کے مورخین اور مصنفین نے انارکلی، اس کی موت اور سبب چھپانے کی سر توڑ کوشش کی۔ اس کوشش میں سب سے نمایاں کردار ابوالفضل کا تھا اور اس نے اس لیے پردہ پوشی کی تا کہ شاہی خاندان کے ماتھے سے ''زنا بالمحرمات'' کا داغ دھویا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے ابوالفضل نے ۱۵۹۴ء میں پاگل کا بہروپ بھر کر انارکلی سے ملنے والے سلیم کو ''اکبر نامہ'' میں ایک عام پاگل ہی قرار دیا لیکن یورپی مورخین اور سفر نامہ نگاروں نے سلیم ہی کے حوالے سے اس واقعے کا ذکر کر کے اس کی موجودگی کو ثابت کیا ہے۔ مزید برآں دربار اکبری کے شاعر عرفی شیرازی نے بھی اپنے اشعار میں انارکلی کے بیک وقت سلیم اور اکبر کے ساتھ تعلقات کا ذکر کیا ہے، جس کے بنا پر بعد میں اسے زہر دے کر قتل بھی کر دیا گیا تھا۔

۲۔ میر عدل میر عبدالحی کی عدالت میں انارکلی پر ۱۵۹۱ء میں شہنشاہ اکبر کو زہر دینے اور بعد ازاں اکبر کے حرم شاہی کا حصہ ہوتے ہوئے بھی شہزادہ سلیم کے ساتھ پکڑے جانے کے حوالے سے ''زنا بالمحرمات'' کے مقدمات کیے گئے۔ انارکلی نے اکبر کو زہر دینے کی سازش میں ملوث ہونے کا اقرار اذیت ناک سزاؤں کے باوجود آخر دم تک نہیں کیا۔ لہذا اسے موخر الذکر مقدمے کے لیے سزا ملی اور آئین اکبری کے تحت اس کی ناک اور کان کاٹنے کے بعد اسے نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے دیوار میں چنوا دیا گیا۔

۳۔ انارکلی ۲۹ نومبر تا ۶ دسمبر ۱۵۹۹ء کی درمیانی مدت میں زندہ دیوار میں چنوا دی گئی۔ حتمی تاریخ اس لیے نہیں بتائی گئی کیوں کہ ہجری اور عیسوی تقویم میں افتراق کی وجہ سے حتمی تاریخ کا تعین انتہائی مشکل ہے۔ جہانگیر نے بھی انارکلی کی قبر کے تعویز پر ۱۵۹۹ء اور ۱۰۰۸ھ ہی لکھوایا کیوں کہ کنیز کو سزا ملنے کا سال یہی تھا لیکن چوں کہ سزا حبس دم کی تھی اس لیے بھی اس بات کا فیصلہ صرف تاریخ مدد سے نہیں کیا جا سکتا کہ دیوار میں چنوا دینے کے بعد اس کی سانس کب رکی اور موت کب واقع ہوئی؟

۴۔ مقبرہ انارکلی کو سلیم اور ایک بیگم صاحب جمال کا مدفن قرار دیا جاتا ہے۔ قبر کے اوپر سال وفات ۱۰۰۸ھ درج ہے جب کہ صاحب جمال کا سال وفات ۱۰۰۷ھ تھا۔

۵۔عہد اکبری کی بیش تر عمارات موجود ہیں لیکن اکبری محل اور حرم شاہی میں موجود بیگمات اور لونڈوں کے حجروں کی صرف بنیادیں باقی رہ گئی ہیں۔ ناول میں نہ صرف محل کے مختلف حصوں بل کہ قلعہ لاہور کے مسجدی دروازے کے قریب ایستادہ اکبری محل سے ملحقہ انارکلی کے حجرے کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جس میں انارکلی ۱۵۹۰ء تا ۱۵۹۱ء اقامت پذیر تھی۔

۶۔ولیم فنچ نے اپنی تحقیقات میں جس مسجد کا حوالہ دیا ہے اسے اب تک بابا فرید گنج شکر کی مسجد سمجھا جاتا رہا ہے۔لیکن فنچ نے شیخ فرید کی مسجد بتائی ہے جو گورنر لاہور نواب مصطفیٰ خان شیخ فرید بخاری تھے جو ۱۶۱۶ء تک زندہ رہے۔

۷۔شالامار باغ اور شیش محل کو عہد شاہجہاں کی یادگاریں قرار دیا جاتا ہے جب کہ یہ عمارات اکبر کے عہد میں موجود تھیں اور اس وقت ''شالامار'' کو ''شالی مار'' کہا اور لکھا جاتا تھا جس کا تذکرہ اس دور کی شاعری میں بھی ہے۔

۸۔اکبر کے مذہب کے حوالے سے یہ بحث بھی ملتی ہے کہ ''دین الٰہی'' کا کوئی وجود تھا بھی یا نہیں؟ ناول میں نہ صرف اس کی موجودگی کا بیان ہے بل کہ اس کے پیروکاروں کی اس دین میں شمولیت کے طریقہ کار اور کھانے پینے کے باب میں بھی مکمل فراہم کی گئی ہے۔

۹۔حضرت داتا گنج بخش کی قبر کے بارے میں یہ بیان کہ یہ اکبری عہد سے پہلے قلعہ لاہور کی زمین پر راوی کے کنارے تھا، غلط ہے۔

۱۰۔معروف ملامتی صوفی شاعر شاہ حسین اکبر کا مخالف تھا لیکن اس شہزادہ سلیم کے ساتھ رابطہ تھا۔

۱۱۔محمد حسین آزاد کی کتاب ''دربار اکبری'' کی پہلی اشاعت (۱۸۹۸ء) پر مولوی ممتاز علی نے محمد حسین آزاد کے ساتھ اپنا نام بھی اس بیان کے ساتھ لکھا تھا کہ انھوں نے مسودہ از سر نو مکمل کیا ہے، آزاد کی اغلاط کو درست کیا ہے اور ستر امرا و اعیان اکبری کے حالات بہ طور تتمہ قلم بند کیے ہیں۔ جب آزاد کے بیٹے کی طرف سے ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا تو انھوں نے معافی مانگ لی۔ بعد ازاں دوسری اشاعت صرف آزاد کے نام کے ساتھ ہی منظر عام پر آئی۔

۱۲۔اردو ادب کا معروف ڈراما ''انارکلی'' سید امتیاز علی تاج کی تحریر نہیں بل کہ یہ ایس۔ کے۔ فیروز کا ڈراما ہے جو انھوں نے ''انارکلی'' کی اشاعت (۱۹۳۲ء) سے دس سال پہلے دارالاشاعت پنجاب کے مالک مولوی ممتاز علی کو اشاعت کی غرض سے دیا تھا لیکن تاج نے اسے اپنے نام سے شائع کروایا۔

۱۳۔انارکلی کی قبر مقبرے میں ہونے کے باوجود اپنی جگہ پر یعنی گنبد کے عین نیچے نہیں۔گنبد کے نیچے اس کی تلاش کے لیے ۱۹۹۲ء میں ناول نگار کی ہی کوششوں سے ملتان سے پیشہ ور بلوا کر بورنگ کروائی گئی تا کہ قبر کی موجودگی کا پتا چلایا جا سکے لیکن بور کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ نیچے کوئی قبر موجود نہیں۔ درحقیقت ۱۸۵۲ء میں مقبرہ انارکلی کو چرچ بنانے کی صورت میں انارکلی کا ماندہ وجود گنبد کے نیچے سے نکال کر صدر دروازے سے ملحقہ بائیں برجی کے

نیچے دفن کر دیا گیا تھا جہاں وہ اب بھی موجود ہے لیکن ناول کے عام قارئین کے لیے اس جگہ کی نشان دہی کے باوجود اس تک پہنچنا اس لیے مشکل ہے کیوں کہ انھیں معلوم نہیں کہ جب یہ عمارت بنی تھی اس وقت صدر دروازے کے طور پر کون سا دروازہ مستعمل تھا؟ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے بقول صرف وہ ہی اس ضمن میں راہ نمائی کر سکتے ہیں۔

پلاٹ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک مربوط اور منظّم پلاٹ ہے بل کہ ناول میں حقیقی اور ''مجازی'' انارکلی کے حوالے سے دو پلاٹ چلتے ہیں اور دونوں کے حالات، اشتراکات اور معاملات اس طرح باہم پیوست ہیں کہ ایک کی کہانی دوسرے کو متاثر نہیں کرتی بل کہ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کا سب سے اہم سبب یہ ہے کہ ایک ہی طرز کے واقعات کو ناول کے ایک ہی باب میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے قاری کی توجہ منتشر نہیں ہونے پاتی۔ علاوہ ازیں واقعات کا تاریخی تسلسل قابل داد ہے جو ناول کی اہم ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار کی اکتیس سالہ تحقیق اور محنت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ قدم قدم پر اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کے جوابات خود ہی فراہم بھی کر دیے تھے جو پلاٹ میں کوئی خلا باقی نہیں رہنے دیتے۔ ہاں اگر ایک بھی کڑی نکال دی جائے تو خلا کا پیدا ہونا یقینی امر ہے۔ لیکن یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ناول نگار ہر موقعے پر اعتدال و توازن قائم رکھتے ہیں۔ وہ پورے ناول میں اکبر اور سلیم کی مخالفت اور انارکلی اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر کڑھتے ضرور ہیں، لیکن اکبر کی پدرانہ شفقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بل کہ ایک دیانت دار فن کار کی طرح حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی نفسیاتی توجیہہ تلاشنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پھر انھیں حوالوں کی مدد سے ثابت بھی کر جاتے ہیں۔

کردار نگاری اس ناول کا سب سے متاثر کن جز ہے۔ ناول نگار کا نقطہ نظر فلسفیانہ انداز میں کرداروں کا جائزہ لینا ہے۔ وہ کرداروں کی نفسیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کرداروں کو لے کر تخلیقی انداز میں اپنی فکر اور اپنی سوچ کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کے تاریخی کردار تو اپنی جگہ مکمل ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ فلم یونٹ کے افراد اور شہر یار مرزا کے کردار بھی قابل تحسین ہیں۔ کوئی بھی کردار غیر ضروری نہیں۔ تمام کردار نبھا رہے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے قاری کو نہ صرف حیران و پریشان کر دیتے ہیں بل کہ بعض اوقات جھنجھوڑ بھی دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ناول کا ہر کردار جب کچھ بولتا ہے تو ساتھ ساتھ نہایت غور سے کچھ سن بھی رہا ہے۔ یوں خارجیت میں داخلیت اور حاضر میں غائب کی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے جو ناول میں شعور کی رو لیے راستہ ہموار کر دیتی ہے، جس کی سب سے زیادہ فرمائیاں شہر یار مرزا میں نظر آتی ہیں۔

ناول میں اگرچہ مکالمے کم ہیں لیکن دلچسپ موزوں اور برمحل ہیں۔ یہ کرداروں کے خیالات، جذبات اور احساسات کو عیاں کرتے ہیں۔ یہ مکالمے نہ صرف برجستہ اور آسان زبان میں ہیں بلکہ کرداروں کی تفہیم میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ مرزا صاحب نے تاریخی کرداروں کے خیال مکالمے بھی لکھتے ہیں لیکن ایسے مکالمے ان کی تاریخی نویسی

کی راہ میں حائل ہونے کے بجائے کرداروں کے خیالات اور نفسیات کے ساتھ اپنے عہد کے مسائل کی طرف بھی قاری کی توجہ دلاتے ہیں اور ان کا مناسب حل تجویز کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

تاریخی موضوع اور وہ بھی اکبری عہد اور اس میں منظر نگاری نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ چناں چہ مرزا صاحب نے موضوع سے انصاف کرتے ہوئے سماجی اور مادی منظر نگاری دونوں کو برتا ہے۔ انھوں نے ماحول کو جزئیات کی مدد سے قاری کے لیے اس طور پر واضح کر لیا ہے کہ قاری اسی منظر اور اسی عہد میں اکبر اور جہانگیر کے شانہ بشانہ چلتا اور سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ انارکلی کی موت کا واقعہ کوئی معمولی نوعیت کا واقعہ نہیں ہے۔ وہ انے ساتھ کتنا بدلاؤ اور انتشار لے آیا، جو اس حقیقت سے واقف ہیں وہی جانتے ہیں۔ اس کے بیان کے لیے دفتر درکار ہیں لیکن مرزا صاحب نے سماجی منظر نامے کو واضح کرتے ہوئے اور اس دور کا کوئی بھی اہم نکتہ نظر انداز کیے اس انتشار زدہ صورت حال کو ناول کے ابواب میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اکبر، سلیم، انارکلی اور دل آرام، شہر یار مرزا، شازی حیات کے علاوہ شاہ حسین تک اس کی گرفت سے بچ نہیں پائے۔

اسی طرح اگر مادی منظر نگاری کے معاملے کو دیکھیں تو انھوں نے مکانوں، سڑکوں اور دوسرے مقامات کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو انتہائی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں مصور کے فرائض ادا کیے ہیں جس نے اپنی قوت مشاہدے سے کام لے کر ایسی جزئیات کو بیان کیا ہے جن پر قلعہ لاہور کی سیر کے لیے جانے والے عوام کی نظر تک نہیں پڑتی۔ اس منظر نگاری میں کرداروں کے حلیے، ان کے عادات و خصائل سے لے کر ان کے طرز رہائش تک سب ہی کچھ شامل ہے۔ حویلی، بارہ دری، ایوان خاص، خلوت خانہ، شیش محل، نولکھا، دروازوں، برجوں، مقبروں، محرابوں، بیگمات اور لونڈیوں کے حجروں کے طویل سلسلوں کے بیان اور پھر ان تمام مساکن میں خوف اور خواہشات کے تصادم، آرزو کے حصول کی جستجو، تعیش پرستی، سزا و جزا کے احکامات اور احساس جرم نے مل کر ایک عجیب و غریب، ظلم و دہشت سے بھرپور، پراسرار مگر مکمل منظر نامے کو اس طرح تشکیل دیا ہے کہ ہر کردار اپنے اپنے حصے کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی سعی میں مصروف عمل ہے۔

ناول کا اسلوب رواٹس ہے۔ اسی کی بدولت کہانی سست روی سے نہیں مل بل کہ سطر بہ سطر آگے بڑھتی رہتی ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی توجہ نہیں بنتی اور نہ ہی بیزاری محسوس ہوتی ہے۔ چونکا دینے والی سچائی کو کہانی کے روپ میں ڈھالنا ایک عمدہ تکنیک ہے، جس کی وجہ سے کہانی میں محض فکر ہی نہیں سچائی بھی ہے۔ مکالموں کی زبان اور الفاظ کا چناؤ کرداروں کے پیشوں، جنس اور نفسیات کے مطابق ہے۔ درست املا کا خیال رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے اس کے لیے ناول کے آغاز میں ہی ''انتباہ'' کے عنوان سے ایک عبارت دی گئی ہے جو درج ہے:

''مروج غلا املا کے عادی اس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی قدر وقت محسوس کر سکتے ہیں۔''

علامات کا استعمال کمال ذہانت اور ہوش یاری سے کیا گیا ہے۔خصوصا 'شہر یار مرزا''، ''انار کلی (شازیہ حیات)''اور''مجنوں سلیم اکبر''میں جو معنویت تلاش کی گئی ہے وہ بہت دل چسپ ہے۔اگر چہ کئی مقامات پر تکرار سے بھی کا م لیا گیا ہے لیکن راقمہ کے خیال میں اس کا مقصد اہم تاریخی حقائق اور واقعات اور ان کے وقوع پذیر ہونے کی تواریخ کی ذہن نشینی ہے جو ایک احسن اقدام ہے۔

غرض مجموعی طور پر کہا کیا جا سکتا ہے کہ تواریخ،فلم،مضامین اور ناولوں کی موجودگی میں اتنے عرصے بعد منظر عام پر آنے والی انار کلی سے متعلق تحقیق ایک نئی سمت اور نئی جہت ہی نہیں بل کہ اردو ناول کی تاریخ میں بھی ایک ایک نئے سفر اور جدت کی نوید ہے جو آیندہ ناول نگاروں کے لیے تحقیق و تفتیش کے پل صراط سے گزرنے کے لیے ایک کڑے امتحان کی پیش گوئی کی ہے کیوں کہ اس کے بعد ادب کے باذوق اور سنجیدہ قارئین کے لیے کسی بھی دستاویزی ناول میں،بغیر تحقیق وحوالہ جات کے،کسی ارضی حقیقت کو ماننے میں تامل ضرور ہوگا۔مزید برآں آخر میں اس اہم سوال کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو ناول کے توسط سے مرزا حامد بیگ نے فلم یونٹ کے افراد کے پردے میں اپنے قارئین سے پوچھا ہے اور وہ یہ ہے کہ مرزا حامد بیگ انار کلی کے ماندہ وجود کو عین اسی جگہ دفنانا چاہتے ہیں جہاں وہ ۱۸۵۲ء سے پہلے دفن تھی،لیکن کیا اس کاوش میں ہم مرزا حامد بیگ کا ساتھ دیں گے۔

☆☆☆

یاسر اقبال

''سُرسنسار'' از پروفیسر شہباز علی

فنون لطیفہ میں موسیقی ایک ایسا پرتاثیر اور مسحور کن فن ہے کہ اس کے بغیر کسی بھی خطے کی تہذیبی وثقافتی زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں۔فنِ موسیقی کو کلچر کے عناصر ترکیبی میں ایک بنیادی درجہ حاصل ہے۔ ہر خطے کی تہذیب وتمدن اور ثقافت ومعاشرت کے حسن و جمال کو قائم کرنے میں فنون لطیفہ کا اہم کردار رہا ہے۔ برصغیر پاک ہند کی تہذیب فنون لطیفہ میں گندھی ہوئی ہے۔اس خطے کی مٹی نے دنیائے فنون میں ایسے ایسے نابغۂ روزگار اہلِ فن پیدا کیے ہیں کہ خود ان کا فن ان کی مدحت سرائی کرتا نظر آتا ہے۔ ویسے تو فنونِ لطیفہ میں تمام فنون نے اس خطے کی تہذیب کو رنگارنگی بخشی ہے لیکن جتنی گہرائی سے فنِ موسیقی نے اس خطے کی تہذیب میں معنویت اور حسن پیدا کیا کسی دوسرے فن نے نہیں کیا۔ برصغیر کی تہذیب کو فنِ موسیقی کے بغیر سمجھا اور محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کی تہذیب وتمدن میں اس فن کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ابتدائی دور میں اگر ہم اس فن کی تاریخ دیکھتے ہیں تو اس فن میں ایک گہری سنجیدگی نظر آتی ہے کیوں کہ ابتدا میں اس فن کی غرض وغایت آج کے دور سے بہت مختلف تھی۔فنِ موسیقی علوم وفنون میں بلند درجے کا فن سمجھا جاتا تھا۔تاریخ کا ہر بڑا عالم اس فن سے وابستہ نظر آتا تھا۔معاشرتی، اخلاقی اور روحانی تربیت میں اس فن کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ماضی میں علمی وعملی سطح پر اس فن کا ایک مضبوط اظہار نظر آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب سماج اور تہذیب کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔جب سماجی تشکیل میں تہذیبی عوامل کو نظر انداز کیا جانے لگا تو جہاں بہت سی معاشرتی قدریں زوال پذیر ہوئیں وہاں فن موسیقی پر بھی زوال آیا، جس نے اس فن کو تہذیب وتمدن سے نکال کر سماجی سطح پر اسے ہیج اور قابل نفرت بنا دیا۔یاد رہے کہ فنون لطیفہ کا تعلق تہذیب سے ہوتا ہے سماج سے نہیں اور فنِ موسیقی تہذیبی عناصر میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔سماجی تشکیل تو افراد کے ذہنی رویوں، عقائد اور رسومات اور مادیت کے تابع ہوتی ہے۔ جب تک سماج اور تہذیب ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہتے ہیں تہذیب بھی زندہ رہتی ہے اور سماجی قدریں بھی پنپتی رہتی ہیں۔فنون لطیفہ کے فروغ میں جو خلا آیا وہ اسی صورتحال کا نتیجہ ہے۔سماج نے فنِ موسیقی کو حقیر جان کر اسے ایک ایسے طبقے کی میراث سے تعبیر کر دیا جسے معاشرہ عزت و احترام دینے کو تیار نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس فن سے وابستہ سنگیت کار نظر انداز ہوتے آئے۔جب کہ ہر بڑا فنکار نہ صرف اپنے ملک وقوم کا نمائندہ ہوتا ہے بلکہ اپنے خطے کی تہذیب وثقافت کی پہچان بھی ہوتا ہے۔

''سرسنسار'' پروفیسر شہباز علی کی ایک ایسی علمی کاوش ہے جو ۲۴ خاکوں پر مشتمل ہے جس کی اشاعت اول ۲۰۰۲ء میں منصۂ شہود پر آئی ہے جس میں ایسے سنگیت کاروں کے احوال وآثار کو شامل کیا گیا ہے جنھوں نے عوامی سطح پر سُر شناسی کو عام کیا اور اپنی تمام عمر اس فن کی آبیاری میں صرف کر دی۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تو سنگیت کاروں کے شخصی تعارف، نجی و

سوانحی کوائف پر مشتمل ہے۔تذکرہ نگاری اور خاکہ نگاری کے حوالے سے ایک اہم حوالے کے طور پر سامنے آئی ہے۔کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنے دور میں لکھی گئی سنگیت کی کتابوں میں منفرد جانی گئی ہے۔منفرد اسلوب، واقعاتی انداز کے ساتھ فنکاروں کی جس طرح سے مرقع نگاری کی گئی ہے قاری کے لیے دلچسپی اور معلومات کا ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔تمام مضامین میں مصنف کے ذاتی جذبات واحساسات اور محبت اور اخلاص کا تاثر ملتا ہے۔اس میں مصنف نے ایک طرف فنکاروں کے سوانحی کوائف کو بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اکٹھا کیا دوسرا اس میں فنکاروں کی طرز معاشرت کے جو واقعات لکھے گئے وہ ان کی شخصیت کے عمدہ پہلوؤں اور فن سے وابستگی کو اجاگر کرتے ہیں۔کتاب میں ایسے بھی فنکاروں کو شامل کیا گیا ہے جنھیں عوام میں تو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کے وہ اہل تھے لیکن ان کے اندر بلا کی پختگی کا احساس ملتا ہے۔ایسے فنکار اپنے فن کے حوالے سے عوامی شہرت کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ ہر دور میں ان کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔

جیسا کہ ہر انسان کی شخصیت بنیادی طور پر دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے۔دونوں پہلو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہیں تو ایک متوازن اور مثبت شخصیت کا تاثر ابھرتا ہے ایک پہلو داخلی ہوتا ہے اور دوسرا خارجی۔دونوں پہلو اس کی شخصیت کو سمجھنے پرکھنے اور اس کے مکمل شخصی تصور کو دوسروں پر منکشف کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ایک پہلو اس کے داخلی وقلبی معاملات پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرا اس کے خارجی حالات وواقعات پر روشنی ڈالتا ہے۔'سرسنسار' میں جہاں فنکاروں کی معاشرتی، مجلسی اور نجی زندگی کا پتا چلتا ہے وہاں ایسے واقعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے ان کے باطن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔کتاب میں موجود فنکاروں کے شخصی وسوانحی خاکے ان کی مجلسی ومعاشرتی زندگی کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف ان فنکاروں کے اندر آباد ایک خوبصورت جہان سے بھی قاری کو متعارف کراتے ہیں۔کسی نے ایک سچے اور سریلے فنکار کے بارے میں سچ کہا کہ ہر سچے فنکار کے داخل میں ایک خوبصورت دنیا آباد ہوتی ہے اور اس فنکار کی معاشرت اس کی داخلی دنیا کی آئینہ دار ہوتی ہے۔اس کتاب میں جتنے بھی مضامین ہیں ان میں ایک خوبی جو مصنف نے مشترک رکھی وہ یہ ہے کہ جہاں مصنف نے کسی بڑے فنکار کا ذکر کیا وہاں ایسی شخصیات کا بھی ذکر ملتا ہے جس سے ان فنکاروں کے مربی ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کی سرشناسی کا بھی پتا چلتا ہے۔مضامین میں فنکاروں کی طرز معاشرت، فن کے حوالے سے ان کی محنت وریاضت کے خوبصورت نقشے کھنچے گئے ہیں۔مضامین میں جزئیات کا ایک خاص اہتمام نظر آتا ہے۔فنکاروں کی خانگی زندگی سے لے کر ان کے دوست احباب کا ایک خوبصورت تعارف ملتا ہے۔

ایک چیز جو نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سوانحی خاکوں میں فن پر گفتگو کم ہے۔مصنف کا دائرہ فنکاروں کے احوال وآثار تک ہی محدود رہتا ہے لیکن ان احوال وآثار میں بھی بعض واقعات ایسے سامنے آتے ہیں جن سے ان کی فنی پختگی کا قاری کو احساس ہوتا رہتا ہے۔مثال کے طور پر جہاں موسیقی کی محافل کا ذکر آیا مصنف نے ان کے فن کی خوب

مثالیں پیش کی ہیں۔ ہمارے سماج کا غالب گمان یہ ہے کہ جولوگ فن موسیقی سے وابستہ ہوتے ہیں انھیں مذہب سے عملی لگاؤ نہیں ہوتا۔ عبادات کی طرف ان کا کوئی رجحان نہیں ہوتا اور نہ ہی سماجی معاملات میں انھیں سروکار ہوتا ہے۔ مصنف نے فنکاروں کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ایک تو ان کے سماجی سطح پر بیدار مغز انسان ہونے کا ثبوت ملتا ہے دوسرا ان کی مذہب سے وابستگی اور جذبہ ءخدمت خلق جیسے اوصاف کا ادراک ملتا ہے۔ مثلاً 'جھنڈے خان' فن موسیقی کے ایک ایسے تابندہ ستارے ہیں جنھوں نے نہ صرف کئی نایاب دھنیں ترتیب دیں بلکہ موسیقی کو عوامی سطح پر ایک خوبصورت امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ تھیٹر کی دنیا سے وابستگی کے باوجود بھی ان کی عبادات کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ خاں صاحب صوم وصلواۃ کے بہت پکے تھے۔ یہاں تک کے تہجد کی نماز کی بھی پابندی کرتے تھے۔ مصنف نے اپنے استاد محترم قاضی ظہورالحق صاحب اور استاد جھنڈے خاں صاحب کی ایک ملاقات کا حال اپنے استاد کی زبانی اس طرح سناتے ہیں:

''۱۹۳۵ء میں، میں لاہور میں مقیم تھا تو ایک شام میں خاں صاحب کی جائے رہائش پر پہنچا۔ خاں صاحب نمازِ مغرب پڑھ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی فرشتے کو آسمان سے زمین پر لا بٹھایا ہے۔ خاں صاحب نے جب سلام پھیرا تو میں نے سلام عرض کیا۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پھر نماز میں مشغول ہوگئے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کی کہ میں میوزک ڈائریکٹر ہوں اور آپ کو اپنی چند دھنیں سنانا چاہتا ہوں۔ موصوف نے میری طرف ہارمونیم بڑھا دیا میں نے چند طرزیں جو فلم ''پریم یاترا'' کے لیے کمپوز کی تھیں پیش کر دیں۔''

(مضمون: 'استاد جھنڈے خان' سے اقتباس)

اسی طرح ایسے واقعات کا بھی ذکر ملتا ہے جن سے فنکاروں کے جذبہ ءخدمت خلق اور جذبہ ءحب الوطنی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں استاد بڑے غلام علی خان جن کی شخصیت سوز وگداز میں گندھی ہوئی تھی ان کے حوالے سے مصنف سناتے ہیں کہ استاد بڑے غلام علی خان مزاجاً بہت سخی تھے۔ غریبوں مسکینوں کی مدد کرتے تھے یتیم بچیوں کی شادیاں تک کرواتے تھے۔ ان گھر میں ہر وقت چالیس پچاس افراد موجود رہتے تھے جن کے لیے وہ لنگر کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ مصنف نے استاد مبارک علی سرنگی نواز کی زبانی خاں صاحب کی سخاوت کا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ:

''کراچی میں استاد بڑے غلام علی خاں صاحب کے گھر کام کرنے والی ملازمہ نے اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں استاد بڑے غلام علی خان سے مدد کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اپنی والدہ سے اس خاتون کے لیے تین سو روپے لے آؤ۔ اس زمانے میں تین سو روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ بیوی نے اس رقم کے مطالبے پر اندر سے جواب بھجوایا کہ پیسوں کا خوردہ

نہیں ہے۔استاد بڑے غلام علی خاں صاحب نے دوبارہ اپنے بیٹے کو اندر بھیجا اور کہا کہ اپنی والدہ سے کہو پانچ سو دے دیں۔جواب ملا کہ پیسوں کا خوردہ نہیں ہے۔استاد صاحب نے سہ بارہ اپنے بیٹے کو بیوی کے پاس بھیجا اور کہا کہ اپنی والدہ سے ایک ہزار روپے لے آؤ، بیوی نے ٹالنے کی خاطر پھر وہی جواب دیا۔تیسری مرتبہ پیسے نہ ملنے پر بیٹے نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ پیسے دے دیں ورنہ یہ پیسے بڑھتے جائیں گیا ور کہیں ایسا نہ ہو کہ ابا جان یہ مکان ہی اس خاتون کے نام نہ لکھ دیں۔بیٹے کی اس دلیل پر خاں صاحب کی بیوی نے ایک ہزار روپے دے دیے۔''

(مضمون:''استاد بڑے غلام علی خان'' سے اقتباس)

اس طرح کتاب میں موجود کئی اور واقعات سے بھی مصنف نے درج کیے ہیں جن سے سنگیت کاروں کی شخصی خوبیوں پر روشنی پڑتی ہے۔اس کتاب کو دیکھا جائے تو یہ مصنف کی ایک قابل ستائش کاوش ہے اور حکومت پنجاب نے اس کتاب پر مصنف کو نقدی انعام سے بھی نوازہ ہے۔کیوں کہ ہمارے ہاں فنون لطیفہ سے وابستہ لوگ نظر انداز ہوتے آئے ہیں۔ریشماں صاحبہ اور مہدی صاحب کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔جب تک جولاں گاہِ فن رہے سماج اور حکومت نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا۔جیسے ہی ضعیفی کی وجہ سے فن پیش کرنے سے معذور ہوئے سماج نے آنکھیں پھیر لیں۔

اگر تنقیدی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کتاب میں جہاں مصنف کی یہ کاوش قابل ستائش معلوم ہوتی ہے وہاں کچھ مثبت اعتراض بھی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔اس کتاب کے مندرجات دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ایک حصہ میں کلاسیکی فنکاروں پر مشتمل رکھا گیا ہے اور دوسرا حصے میں نیم کلاسیکی فنکار شامل کیے گئے ہیں۔بعض کا نام مصنف نے نیم کلاسیکی فنکاروں کی فہرست میں شامل کیا ہے حالانکہ ان کے ہاں کلاسیکی گائکی کا ایک مکمل رچاؤ نظر آتا ہے مثال کے طور پر زاہدہ پروین اور مہدی حسن خاں صاحب کی گائیکی میں تو پکے گانے کے تمام اصول وضوابط نظر آتے ہیں۔گائکی میں راگداری کا پورا سبھاؤ پایا جاتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مہدی صاحب اور زاہدہ پروین صاحبہ نے جس صنفِ گائکی کو اپنایا وہ نیم کلاسیکی گائکی میں شامل ہے یعنی کافی اور غزل کو ہماری مشرقی موسیقی میں نیم کلاسیکی موسیقی میں شمار کیا جاتا ہے۔شاید اس وجہ سے ہم فنکاروں کی تقسیم کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی کے زمروں میں کرتے ہیں۔میرے خیال میں یہ تقسیم اصنافِ موسیقی کی بجائے اندازِ گائکی کے مطابق ہونی چاہیے۔اندازِ گائکی سے ہی کسی کے کلاسیکی اور نیم کلاسیکی ہونے کا تعین کرنا چاہیے۔زاہدہ پروین نے کافی گائکی کو جس طرح سے پیش کیا اور انداز گائکی میں جس طرح کی تانوں، مرکیوں اور بہلاؤں کا اضافہ کیا، ان کے پکے گانے کا ثبوت ہے۔راگ کی پیش کش اور اس کی شکل کو نبھانے میں ان کے ہاں پورا اہتمام نظر آتا ہے بلکہ جس طرح سے ان کے ہاں مرکیاں اور بہلاوے نظر آتے ہیں ان کی مشکل پسندی کا احساس ہوتا ہے۔یہی صورت

حال مہدی خاں صاحب کے ہاں بھی نظر آتی ہے ۔ انھوں نے غزل کو جس طرح سے کلاسیکی اندازِ گائکی میں پیش کیا۔ دوران پیش کش ایسے مشکل مقامات کو چُھوا اور لفظوں کے صوتیت کو جس طرح اندولن سروں سے واضح کر کے ان کے معنوی تاثر کو سامع پر اجاگر کیا، ایک منفرد پکے گانے کی گائکی کا احساس ہوتا ہے۔ اصناف گائکی کے مطابق اگر ہم کلاسیکی اور نیم کلاسیکی کی تقسیم کریں تو ٹپہ کسی دور میں ایک کلاسیکی موسیقی کی صنف بھی رہی ہے لیکن موجوہ دور میں یہ عوامی موسیقی میں شامل ہے۔ اسی طرح اگر خیال یا دھرو پد کے بولوں کو اگر دادرا، کہروا یا مغلی کی دُرت لَے میں باندھا جائے اور بولوں کو سیدھے سادھے انداز میں پیش کیا جائے تو کیا پھر بھی ان اصناف کی گائکی کو کلاسیکی موسیقی یا پکے گانے میں شمار کیا جائے گا ؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا اندازِ گائکی سے کسی فنکار کو کلاسیکی یا نیم کلاسیکی موسیقی کے درجے میں رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

جیسا کے تمام مضامین میں ایک تاثراتی رنگ موجود ہے ۔ بعض دفعہ تو جہاں مصنف مجلسی زندگی کے نقشے کھنچتا ہے تاثرات مبالغہ آرائی کا شبہ دینے لگتے ہیں۔ بہت سارے واقعات کا انحصار مصنف نے ایسے راویوں پر کیا ہے جن کا متعلقہ فنکار اور اُن کے مابین ایک طویل زمانی فاصلہ موجود ہے۔ لہٰذا ایسے واقعات کی صحت مشکوک پڑ جاتی ہے جن کا انحصار سنی سنائی باتوں پر قائم کیا جائے ۔ ویسے یہ امر مسلم رہا ہے کہ ایسے مشاہیر چاہے اُن کا تعلق مذہب سے ہو، سیاست سے یا فن سے ان کے بارے میں سماج میں طرح طرح کے واقعات منسوب رہتے ہیں۔ ان واقعات میں صداقت کتنی ہو سکتی ہے یہ تو ان واقعات سے مطلق طرزِ تحقیق ہی بتا سکتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ فن پر گفتگو کم ہے اور مجلسی زندگی کی تصویریں زیادہ پیش کی گئی ہیں۔ یہ مضامین اگرچہ اپنے مزاج کے اعتبار سے خاکے ہی ہیں مگر خاکہ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ شخصیت سے براہِ راست وابستہ ہو یا کم از کم اس کی مجلسی و معاشرتی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کر رکھا ہو۔ سنی سنائی باتوں پر شخصی کوائف کا انحصار کرنے سے مبالغہ آرائی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کئی ایسے فنکاروں سے متعلق واقعات درج ہیں جن کا انحصار سنی سنائی باتوں پر ہے۔ مصنف نے ان واقعات کے حوالے سے کسی قسم کی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ بعض معلومات ایسی تھیں جو کسی دستاویزی حوالے کا تقاضا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر مضمون 'استاد بڑے غلام علی خان' میں ان کے جدِ کلاں بابا فاضل نامی کو بلھے شاہ کا ہم عصر کہا گیا ہے اور ان کے گانے بجانے کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس کا حوالہ غیر واضح اور غیر متعلقہ معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس کتاب کی اہمیت و انفرادیت اس طرح جداگانہ ہے کہ فن موسیقی کے شاہ مہروں کے مصنف نے جو مرقعے کھینچے ہیں ان تمام میں ایک وحدت کا تاثر نظر آتا ہے اور کتبِ موسیقی میں سُر سنسار ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

☆

فریدہ حفیظ

''جندر''(ناول)از اختر رضا سلیمی

کسی سے وقت نہ گزرتا ہوتو وہ جندر پڑھنا شروع کر دے، وقت تو کیا نیندیں بھی اڑ جائیں گی اور جندروئی کے بارے میں سوچتے ہوئے باقی زندگی۔۔۔

جندر ایک پورے دور، ایک نظام، ایک معاشرے، ایک تہذیب اور تمدن کے دوسرے دور میں داخل ہونے کی کہانی ہے۔ جندر خلوص سے خودغرضی، روح سے مادی، روحانی اور اخلاقی اقدار سے مالا مال سماج کا ان سب خوبیوں سے محرومی کی طرف سفر کی داستان ہے۔

ایک پورے دور کو بیان کرنے میں کتنے ہی کرداروں، منظر ناموں اور بیانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جندر میں صرف ایک کردار کی سوچ کے ذریعے ناول نگار نے اسے ایک Uniq یونیک ناول میں ڈھال دیا ہے۔ ایک ناول جس میں ایک دور، دھیرے دھیرے موت کی کھائی میں اتر رہا ہے۔

> ''میرا یہاں اس طرح مرنا صرف ایک انسان کی نہیں ایک تہذیب کی موت ہے۔ وہ تہذیب جس کی بنیاد انسان نے ہزاروں سال پہلے اس وقت رکھی جب دنیا کے پہلے انسان نے بہتے پانی کی قوت کا اندازہ لگایا ہوگا۔''

جندروئی ایک غیر معمولی کردار ہے۔ موت کا خوف اس طرح اس کے ذہن میں بس گیا تھا کہ اسے موت کے بعد اپنی لاش کو ٹھکانے لگانے کی زیادہ فکر ہے مگر روح کی نہیں کہ وہ موت کے بعد جنت میں جائے گی یا جہنم میں؟

ہمارے اس معاشرے اور سماج کی طرح، جس کا حرص اور لالچ میں سوچ کا محور صرف مادی دنیا ہے۔ جندروئی کی خودغرضی، خود پسندی اور بے حسی معاشرے کی عصری صورت حال کی غماز ہے۔ جندروئی مادی اور روحانی دونوں aspects کی تصویر ہے۔ مادیت بری چیز نہیں مگر مادیت اس نہج پر پہنچ جائے کہ جندروئی کے گرد ہر واقعے اور رشتے سے موجودہ دور کی نفسیاتی اور مادی کیفیت کا اظہار ہو جس میں آئندہ نسلوں کی مادی خوشحالی کی فکر ہو مگر اخلاقی زوال کا احساس اور پروا بھی نہ ہو۔ اور اس سے بڑھ کر اخلاقی اور روحانی پستی کی صورت اور کیا ہوگی کہ جندروئی اپنی بیوی اور بیٹے کی مشکلات، احساسات اور محرومیوں کو خوب سمجھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود ان کا ذمہ دار ہے مگر ان کا ازالہ کرنے کو تیار نہیں اور وہ اپنی محبت کرنے والی بیوی بچے اور ازدواجی زندگی کو صرف اپنی ذات کے لیے قربان کر دیتا ہے۔

ناول نگار نے روحانی طور پر دیوالیہ معاشرے کے تہذیبی سفر کو جس چابک دستی اور فن کاری سے بیان کیا ہے، اس سے ایک روگی سماج اور تہذیبی زوال کے تضادات بہت خوب صورتی سے ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ اختر رضا سلیمی کی تحریر اور اسلوب کا کمال ہے۔

بدلتی قدروں، تہذیبوں کے عروج اور زوال کی داستانیں دنیا کے ہر ادب کا محور رہی ہیں۔ مجھے کئی بار تھامس ہارڈی کے کرداروں کا خیال آیا جو صنعتی ترقی کے سیلاب میں کنارے تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ صنعتی ترقی takes its toll کردار حالات کے سامنے بے بس تو ہو جاتے ہیں مگر ہمارے زمینی اور سماجی حقائق اور مغربی معاشروں کے اقدار کی پامالی کے باوجود وہ کیا شے ہے جو حالات کا مقابلہ ان کی طرح کرنے میں حائل ہے۔ شاید یہ فکری تضاد ہے۔ شاید نہیں بل کہ یقیناً ہے۔

اِسی فکری تضاد کو اختر رضا سلیمی نے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ جب سارا زمانہ بدلتے حالات کو تسلیم کر کے نئی راہیں تلاش کر لیتا ہے، ہم سیدھے سادھے حقائق سے بھی چشم پوشی کرنے کی کوشش میں خود اپنی گلی سڑی کرم خوردہ لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ جندر میں دوسرا اہم ترین کردار جندروئی کی بیوی کا ہے، ایک طرف جندر زندگی کی علامت ہے، اس کا قیام انسانی تہذیب کے قیام کی کہانی ہے۔ خود جندروئی صدیوں کی تہذیب اور تمدن اور اخلاقی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کی علامت ہے۔ جندروئی کی بیوی ہاجرہ معاشرتی ٹوٹ پھوٹ کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی دیہاتی عورت کا فیصلہ وہ استعارہ ہے جو آج کی مشرقی عورت کی زندگی کی کشمکش کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہاجرہ ان مشرقی عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے جو اعلیٰ اقدار کی پاسدار ہیں۔ اپنی محبت، خلوص، قربانی کے جذبے اور محنت کے باوجود ناکام ہوتی ہیں مگر جھکنے سے انکار کر دیتی ہیں، چاہے اندر سے ٹوٹ پھوٹ جائیں۔

ہاجرہ کہتی ہے:

> ''میں نے ایک آزاد مرد سے شادی کی تھی، مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ جندر کی گونج کا قیدی ہے۔ میں ایک معذور مرد کے ساتھ تو زندگی گزار سکتی ہوں لیکن ایک مجبور مرد کے ساتھ نہیں۔ تمھیں اس مجبوری سے آزاد ہونا پڑے گا۔''
>
> اور جندروئی ہکا بکا ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

بن بچے کے شادی شدہ عورت کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی، شاید لوگ اس کی آزادی سے ڈرتے ہیں۔ جندروئی کا رویہ بھی اس کا عکاس ہے۔ وہ خود کو تو نہ بدل سکا مگر اس حقیقت سے بھی بے خبر رہا ہے کہ اس کا اردگرد کتنا تبدیل ہو چکا ہے۔

> ''جب راحیل پیدا ہوا تو میں نے سوچا کہ اب وہ میرے گھر سے بندھ گئی ہے، نومولود کو لے کر کہا

جائے گی۔''

ماں گھر کے ساتھ بچے سے بندھی ہوتی ہے۔

نامطمئن حالات کا شکار ماں زیادہ مجبور ہوتی ہے۔اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اس کو عورت کی تقدیر تصور کر کے اسے یہ بھی باور کرا دیا گیا ہے کہ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں۔قربانی دینا صرف اس کی ذمہ داری ہے، چاہے وہ بچوں کے لیے ہو، شوہر کے لیے یا شوہر کے رشتے داروں کے لیے۔۔اور ہر دکھ سہنا اس کے نصیب میں لکھا جا چکا ہے۔مرد کو حیرت اس وقت ہوتی ہے جب عورت اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اپنے فیصلے خود کرنے لگتی ہے۔

''مرد کو مجبور نہیں ہونا چاہیے اور تم جیسے مرد کو تو بالکل بھی نہیں۔وہ کہتی۔تھوڑا حوصلہ کرو۔ایک دن تمھیں جندر کی گونج کے بغیر بھی سکون کی نیند آنا شروع ہو جائے گی۔''

یہ اپنے کو گھر سے جوڑے رکھنے کی عورت کی فطری خواہش کا اظہار ہے۔وہ اپنی ہمت اور صلاحیت پر انحصار کر کے اپنی راہ تلاش کر لیتی ہے۔تو کیا اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے۔اس بے حس اور زوال پذیر معاشرے کو عورت سنبھالا دے سکتی ہے۔

ناول میں خوب صورت، منظر نگاری اور جندروئی کی اپنی زندگی کے حالات، غیر محسوس طریقے پر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ علاقائی زبان (ہندکو) کے الفاظ اتنی سہولت اور آسانی کے ساتھ، کچھ اس طرح برتے گئے ہیں کہ ابتدا میں ان کا مطلب نہ سمجھنے والا قاری بھی اختتام تک پہنچتے پہنچتے ان کے معانی جان لیتا ہے۔

بھلے وقتوں کی یادوں کو، جب سماج روحانی اقدار سے مالا مال تھا، کی منظر نگاری کی خوب صورت مثال ملاحظہ ہو۔جس میں علاقائی زبان کے الفاظ کی رنگ آمیزی بھی شامل ہے۔

''فصلوں، خاص کر گندم کی کٹائی اور گاہی کے دنوں میں وہ لوگ جو شہر میں نوکری یا کاروبار کر رہے ہوتے، راتوں رات گاؤں آ جاتے اور صبح سویرے درانتیاں اٹھائے لیتریوں میں شمولیت کے لیے نکل کھڑے ہوتے، سب مل جل کر ایک دوسرے کی فصلیں کاٹتے، انھیں ڈھو کر مکانوں کے صحنوں اور کھلیانوں میں جمع کرتے اور بیلوں کی جوڑیوں کے پیچھے کاہو کی خشک پھنگلیں باندھ کر اسے گاہتے، مکئی کی کٹائی کے بعد گاؤں کی عورتیں مل کر اسے چھیلتیں اور پھر مرد، راتوں کو بھاری سوٹے لے کر اسے کوٹتے اور ان کے دانے علاحدہ کرتے۔شاید یہی مجبوریاں تھیں جو لوگوں کو ایک دوسرے سے جڑے رہنے اور محبت کرنے پر اکساتی تھیں۔''

اس پیرے کا آخری جملہ مجھے 'انسان ایک سماجی جانور ہے' کے قول کو چیلنج کرتا محسوس ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری طرف جدید سائنسی علم اور مادی ترقی کی زندگی میں آسانیاں اور آسائشیں لوگوں کو ایک دوسرے سے دور بھی کر سکتی ہیں۔ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ اختر رضا سلیمی کی ذات میں ایک نیا فلاسفر ابھر رہا ہے جو انسانی معاشروں کی روایتی اقدار کے بارے میں سوال اٹھا رہا ہے۔ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ناول پڑھنے سے چند روز قبل گاؤں میں کسی کے گھر بنانے کی بات ہو رہی تھی۔ پہاڑی گاؤں کے رہنے والے مالی سے پوچھا کہ ان کے ہاں تو گاؤں والے مل جل کر ایک دوسرے کے گھر تعمیر کر دیتے ہیں۔

'اب نہیں کرتے۔ مستری اور مزدور بلوا کر مزدوری کے عوض گھر تعمیر ہوتے ہیں اور فصلوں کی کٹائی بھی۔' جواب ملا۔

بھلے وقتوں کی منظر نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے انگریزی شاعر کیٹس کی Ode to Antum بھی یاد آنے لگتی ہے۔ اختر رضا سلیمی کی علاقائی زبان کے الفاظ کے استعمال اور منظر نگاری کی ایک چھوٹی سی جھلک ملاحظہ ہو۔

''میں جندر کے کھارے میں نئی چونک انڈیل کر، صحن میں موجود تھلے پر لیٹ کر سونے کی تیاریاں کرنے لگتا۔''

خود ناول کا نام ''جندر'' بھی ایک غیر مانوس لفظ ہے۔ مگر ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ قاری ابتدا میں نامانوس الفاظ کے معنی جاننے کی کوشش ضرور کرتا ہے مگر اختتام تک آتے آتے وہ ان سے مانوس ہو جاتا ہے۔ گو 'چونگ' کے لفظی معنی جاننے کی مجھے اب بھی خواہش ہے حالاں کہ میں اس کا مطلب جان گئی ہوں۔ خود کلامی کے انداز میں اپنے سے پہلے اور آنے والی نسلوں کے بیچ سماجی، اخلاقی اور معاشی تبدیلیوں کی کہانی ناول نگار اس خوبی سے بیان کرتا جاتا ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ قاری کو ایک ہی کردار نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے اور واقعات کے داستانی انداز میں سماج اور تاریخ کی بدلتی صورت حال نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ جندر جس کے گرد زندگی گھومتی ہے، چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستی بھی ہے۔ اور جندرو ئی کی موت کے ساتھ ساتھ خود جندر کی تباہی میں اس کے بیٹے نے ایک تہذیب کے انہدام میں بھی اپنا حصہ ڈال دیا، تاہم پانی سے چلنے والے جندر کا کام بجلی سے چلنے والی مشینوں نے سنبھال لیا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ مشینوں کو انسانوں کے بجائے روبوٹ چلا رہے ہوں گے۔

☆

محمد منیر احمد سلیچ

بُجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

[وفیات پاکستانی اہلِ قلم: جنوری تا اپریل ۲۰۱۸ء]

☆ احمد رئیس چشتی (سیّد رئیس احمد چشتی)

بزرگ اردو شاعر

وفات ۸/مارچ ۲۰۱۸ء کراچی

تدفین کراچی

ماخذ فیس بک ظفر قابل اجمیری

☆ اکرام بریلوی (سیّد سعادت حسن کاظمی)

کینیڈا میں مقیم اردو ادیب، افسانہ، ڈرامہ و ناول نگار

کتب مومن خان مومن۔عشرت آفریں کی شاعری۔

تیسری نسل۔برف کی دیوار (ڈراما)

رہ نوردِ شوق (ناول: ۲۰۱۲ء)۔

ولدیت سیّد اقبال حسین ولادت ۳۰/جون ۱۹۱۸ء

وفات ۱۸/مارچ ۲۰۱۸ء کینیڈا تدفین کینیڈا

ماخذ عقیل عباس جعفری بذریعہ فیس بک

Bio-bibliographies

☆ جمیل آذر، پروفیسر (محمد جمیل)

ممتاز اردو انشائیہ و افسانہ نگار، نقاد، انگریزی کے استاد

کتب وقت اے وقت (انشائیے)

انشائیہ اور انفرادی سوچ۔انشائی تنقید۔

اردو کے بہترین انشائیے (۱۹۷۶ء)

افسانہ کے سات رنگ (تنقید:۲۰۱۱ء)

وفات مارچ ۲۰۱۸ء راولپنڈی

تدفین راولپنڈی

☆ رسا چغتائی (مرزا محتشم علی بیگ)

نامور و بزرگ اردو شاعر' غزل کے صاحبِ طرز شاعر

شعری کتب ریختہ۔ زنجیر ہمسائیگی۔ تصنیف۔

چشمہ ٹھنڈے پانی کا۔ تیرے آنے کا انتظار رہا

اعزاز صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (۲۰۰۱ء)

ولادت ۱۹۲۸ء سوائی مادھوپور (ریاست جے پور)

وفات ۵/جنوری ۲۰۱۸ء کراچی

تدفین مولا بخش قبرستان' کورنگی نمبر ۶' کراچی

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی

☆ ساقی فاروقی (قاضی محمد شمشاد نبی)

نامور اردو شاعر و ادیب' ۱۹۲۸ء کو بنگلہ دیش اور ۱۹۵۲ء کو پاکستان منتقل ہوئے' ایڈیٹر ماہنامہ ''نوائے کراچی'' (۱۹۶۳ء) پھر برطانیہ چلے گئے اور تادم آخر وہیں رہے۔

کتب پیاس کا صحرا۔ رادار۔ حاجی بھائی پانی والا

بہرام کی واپسی (شعری مجموعہ)۔ زندہ پانی سچا۔

بازگشت و بازیافت۔

ہدایت نامہ شاعر (تنقیدی مضامین)۔

رازوں سے بھرا بستہ (نظموں کا انتخاب)۔

Nailing Drak Storm (انگریزی نظمیں)

پاپ بیتی (آپ بیتی)

ولادت ۲۱/دسمبر ۱۹۳۶ء گورکھپور

وفات ۱۹؍جنوری ۲۰۱۸ء لندن

تدفین لندن

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۲۰؍جنوری ۲۰۱۸ء

☆ سلطان غازی

نامور براڈ کاسٹر و صحافی' وائس آف امریکا سے وابستہ رہے۔

پی ٹی وی کے ابتدائی نیوز کاسٹروں میں سے تھے۔ مختلف اخبارات کے لئے رپورٹنگ اور فیچر رائٹنگ اور ریڈیو پاکستان اور

پی ٹی وی کے لئے ڈرامے بھی لکھتے رہے۔ ریڈیو بیجنگ کی اردو سروس سے بھی منسلک رہے۔

ولادت تخمیناً ۱۹۳۷ء

وفات ۵؍جنوری ۲۰۱۸ء فلوریڈا (امریکہ)

تدفین امریکہ

ماخذ وائس آف امیریکا ۶؍جنوری ۲۰۱۸ء

☆ شاہد حمید

ممتاز اردو ادیب' انگریزی سے اردو مترجم' ماہر لسانیات۔

ریٹائرڈ استاد شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور

تراجم جنگ اور امن (ناول از لیو طالسطائی)

برادرز کرامو زوف (ناول از دوستوفسکی)

تکبر و تعصب (ناول از جین آسٹن)

سوفی کی دنیا (ناول از جسٹن گارڈر)

بوڑھا اور سمندر (ناول ارنسٹ ہیمنگوے)

انگریزی اردو ڈکشنری

گئے دن کی مسافت (خودنوشت)

ولادت ۱۹۲۸ء جالندھر

وفات ۲۹؍جنوری ۲۰۱۸ء لاہور

تدفین لاہور

ماخذ فیس بک اسلم ملک (لاہور)

☆ طاہر سعید ہارون، پروفیسر ڈاکٹر

نامور ماہر امراض جلد، ماہر طبی تعلیم، ریٹائرڈ پروفیسر و صدر شعبہ امراض جلد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور (۱۹۸۹ء تا ۲۰۰۲ء)۔ دوہا کے ممتاز شاعر، دس مجموعے یادگار چھوڑے

ولدیت خواجہ سعید احمد ہارون (پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور، کارکن تحریکِ پاکستان)

کتب من موج۔ نیلا چندر مان۔ پریت ساگر۔ مان بانی میگھ ملہار۔ بھور نگر۔ پریم راس۔ کوک۔ من دیپک نین درپن

ولادت ۱۹۴۲ء

وفات ۷ر جنوری ۲۰۱۸ء لاہور

تدفین لاہور

ماخذ فیس بک عبدالرحمٰن خواجہ

☆ ظہیر الحسن جاوید

معروف صحافی، کالم نگار، شاعر و ادیب، مترجم۔ چیئرمین حسرت اکیڈمی، ریٹائرڈ نیوز ایڈیٹر پی ٹی وی۔ روزنامہ امروز لاہور اور روزنامہ پاکستان لاہور سے وابستہ رہے۔

ولدیت چراغ حسن حسرت

وفات ۱۷ر جنوری ۲۰۱۸ء لاہور

تدفین میانی صاحب، لاہور

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۱۸ر جنوری ۲۰۱۸ء

☆ عبدالحمید قادری سروری، فقیر

ممتاز روحانی شخصیت، سجادہ نشین درگاہ فقیر نور محمد قادری کلاچوی پشتو وار دو شاعر، ادیب، مصنف۔

کتب حیاتِ سروری (سوانح حضرت فقیر نور محمد قادری)

ولدیت فقیرنور محمد قادری سروری کلاچوی

ولادت ۱۹۲۰ء کلاچی

وفات ۲۱؍فروری ۲۰۱۸ء لاہور

تدفین کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

ماخذ فیس بک حسن نواز شاہ

☆ **عنایت اللہ خان گنڈاپور**

ایڈیٹر سہ ماہی ''عطاء'' ڈیرہ اسماعیل خان (۱۹۹۸ء سے)

ولدیت عطاء اللہ خان عطاء (فارسی شاعر)

وفات یکم اپریل ۲۰۱۸ء

تدفین کچہری قبرستان، ڈیرہ اسماعیل خان

ماخذ فیس بک کوارٹر لی عطا

☆ **غضنفر عباس سیّد**

اردو شاعر، استاد شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ساہیوال

وفات ۲۷؍جنوری ۲۰۱۸ء ساہیوال

تدفین ساہیوال

ماخذ فیس بک علی رضا خان

☆ **محمد حنیف شاہد**

ممتاز ماہر اقبالیات، محقق، مصنف، ماہر لائبریری سائنس۔

سابق سربراہ بزم اقبال لاہور

کتب مفکر پاکستان۔ نذر اقبال۔ اقبال چودھری محمد
حسین کی نظر میں۔ اقبال کی کہانی اقبال کی زبانی۔ علامہ اقبال اور قائدِاعظم کے سیاسی نظریات
اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام۔ اقبال اور پنجاب کونسل۔ اقبال کی بارگاہ میں۔
پنجاب کی کہانی قائدِاعظم کی زبانی۔ قائدِاعظم پر قاتلانہ حملہ۔ اسلام اور قائدِاعظم۔
میجر محمد طفیل شہید نشانِ حیدر۔ کتابِ اخلاق۔ کیپٹن سرور شہید نشانِ حیدر۔ نشانِ حیدر۔

سیرتِ رضا۔حقوق وفرائض۔موج ظرافت۔مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش۔
عورت مشاہیر عالم کی نظر میں

☆Tributes to Iqbal ☆Iqbal: The Great Poet of Islam
☆Quaid-e-Azam ☆Speeches, Statements andWritings of Quaid-e-Azam

ولدیت میاں عزیز الدین
ولادت یکم جنوری ۱۹۳۹ء لاہور
وفات ۱۱/فروری ۲۰۱۸ء لاہور
تدفین علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۱۲/فروری ۲۰۱۸ء
ہمارے اہلِ قلم

☆ محمد عارف، پروفیسر ڈاکٹر سیّد

ممتاز محقق، ادیب، ماہر تعلیم۔سابق صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ ایس ای کالج بہاول پور۔کالج کے مجلّہ 'نخلستان' کا صد سالہ نمبر انھی کی نگرانی میں شایع ہوا۔''شاہد احمد دہلوی: احوال و آثار'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، یہ مقالہ چھپ چکا ہے۔اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ اردو و اقبالیات سے وابستہ تھے۔

دیگر کتب طاق نسیاں (خاکے از شاہد احمد دہلوی)
رموز واوقاف۔سفر نامۂ حج
ولدیت قاری حفیظ الرحمٰن
ولادت ۱۴/مارچ ۱۹۴۶ء
وفات ۲۲/مارچ ۲۰۱۸ء بہاول پور
تدفین بہاول پور
ماخذ شاہد رضوی بذریعہ فیس بک

☆ مسرور جاوید

امریکہ میں مقیم سینئر صحافی، ادیب، شاعر و سماجی شخصیت۔

پاکستان کے مختلف اخبارات اور جرائد کے مدیر رہے۔

وفات ۹/اپریل ۲۰۱۸ء نیویارک

تدفین نیویارک (امریکہ)

ماخذ dunya.com.pk

☆ مشتاق احمد قریشی

پسرور کے معروف اردو شاعر و ادیب

ولدیت محمد علی قریشی

ولادت ۱۹۳۷ء پسرور

وفات ۱۴/مارچ ۲۰۱۸ء پسرور

تدفین قبرستان پیر جہانیاں، پسرور

ماخذ معلومات از طاہر نظامی (پسرور)

☆ مضطر اکبر آبادی

بزرگ اردو شاعر و ادیب، صحافی، براڈ کاسٹر۔ طویل عرصہ ریڈیو پاکستان اور روزنامہ جنگ سے وابستہ رہے۔

شعری کتب پہلی سحر تخلیق کی۔ زادِ آخرت۔ گریہ شب

وفات ۱۳/فروری ۲۰۱۸ء اسلام آباد

تدفین اسلام آباد

ماخذ فیس بک طارق شاہد (اکادمی ادبیات)

☆ منو بھائی (منیر احمد قریشی)

نامور صحافی، شاعر و ادیب، ڈرامہ و کالم نگار، مترجم۔ پی ٹی وی کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے، سونا چاندی، جھوک سیال، دشت اور عجائب گھر ان کے مشہور ڈرامے تھے۔ روزنامہ تعمیر راولپنڈی، امروز لاہور، مساوات لاہور اور جنگ لاہور سے وابستہ رہے۔ گریبان کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ نامور پنجابی شاعر و ادیب شریف کنجاہی کے بھانجے تھے۔

کتب بوند بوند۔ اجے قیامت نئیں آئی (پنجابی شاعری)
فلسطین فلسطین۔

کالم جنگل اداس ہے۔قطرے میں دریا

اردو تراجم محبت کی ایک سو ایک نظمیں۔انسانی منظر نامہ

اعزاز صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی (۲۰۰۷ء)

ولدیت محمد عظیم قریشی

ولادت ۶؍فروری ۱۹۳۳ء وزیر آباد

وفات ۱۹؍جنوری ۲۰۱۸ء لاہور

تدفین ریواز گارڈن، لاہور

ماخذ نوائے وقت راولپنڈی ۲۰؍جنوری ۲۰۱۸ء

☆